

شنو



پرویز بگرامی

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش پرویز بگرامی

http://kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7223584-0300-4125230

http://kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

http://kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

نام کتاب

شتو

مصنف

پرویز بکرا

ناشر

گل فراز احمد

مطبع

علم و عرفان پبلشرز، لاہور

پروف ریڈنگ

زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور

سن اشاعت

مارچ 2011ء

قیمت

300/- روپے

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com ملنے کے پتے

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

7223584-0300-4125230 فون

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

کتاب گھر کی پیشکش

http://kitaabghar.com

انتساب

اللہ رب العزت کے نام

جس کی خوشنودی کے جواز پر اب تک ہزاروں جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔

☆ ☆ ☆

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

زندگی کیا ہے؟ آج جب میں سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ لوگوں نے اس زندگی کا کیا کیا نام دیا ہے مگر میں اسے عذاب کہتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے زندگی کو بھگتا ہے۔ زندہ رہنے کے نام پر مر کر جیا ہوں۔ آج جب میں گزرے ہوئے ایام پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے کہ لوگ زندہ رہنے کے لیے کیوں اتنی کوشش کرتے ہیں۔ کتنی آسانی سے کہتے ہیں کہ زندگی انمول شے ہے۔ اسے سحر، خواہش، عسی، نفس، معجزہ، ادا، رقص، طاؤس، جمال، صبح و رنگ، نارون کہتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ قابل برداشت رہتا نہیں جب درو حیات ڈھونڈتی ہے تملہاٹ زہر میں راہ نجات۔ اسی لیے مجھے موت چاہیے کیوں کہ میں بھی انسان ہوں۔ انسان جیتا ہے تو ساز برگ عشرت کے لیے۔ اور مرتا بھی ہے تو دفع اذیت کے لیے۔ مگر وہ نہ تب ملی تھی اور نہ اب مل رہی ہے۔ میں اس عذاب بھری زندگی سے تنگ ہوں مگر کیا کروں کہ جینے پر مجبور ہوں۔ میں کون ہوں یہ ابھی بتا دوں تو شاید آپ کو میری آپ بیتی پڑھنے میں وہ مزہ نہ آئے جس کے آپ طلب گار ہیں۔ اس لیے میں سیدھے سیدھے اپنی آپ بیتی پر آتا ہوں۔

میں کون ہوں مجھے تب صحیح سے یاد نہ تھا۔ بس مجھے ہلکا ہلکا سایا یاد ہے۔ میں سون پور کا مشہور میلہ دیکھنے آیا تھا۔ اس میلے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دور دور سے لوگ وہاں آتے ہیں۔ بہت بھیڑ ہوتی ہے۔ بھیڑ ہی کی وجہ سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا تھا اور میں انسانی سمندر میں بہتا چلا گیا تھا۔ میں جس کے ساتھ آیا تھا وہ پتا نہیں کہاں چھوٹ گیا۔ اتنی بھیڑ میں کسی کو ڈھونڈنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ تھک کر میں سون ندی کے کنارے گزنگا کے ٹٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک آدمی آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔

”ڈوبتے سورج کو دیکھ رہے ہو؟“ اس آدمی نے کہا۔

”جی جی ہاں۔“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”اکیلے ہو۔ ساتھ میں کوئی نظر نہیں آ رہا؟“

”میں چمڑ گیا ہوں۔ میرے ساتھ چاہتے وہ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔“

”کچھ کھایا یا بھوکے ہو؟“

میں نے جواب نہیں دیا تھا۔

”کھانا کھاؤ گے؟“ اس شخص نے شفقت سے پوچھا تھا۔

میں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکائے رکھا۔

”آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کھانا کھلاتا ہوں۔“

بھوک مجھے بے چین کیے ہوئے تھی۔ میں نے جواب دینے کی بجائے کھڑے ہو جانا ضروری سمجھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

مجھے وہ اجنبی فرشتہ لگا تھا۔ انسان کے روپ میں کوئی آسمانی مخلوق۔ اس شخص نے مجھے ایک ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ کھانا کھا کر کچھ طاقت آئی

تو میں نے تشکر بھرے انداز میں اس اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر دوبارہ سے گنگا کنارے آ گیا۔

رات کا اندھیرا اب پوری طرح پھیل چکا تھا۔ لوگ صرف تھیر، سرکس کے سامنے رہ گئے تھے۔ اس طرف کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھبوں پر لکے گیس کے ہنڈے دور تھے۔ ان کی روشنی وہاں تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ایک نسبتاً سناں جگہ پر پہنچا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے میرے کپڑے اتارنے لگا۔ میں نے گھبرا کر اس کے ہاتھ پر دانت جما دیے۔ خوب زور سے کاٹ لیا۔ تکلیف سے اس نے ہاتھ ہٹایا تھا کہ میں راحت سے بھرا تھا۔

منہ سے ہاتھ ہٹتے ہی میں نے زور کی چیخ ماری۔ میری چیخ سنتے ہی کئی لوگ دوڑے۔ اتنے لوگوں کو نزدیک آتے دیکھ وہ اٹھ کر بھاگا۔ آنے والوں میں سب سے آگے کوئی اور نہیں یہی نور بیگم تھا۔ اس نے مجھے سنبھالا اور اپنے نزدیک کر کے میرے چہرے کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ”اے ہے... کتنا خوبصورت بچہ ہے... گھر کہاں ہے رے... کہاں سے آیا ہے تُو؟“

”پتا نہیں..... میں جس کے ساتھ آیا تھا وہ مل نہیں رہا۔“

”یہاں رہے گا تو ایسے ہی لوگ ٹکراتے رہیں گے... چل میرے ساتھ چل۔۔۔۔۔“ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنی کونھری میں آ گیا۔ اس نے بتایا وہ بھی میلہ میں شریک ہونے آیا ہے مگر صبح ہی وہ چھپرالوٹ جائے گا۔

میں اس کے ساتھ چھپرا آ گیا۔ اس سے پہلے میں اس قبیل کے لوگوں سے کبھی ملا نہیں تھا۔ بس دور دور سے دیکھا تھا۔ پہلی بار قریب سے دیکھنے ان کی باتیں سننے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔

وہ لوگ مجھے نہایت اچھی اچھی چیزیں کھلاتے میرے آرام آسائش کا پورا پورا خیال رکھتے۔ مگر کمرے سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ میں خود بھی سون پور والی بات سے ڈر گیا تھا کہ پھر کوئی ایسا آدمی نہ ٹکرا جائے۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک صبح نور بیگم نے کہا۔ ”چل تیاری کر لے آج تجھے بھی عرف لچھودادی کے پاس لے جانا ہے۔“

راستے میں چلتے چلتے میں نے پوچھا کیا لچھودادی اس کی دادی ہے تو وہ ہنس کر خاموش ہو گیا۔ مگر جب میں لچھودادی کے یہاں پہنچا اور اسے دیکھا تو وہ مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ سر پر ایک بھی بال نہیں تھا مگر وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھا۔ منہ پوپلا تھا۔ اس نے میرے جسم کو اس طرح ٹٹولا تھا جیسے وہ کوئی قصاب ہو اور میں بکرا۔ پھر وہ نور بیگم سے بولا تھا۔ ”ارے اورے نوری تُوں نے تو ہیرا ڈھونڈا۔ بڑھا پا بڑے آرام سے گھرے گا۔ بڑا کھیاں رکھو ہرے مٹی کا۔“ پھر اس نے دس کا نوٹ نکال کر اپنے ایک ساتھی کو دیا اور بولا۔ ”ارے او رے ستھیا۔ جارے تنک مٹھیا دوی سیر لے آ۔“

ستھیا روپیہ لے کر منکھتا ہوا چلا گیا۔ باقی سب مجھے دیکھ دیکھ کر آپس میں نیچی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں سب کا منہ تک رہا تھا۔ مٹھائی آئی تو لچھو نے ایک رکابی میں رکھ کر اپنے سر پر رومال لپیٹا اور فاتحہ کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر آنکھیں

بند کر کے کچھ پڑھنے لگا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ایک لڈوا اٹھایا اور میرے منہ میں ٹھونس دیا۔

”بدھائی ہو بدھائی.... بدھائی ہو بدھائی۔“ سب نے ایک آواز میں مبارک باد دینا شروع کر دیا۔ ان کی آوازوں سے پورا کمر گونجنے لگا تھا۔

”شری گنیش کرو جی۔“ لچھو نے تیز آواز میں چیخ کر کہا۔

شری گنیش اس طرح ہوا کے سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میرے کپڑے پھاڑنا شروع کر دیا۔ میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر میری ایک نہ چلی اور میرے کپڑے چند یوں میں بدل گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں الف ننگا ہو گیا۔ اپنی یہ درگت بنتے دیکھ میں رونے لگا۔

”ارے ارے روتی کا ہے کو ہے ری۔ یہ تو کھوشی کی بات ہے کہ تُو کے شدھی مل رہی ہے۔ اب تو ہمارے برادری میں آئی گوا۔“ اس کی پوربی کچھ سمجھ میں آرہی تھی کچھ نہیں مگر میں روئے جا رہا تھا۔

اس کے ایک ساتھی نے ٹین کے ایک بڑے ڈبے سے ایک چھوٹا ڈبہ نکالا اور وہیں رکھا پانی سے لہا لب بھرا ایک پیتل کا گول لوٹا اٹھا لیا۔ لچھو نے ڈبے میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر سیندور نکالا اور اس سے میرے گرد دائرہ کھینچ کر اس کے درمیان مجھے بٹھا دیا۔ میں ڈر سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لچھو نے کچھ پڑھ کر اس دائرے پر پھونک ماری اور لوٹے کو تھام لیا۔ اس لوٹے کے کنارے کنارے کیمر کے پھول دھاگے سے بندھے ہوئے تھے۔ لچھو نے ہونٹوں کو ہلاتے ہوئے پانی کا لوٹا میرے سر پر خالی کر دیا۔ مجھے جھرجھری سی آگئی۔

”بدھائی ہو بدھائی۔“ سب نے پھر ایک بار کورس میں کہا۔

لچھو کے ایک ساتھی نے کوئی فٹ بھر لمبا مگدرا آگے کر دیا۔ اس کے سرے پر بڑی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ لچھو نے اسے لے کر میرے پیٹھ سے ذرا نیچے مارنا شروع کر دیا۔ گو کے رب کی وجہ سے چوٹ زیادہ نہیں لگ رہی تھی پھر بھی مجھے ناقابل برداشت لگ رہی تھی۔ میں نے چوٹ سے بچنے کے لیے ہاتھ پیچھے لے جانا چاہا تو دوسرے لوگوں نے مجھے کس کر پکڑ لیا اور زمین پر اوندھے منہ گرا دیا۔ پھر جو چوٹ پڑنے لگی وہ ناقابل برداشت ثابت ہوئی اور میں ہوش و حواس سے بے گانا ہو گیا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں لڑکیوں کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔

”لو بیٹی پی لو۔“ لچھو نے گرم دودھ کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ مجھے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ہی سانس میں دودھ پی لیا۔ مجھے دودھ کا ذائقہ کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن خوشگوار تھا۔

اس دن سے لچھو دادی کی نگرانی میں میری ٹریگ شروع ہو گئی۔ مجھے لڑکیوں کی طرح کمر لچکا کر چلنا۔ اٹھنا بولنا سکھایا جانے لگا۔ وہ مجھے شنو کے نام سے پکارتا۔ میری کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی میری نگرانی کے لیے موجود ہوتا۔ مجھے گھر سے باہر جانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ البتہ مجھے کھانے پینے کی مکمل آزادی تھی۔ میں جو چاہتا منگوا کر کھا لیتا۔ میری فرمائشوں کو وہ لوگ فوراً پورا کرتے۔

تین ماہ کی ٹرینگ سے میں بالکل بدل گیا۔ ان کے طور طریقوں کو پوری طرح اپنا لیا۔ اب وہ لوگ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جانے لگے تھے، دوسروں کی طرح میں بھی ڈھولک کی تھاپ پر کمر مٹکانے لگا تھا۔

گھروں میں جہاں بچے کی پیدائش کا سنتا ان کے ساتھ پہنچ جاتا۔ کم عمر ہونے کی وجہ سے میرے نایچ میں ایک نکھار تھا۔ لوگ بہت پسند کرتے۔

ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میں اب تک ان کے مذہب کا اندازہ لگا نہیں پایا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ ہندو اور مسلم دونوں کے احکامات پر عمل کرتے۔ مندروں میں بھی جاتے اور مزارات پر بھی مگر نماز روزے سے ان کو کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس دن بھی ہم سب ٹولی کی شکل میں ایک مزار پر چادر چڑھانے گئے تھے۔ وہاں سے لوٹ رہے تھے کہ راستے میں ”آرا“ شہر کے ایک گرو سے ملاقات ہو گئی۔ اس گرو سے میں پہلے بھی مل چکا تھا اس لیے اسے دیکھتے ہی میں نے ”سلام“ کہا۔ اس نے دعا دے کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا پھر لچھودادی سے بولا۔ ”گرو جی نیگا بھوج کب کھلا رہے ہو؟“

”اگلے جمعہ کو نیگا بھوج کرنے کا سوچا ہے۔ نیوتا بھیجنے کا سوچ رہی تھی۔ تم بھی آئیو اور دوسرے لوگ کو بھی لے کے آئیو۔“

”جرور جرور ہم اور ہماری ٹولی سب لوگ آئیں گے۔“ کہہ کر وہ اپنی ٹولی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

میں نے لچھودادی سے پوربی زبان میں پوچھا۔ ”بھنی کا بھی بتاؤ ای نیگا بھوج کا دعوت ہے۔“

”برادری کے لوگ کا دعوت کا بھنی سب نیگا بھوج کہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اب ہماری شنو کمانے لائیک ہو گئی ہے نا اسی لیے سب لوگ کہتے ہیں کہ اب تو نیگا بھوج دے ہی دو۔ نیگا کے بعد ہی تم اپنی ٹولی میں آسکو گی تبھی نور بیگم تمکا لے جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے ناہیں۔“

اب میں پہلے ایسا معصوم تو تھا نہیں۔ سب کچھ سمجھنے لگا تھا۔ نیگا کے بعد میں آزادی سے لوگوں کے گھروں میں جا کر نیگ مانگ سکوں گا اور نور بیگم سے بھی مل سکوں گا۔ اس بات نے خوش کر دیا تھا۔

لچھو نے پورے چھپرا شہر اور اس کے آس پاس کے تمام برادری میں نیوتا بھیج دیا تھا۔ شہر سے باہر ایک مقام پر بھوج کا انتظام کیا تھا۔ وہ ان کی برادری میں متبرک مقام مانا جاتا تھا۔ صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی لچھو نے مجھے اٹھا دیا میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

ہمارے ساتھ اور بھی لوگ تھے۔ یہ سب لچھو کے ساتھی تھے۔ ہم سب ایک ٹم ٹم پر سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ وہاں بہت ساری بوسیدہ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ماضی میں اسے بطور دھرم شالہ استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک کوٹھری میں ان کا بڑا گڑ درہتا تھا۔ مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی پھر لچھو سے بولا کہ اسے کوٹھری میں پہنچا دو۔

لچھو مجھے لے کر ایک دوسری کوٹھری میں پہنچا۔ یہ والی کوٹھری نسبتاً بڑی تھی۔ مجھے اس کوٹھری میں پہنچا کر لچھو نے کہا۔ ”اور سن اب توں ایہاں سے باہر نہ نکلیے۔ ایہاں ہی رسم ہوئی ہے۔“

باہر پہرے کے لیے ایک زرخا کھڑا ہو گیا باقی سب کہیں چلے گئے۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ ایک کے بعد ایک ٹولی آتی جا رہی ہے۔ سب کے سب بھڑکیلے لباس میں ملبوس تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے عید آگئی ہے۔ کچھ زرخے اندر آئے انہوں نے مجھے زبردستی چٹائی پر لٹا دیا اور میرے جسم سے ایک ایک کر کے تمام کپڑے اتارتے چلے گئے۔ میں تڑپ رہا تھا۔ ہاتھ پیر چلا رہا تھا مگر مجھے ان لوگوں نے اس طرح قابو میں کر رکھا تھا کہ میں چاہ کر بھی انہیں روک نہیں پارہا تھا۔ پھر انہوں نے میرے جسم پر تیل میں بھیلو کر آنے کے بیڑے کو ملنا شروع کر دیا۔ باقی سب اپنی بھونڈی آواز میں گانا گاتے جا رہے تھے۔ اس رسم سے فارغ ہو کر ان لوگوں نے مجھے سرخ ساڑھی پہنا دی۔ پھر بڑے مہنت نے کہا۔ ”اب چل و سپارہ دیوی کے مندر میں چلتے ہیں۔“

مجھے معلوم تھا کہ ہندو کے ہر فرقہ کی اپنی دیوی ہوتی ہے۔ ڈاکوؤں کی دیوی بھوانی۔ جنگلیوں کی بن دیوی۔ جادوؤں کے والوں کی کمکھیا دیوی۔ شاید اسی طرح ان لوگوں کی دیوی کا نام ہے و سپارہ دیوی۔ ابھی تک میں نے کسی مندر میں ہندوؤں کی طرح کسی مورتی کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نور بیگم بھی مسلمان ہے اس لیے مجھے بھی زبردستی کسی مورتی کے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ وہ مورتی ایک اونچے سے پشتے پر بنائی گئی تھی۔ مجھے لے کر وہ سب گاتے بجاتے ہوئے اس پشتے تک پہنچے۔ پھر اس بڑے گرو نے لچھو سے کہا۔ ”اجاجت ہے رے؟“

”ہاں ہاں..... نور بیگم بھی اجاجت دیت رہے ہیں.... آپ اپنا کرتوپالن کر سکت ہیں۔“ لچھو نے کہا۔

نور بیگم کا نام سن کر میں نے بھیڑ پر نظر ڈالی۔ دور کھڑا نور بیگم مجھے نظر آ گیا۔ اسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر گرو نے دور سے میری بلائیں لیں اور مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے زرخے سے کچھ بولا۔

کیا بولا یہ تو مجھے سنائی نہیں دیا مگر کوئی ایسی بات تھی کہ وہ پریشان ہو گیا۔ اس کا چہرہ بھگ سا گیا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا شخص کچھ بول رہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر نور کا چہرہ تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ پریشانی اتنی دور سے بھی مجھے نظر آ رہی تھی۔ میں ابھی اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اس بڑے گرو نے مجھ سے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ ”تجھے بتایا تھا ناں کہ کپڑے اتار کر اس چٹائی پر بیٹھنا ہے۔ جلدی کرو شہ گھڑی بیت رہی ہے۔“ میں نے اس کے بھیا تک چہرے اور ڈانٹ سن کر سمجھتے ہوئے ساڑھی پھر سے اتار دی اور چٹائی پر اس کے بتانے کے مطابق آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ بڑے گرو نے مجھے مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے اس کے حکم پر ویسا ہی کیا۔

”اب آنکھیں بند کر کے دیوی پر دھیان لگاؤ۔“ کہہ کر اس نے سرخ کپڑے سے منڈھی ایک کتاب کھول لی اور اس میں دیکھ دیکھ کر کچھ پڑھنے لگا۔ اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ شاید سنسکرت زبان میں وہ اشوک پڑھ رہا تھا۔ ہندو پوجا پاٹ کے وقت ایسے ہی تو منتر پڑھتے ہیں۔ جیسے ہی وہ منتر پڑھ کر فارغ ہوا اس نے نزدیک کھڑے زرخے کو اشارہ کیا۔

اس زرخے نے وہیں رکھی ایک بالٹی اٹھائی اور مجھ پر خالی کر دی۔ میں شام کی کھلی ہوا میں ٹھنڈ محسوس کرنے لگا مگر خوف اس قدر طاری تھا کہ

میں منہ سے کچھ بول نہیں سکا۔ پھر اس نے سیندر کی کٹوری اٹھائی اور میرے سر پر سے ایک چنگی سیندر گھما کر دور اچھال دیا پھر اس نے اشارہ کیا تو اسی زنجے نے مجھے چٹائی پر زبردستی لٹا دیا اور میرے دونوں پیروں کو دو طرف کرنے کے بعد وہاں لگے کھونٹوں سے باندھنے لگا۔ میں نے گھبرا کر چیخ ماری اور پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”چپ چاپ لیٹی رہ۔“ اس نے اشارے سے کہا۔

”بیٹی لیٹی رہ۔ شدھی ہو رہی ہے۔“ زخما بولا۔

”مگر میرے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔“

”بس کچھ دیر کی بات ہے۔ اس قسم کے حالات سے ہم سب گزر چکے ہیں۔“

”رسی تو ڈھیلی کر دو۔“

”رسی ڈھیلی کر دی تو تیرے پیر ٹوٹ جائیں گے۔“

تبھی ایک عمر دراز زنجے نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”منہ کھول بیٹی۔“

میں نے منہ کھول دیا۔ اس نے نہایت پھرتی سے کپڑے کا گولا میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں پٹخنا شروع کر دیا۔

”اے سنبھالو۔“ بڑے گرو نے کرخت آواز میں کہا۔

کئی زنجوں نے اوپر آ کر میرے ہاتھ پاؤں پکڑ لیے۔ میں ان کی جکڑ سے ٹکنا چاہتا تھا مگر نکل نہیں پار ہاتھا۔ ایک نے میرے سینے پر ہاتھ سے دباؤ ڈال کر مجھے بالکل مجبور کر دیا۔ مجھے اپنی آنکھیں حلقوں سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”اے لا جو سمے ہو گیا۔“ گرو نے کہا۔

تبھی ایک قد آور زخما ایک عجیب قسم کا زنبور لے کر آگے بڑھا اور میری دونوں ٹانگوں کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ ابھی وہ کچھ کرتا کہ کسی کی کڑکتی ہوئی آواز آئی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس بچے کو کھول دو۔“

وہاں جمع زنجے شور کرنے لگے تبھی وہی آواز سنائی دی۔ ”اگر تم لوگوں نے اس بچے کو نہیں چھوڑا تو میں سب کو جیل میں ڈال دوں گا۔“

میں لیٹا تھا اس لیے بولنے والے کو دیکھ نہیں پار ہاتھا مگر اندازہ تھا کہ وہ کوئی پولیس والا ہے۔ اس کے کہنے پر ایک زنجے نے میرے ہاتھ پیر

کھول دیے۔ بھیڑ کو ہٹاتا ہوا نور آگے بڑھا اور مجھے سینے سے لگا کر بڑے گرو سے بولا۔ ”میں ابھی اسے لے کر جا رہی ہوں اگلی پورنماشی کو پھر آؤں گی۔“

پھر وہ مجھے لے کر اس پشتے سے نیچے اتر آیا اور آگے بڑھ رہا تھا کہ وہی پولیس والا چنچا۔ ”اے اے کہاں لیے جا رہے ہو۔ اسے تھانے میں

پیش کرنا ہے۔“

اس کی آواز سنتے ہی نور بیگم نے دوڑ لگا دی۔ ان سب کے بچے سے نکلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ وہاں ایک تانگہ اور وہی زخما پہلے سے کھڑا تھا جو کچھ دیر پہلے نور بیگم کے ساتھ کھڑا تھا۔ جس کی باتیں سن کر نور کے چہرے پر پریشانی چھا گئی تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ ”چل جلدی سے اس تانگے پر سوار ہو جا۔ جلدی کر۔ پولیس والا ان سب کو روکے ہوئے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی ادھر آ گیا تو ہمیں روک لے گا۔“

نور کے ساتھ میں بھی تانگے پر چڑھ گیا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو چابک رسید کیا۔ گھوڑا دوڑنے لگا۔ کافی دور آنے کے بعد اسی زرخے نے کہا۔ ”مجھے اپنی ناکام زندگی یاد آگئی اسی لیے میں نے نور کو طعنے دے دے کہ اس خطرناک کام کے لیے راضی کیا ہے کہ تمہاری زندگی ویران ہونے سے بچ جائے۔ اگر آج کی شدھی کرن سہا پت ہو جاتی تو تم مردوں کی قطار سے نکل جاتے۔ ہماری طرح ویران زندگی ہو جاتی۔“

اس وقت میں چھوٹا تھا اس لیے سمجھ نہیں پایا کہ وہ بولنا کیا چاہ رہا ہے مگر آج غور کرتا ہوں تو اسے دُعا دے دے کر نہیں تھکتا۔ نور مجھے لے کر سیدھے اسٹیشن آیا تھا اور ہم اسی حالت میں کلکتہ چلے آئے تھے۔ کئی سال تک مگر مگر ہم پھرتے رہے۔ دلی، بمبئی، ناگپور، بھساول، سہاگ پور، بھوپال پتا نہیں کتنے شہر کی ہم نے خاک چھانی۔ اس بھاگ دوڑ میں مجھے ہی فائدہ پہنچا۔ میں طرح طرح کے زرخوں سے ملا۔ ان سے فن سیکھا اور نکتے سیکھے۔ بمبئی کے زرخوں سے وہ گر سیکھا کہ کس طرح اپنے جسم کو، چہرے کو خوبصورت بنایا جاتا ہے۔ بھوپال کے زرخوں سے ناچنے کے نکتے سیکھے۔ اس طرح میں بہت چھوٹی عمر میں بہت کچھ سیکھ گیا۔ تین سال قبل ہم پٹنہ آ گئے۔ یہاں آ کر میں نے اپنی ٹولی بنالی۔

یہاں بھی میں اپنی ٹولی کے ساتھ آیا تھا۔ میں اپنے وہی کمال دکھانے آیا تھا جسے دیکھ کر لوگ سدھ بدھ کھودیتے تھے۔ یعنی کہ میں یہاں ناچنے آیا تھا، ڈھولک کی تھاپ پر، گھنگر ووں کی جھنکار میں، کمر مکا مکا کرادائیں دکھا دکھا کر۔ میں اپنی سعی میں کامیاب رہا۔ ساری رات جان محفل بنا رہا۔ لوگوں نے خوب خوب نوٹ لٹائے۔ آوازیں کسیں، چٹکیاں بھریں اور فقرے اچھالے۔ کئی بار میرے دوپٹے کو چھینا، اشارے کیے، پیشکشیں ہوئیں مگر میرے ماتھے پر شکن نہ آئی کیونکہ میں ان سب کا عادی تھا۔ یہ سب میری زندگی کا حصہ تھا اس لیے میں نے نہ کسی کو جھڑکا اور نہ ٹوکا۔ فلمی گانوں پر ناچتا رہا، دوپٹے کو ہوا میں لہراتا رہا۔ فرمائشیں پوری کرتا رہا۔ ایک موٹے ماڑواڑی سیٹھ نے جھومتے ہوئے فرمائش کی ”گجل، گجل۔“

غزل گانا مجھے بھی پسند تھا۔ اس میں تھکن بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ایک جگہ بیٹھ کر سازندوں کے ساز کے ہم آواز ہو کر گلے کا سوز جگاتے رہو یہ زیادہ آسان تھا۔ مگر کیا کروں کہ میرا دھیان بار بار اس جھروکے کی طرف چلا جاتا تھا جہاں عورتیں بیٹھی تھیں۔ درمیان میں پردہ تھا۔ ادھر والیاں ہمیں با آسانی دیکھ رہی ہوں گی مگر مردانہ حصے میں بیٹھے لوگ ادھر نہیں دیکھ پارہے ہوں گے اس لیے کہ پردہ دبیز تھا۔ پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں بیٹھی شخصیت میں سے کوئی مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔ اس کی نظر مجھے چھتی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ کون ہے مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے میں سمجھ نہیں پارہا تھا۔ یوں تو پوری محفل کی نظر مجھ پر مرکوز تھی۔ مگر اس نظر میں کوئی اور بات تھی اسی لیے میں چکرا گیا تھا۔ مگر یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا کیوں کہ میرا قص دیکھنے۔ میرے گلے کے جادو سے لطف لینے والے لگا تار مطالبہ کر رہے تھے۔ ماڑواڑی سیٹھ تو رکے بغیر آواز لگا رہا تھا۔ ”گجل، گجل۔“

غزل کے الفاظ اس کے سر سے گزر جاتے پھر بھی وہ چہچہے جا رہا تھا۔ غزل سننا فیشن جو ٹھہرا۔ امراء و ساء غزل پسند کرتے ہیں اس لیے جاہل بھی خود کو ان کا ہم پلہ قرار دینے کے لیے غزل کی فرمائش کرتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک صاحب آئے اور حسن آرا سے بولے۔ ”فرنگی صاحب کو محفل میں بلایا ہے۔ تم چھین چھری کو لے کر ضرور آنا۔“

چھین چھری میرا لقب تھا۔ لوگ مجھے اسی نام سے پہچانتے تھے۔ اسی نام سے پکارتے تھے۔ میری ہی وجہ سے میری ٹولی مشہور تھی۔ مگر دعوت قبول کرنے کی ذمہ داری حسن آرا کے سر تھی۔ وہی دعوت کے معاملات طے کرتا تھا۔ رقم کے لین دین میں وہ ذرا سخت تھا نا۔ میں تو بس اس کے حکم پر چل دیتی تھی۔ جہاں کہتی ناچنے پہنچ جاتا تھا۔ ہاں جب کوئی مجھ سے کہتا ”چھین چھری تم کیا لو گے“ تب میں مول تول کرتا ورنہ حسن آرا کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ وہ اگر صرف گیت کی محفل کی دعوت قبول کرتی تو میں صرف گیت سنانی اور رقص کی دعوت ہوتی تو رقص بھی کرتی۔

وہ محفل بھی حسن آرا نے بک کی تھی، جس کی یاد گج گج کی تکرار سن کر آرہی ہے۔ حسن آرا نے کہا تھا کہ اس دعوت میں ایک فرنگی صاحب بھی آئے گا۔ میں خوش ہو گیا تھا کہ تب تو بخشش بھی اچھی ملے گی۔ اس دعوت میں واقعی فرنگی صاحب آئے تھے۔ ان کے سامنے مجھے آواز کا جادو جگانا تھا۔ میں نے دیکھ راگ میں تان لگائی ”سجنو ادل جلے ہے سانجھ ڈھلے۔“

آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ دیکھ میں تان لمبی ہوتی ہے۔ میں نے ایک ہاتھ کان پر رکھا دوسرے ہاتھ سے ”بھاؤ“ بتا کر وجد کے عالم میں تان لگا رہی تھی۔ بغیر ہونٹ ہلائے فی پادھانی، گلے سے نکال رہی تھی کہ فرنگی صاحب جو سیب کھا رہے تھے یکا یک اٹھے اور ادھ کھایا سیب میرے ہاتھ پر رکھ کر بولے ”ٹیک اٹ ڈونٹ کرائی۔“

شاید وہ یہ سمجھا تھا کہ میں ہاتھ پھیلا پھیلا کر اس کا سیب مانگ رہی ہوں۔ ایسے لوگوں کے سامنے مجھے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت ماڑواڑی سیٹھ کی فرمائش سن کر مجھے وہی فرنگی یاد آ گیا۔ مگر کیا کرتا؟ ماڑواڑی کی فرمائش بھی پوری کرنی تھی۔ میں نے بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل ”لگتا نہیں ہے جی میرا جڑے دیار میں“ چھیڑ دی۔

غزل ختم کر کے میں گاؤں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، اب باری تھی حسن آرا کی وہ درمیانی وقفہ پورا کرتی تھی۔ ایک نوکر نے فوراً صندل کا شربت پیش کیا۔ صندل کے شربت کی ٹھنڈک رگ رگ میں اترتی چلی گئی، میں نے آنکھیں بند کر کے پیٹھ کو گاؤں سے لگا دیا۔ مگر فوراً ہی اسی احساس نے پھر سے بے چین کر دیا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر پھر ایک بار اس دبیز پردے پر نظر ڈالی مگر کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ میرا تجسس سوا ہو چکا تھا کہ مجھے اس طرح کون گھور رہا ہے۔ میرا تعلق جس صنف سے تھا اسے عورتیں اچھا نہیں سمجھتی تھیں اور پردے کے پیچھے جو بھی تھا وہ مرد تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً عورت ہوگی۔ کوئی عورت مجھے اس طرح کیوں گھورے گی کہ مجھے نظروں کی چھین محسوس ہو؟ جب یہ الجھن نہ سلجھی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پرانے چاہنے والے مسلسل میرا نام لے لے کر آوازیں دے رہے تھے کہ میں ناگن پیش کروں۔ ناگن گاؤں اور طوفانی رقص کروں تو میں ان کی فرمائش رد نہ کر سکا۔ طبلے کی تھاپ پر بجلی بننے لگا۔ جیسے جیسے طبلہ نواز کی گت تیز ہوتی

ہاتھ کی رفتار بڑھتی۔ میری کمر بھی بید مجنوں کی طرح چلک چلک اٹھتی بلکہ یوں سمجھیں کہ میں کڑکتی بجلی کی طرح لہرانے لگا تھا۔

یہ سلسلہ اذان تک دراز رہا۔ میں تھک کر چور ہو گیا۔ تھکن سے چور جسم لیے میں اپنے لیے مختص کردہ کمرے میں جا کر پڑ گیا۔ سازندے بھی آ کر ادھر ادھر لڑھک گئے۔ کچھ ہی دیر میں ہم سب دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

میری آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔ میں انگڑائی لے کر اٹھ گیا اور نیم کی ڈالی سے مسواک کرنا ہوا باہر نکل آیا۔ یہ کوٹھی نواب محسن الملک کی تھی۔ ان کی بہت بڑی جاگیر تھی۔

حسن آرانے ہی یہ دعوت قبول کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ نواب ہیں اچھی بخشش ملے گی۔ ان دنوں سیاست عروج پر تھی۔ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے مقابل آچکے تھے۔ دونوں کا مقصد ایک تھا۔ دونوں فرنگیوں کو ملک بدر کرنا چاہتے تھے مگر انداز الگ الگ تھا۔ مسلمانوں کا کہنا تھا کہ یہ ملک انگریزوں نے ہم سے ہتھیا یا ہے۔ نیپو سلطان نواب سراج الدولہ سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک یہاں کے حکمران مسلمان تھے گویا ہم ہی اصل وارث ہیں اس لیے اس ملک کی حکمرانی ہمیں واپس کی جائے۔ اگر پورے ہندوستان کی حکومت ہمیں واپس نہیں دے سکتے تو وہ تمام علاقہ ہمیں دے دو جہاں ہماری اکثریت ہے۔ اب تو ہر مسلمان کے دل سے ایک ہی آواز نکلنے لگی تھی کہ بن کے رہے گا پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ اس لیے ہمیں اب کم کم ہی دعوتیں ملتی تھیں۔ ہماری برادری بھی ہندو مسلم میں بٹ گئی تھی۔ کافی عرصہ بعد کسی نواب کے یہاں سے دعوت ملی تھی۔ یہاں آنے سے قبل مجھے نواب صاحب کے بارے میں کچھ بھی پتا نہ تھا۔ یہاں آ کر ہی پتا چلا کہ نواب صاحب کے بیٹے کو باپ بننے کا اعزاز ملا ہے۔ جاگیر کے وارث کا وارث آیا ہے اسی وجہ سے ہمیں رات میں بخشش خوب ملی تھی اس لیے اس وقت، بلکہ ساری رات تھکن کا احساس نہیں ہوا تھا مگر اب بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اتنی لمبی نیند لینے کے بعد بھی کسلمندی طاری تھی۔ میں مسواک کرنا ہوا ذہن پر چھائی کسلمندی کو دور کرنے برآمدے میں آیا تھا کہ مجھے شاک سا لگا۔ میری نظریں چو بارے پر جم سی گئی تھیں۔ پتھر کی مورت بن گیا تھا میں۔ ہاتھ تک ہلنا بھول گئے تھے۔

چو بارے پر جو کوئی بیٹھی تھی وہ بھی چونک گئی تھی اور مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی پھر وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

اس وقت مجھے اپنا گلا خشک محسوس ہونے لگا تھا۔ ایسے جیسے گلے میں کانٹے آگے آئے ہوں۔ میری عقل ماؤف تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ مغالطہ ہے یا حقیقت؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میرے دل و دماغ میں طوفان سا اٹھنے لگا تھا۔ اپنی ہستی کو میں ڈوٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میرے دماغ کی اسکرین پر بار بار ایک دھندلا سا عکس آتا اور مٹ جاتا پھر اس عکس کی جگہ وہ ہستی لے لیتی جسے میں نے کچھ دیر پہلے چو بارے پر دیکھا تھا۔ میرا ذہن الجھنے لگا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ کیوں وہ ہستی مجھے اپنی اپنی ہی لگ رہی ہے۔ کیوں اس میں مجھے ایک عجیب سی کشش محسوس ہو رہی ہے۔

ابھی میں اسی فکر میں غوطہ زن تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں پھرتی سے پلٹ گیا۔ میرے پیچھے حسن آرا کھڑا تھا۔ اس کے لپ اسٹک پتے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ”اے بی بی! کس سوچ میں ڈوبی ہو؟“ وہ بولا۔

”اے ہے میں کیوں سوچ فکر میں رہوں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟“ میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

”کوئی تو بات ہے جس کی پردہ داری ہے۔“ وہ دہنی آنکھ دبا کر بولا۔ ”کسی پر دل آ گیا ہے کیا؟ یہ نواب کی کوٹھی ہے سونے کے توڑے ملیں گے۔“

میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور کمرے میں لوٹ آیا۔ میں نے پھولدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہی ساڑھی جو میں رات میں پہنے ہوا تھا۔ اسی میں سو گیا تھا اس لیے وہ بری طرح مسل گئی تھی۔ ٹکنوں سے بھر گئی تھی۔ مجبوراً اسے اتار کر ایک نئی میم صاحب کا دیا ہوا گاؤن پہن لیا اور بستر پر دوبارہ لیٹ گیا اور غور کرنے لگا لیکن ہر طرف اندھیرا سا لگا، کوئی راہ بھائی نہ دی۔ میں مکمل معلومات کا طلب گار تھا۔ لیکن کس سے پوچھوں؟ کوئی ایسا بندہ نظر نہ آیا۔

کوئی ایسا ویسا گھرانہ ہوتا تو میں اب تک زنان خانے میں جا کر پتا کر آتا، لیکن یہ کوٹھی نواب محسن الملک کی تھی۔ ان کا رعب و جلال میں نے رات ہی میں دیکھ لیا تھا۔ ذرا سی خطا پر انہوں نے اپنے ایک مصاحب کو کارندوں سے اٹھوا کر باہر پھینکوا دیا تھا۔ یوں بھی ایک نواب کے چہرے پر رعب و جلال نہ ہو، قوت کا مظاہرہ نہ ہو تو سب بے کار ہے۔ نواب صاحب کے بارے میں اب تک جو معلومات ملی تھیں، اس کے مطابق وہ یہاں پنشن میں شوقیہ کاروبار کر رہے تھے۔ ان کی جاگیر شاید مظفر پور کے نزدیک کہیں تھی۔

میں نے رات میں بھی غور کیا تھا کہ نواب صاحب کا چہرہ مجھے پہچانا پہچانا سا لگ رہا تھا یا پھر اس چہرے میں کوئی ایسی بات تھی جو میرے دماغ کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس پنشن میں کیا ہندو کیا مسلمان، کیا مارواڑی سیٹھ کیا گنگوٹیلی، ہر قسم کے لوگوں میں فن دکھا چکا تھا مگر اس سے پہلے میں کبھی ایسے شش و پنج کا شکار نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار ایسا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میرے سینے میں جودل ہے اس کی بے قراری کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ لیکن کیوں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”اے ہے بہن! یہ رہ رہ کر تم کس خیال میں ڈوب رہی ہو؟“ حسن آرا کی آواز پر میں پھر سے حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔

”طبیعت کچھ بھاری بھاری سی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اے ہے نوج! حسن آرا نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔“ خیر تو ہے کھٹا تو نہیں کھالیا؟“ اس نے پھر آنکھ دبا دی۔

”خدا کے لیے بہن! مجھے اکیلا چھوڑ دو مذاق بھی گراں گزر رہا ہے۔“ شاید میری آواز کچھ تیز ہو گئی تھی۔ ساڑندوں میں سے ایک انوری نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ ”کیوں شور مچا رکھا ہے سونے کیوں نہیں دیتیں۔“

میں نے بھی چادر اوڑھ کر لیٹ جانے میں عافیت سمجھی تبھی نواب صاحب کا نوکر طشت میں انواع و اقسام کے کھانے لے آیا۔

”بھئی اب اٹھ بھی جاؤ، ناشتہ لایا تھا مگر تم لوگوں نے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ اب کھانا لایا ہوں تو اسی طرح پڑے اینٹھ رہے ہو۔ دن کہاں سے کہاں پہنچ گیا مگر تمہیں خبر ہی نہیں۔“ نوکر نے تیز آواز میں کہا۔

”چل چل اٹھ جوئل رہا ہے کھالے اور گھر چل۔“ حسن آرا نے پھر ٹوکا اور میں اٹھ کر دسترخوان پر پہنچ گیا۔ کھاپی کر چلنے کی تیاری کرنے لگا۔

چمچم دروازے سے بس دو تین محلے کے بعد ہمارا محلہ صدر گلی تھا۔

نواب صاحب کے ہاں سے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ اتنی ہی بخشش ملی تھی۔ وہ دور ہی ایسا تھا جب نوابین کی سرپرستی میں ہم جیسے لوگ زندہ تھے۔ اس دور میں نوابین کے دو شوق تھے۔ شکار کھیلنا اور ناچ رنگ کی محفلیں سجانا۔ ایسی محافل کے بھی الگ الگ انداز تھے۔ کوئی طوائفیں بلواتا تو کوئی لونڈے نچواتا اور کوئی مجھ ایسی مخلوق کے نام پر محفل سجاتا۔ ہماری محفل ہنسی مذاق کی محفل کہلاتی کیونکہ ہمارے ساتھ بھانڈ بھی ہوتے جو تھکیں اتار کر ہساتے۔

میری ٹولی پٹنہ کی سب سے مشہور ٹولی تھی۔ ”چھپن چھری“ کے نام سے لوگ ہمیں یاد کرتے تھے۔ بانگی پور، بانس پور، سبزی باغ، رمنا روڈ، مہندر وگھاٹ، دانا پور، پھلواری شریف، سٹی، چمرڈیوڑیہ، گلزار باغ غرض ہر جگہ میرے قدم دران موجود تھے۔ پورے شہر میں میرا طوطی بولتا تھا۔ آرا، چھپرا، بلیا، گیا، مظفر پور حاجی پور سیوان تک مجھے بلایا جاتا تھا۔ کیونکہ مجھے بمبئی بھوپال اور دلی کے زخموں نے اور میری اماں نور بیگم نے اتنا طاق کر دیا تھا کہ بڑی بڑی طوائفیں بھی میرے آگے ٹک نہیں پاتی تھیں۔ کتھک، اوڑیا، پانی پورم ہر قسم کے کلاسک ناچ میرے لیے آسان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی بڑی پارٹیوں میں ہمیں بلایا جاتا تھا۔ میری اماں نور بیگم کا کہنا تھا کہ ”ایک دن تو بہت بڑی رقاصہ بنے گی۔“ اس کا کہنا صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ اب نور بیگم گھر سے نکلتا نہیں تھا۔ عمر کی زنجیروں نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے مجھے دس سال کی عمر سے پالا تھا اس لیے میری نظروں میں اس کا بڑا احترام تھا۔ اس کا سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ اس نے مجھے ہتھوڑا بنائے جانے کے عمل سے بچا لیا تھا۔ میرے ماں باپ کون ہیں یہ مجھے پتا نہیں ہے۔

مجھے بھی اس بات کی کھوج نہ تھی اور نہ میں جانتا چاہتا تھا کہ اس دنیا میں میرا کون کون ہے۔ میں نے تو اماں نور بیگم ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ وہی میری ماں تھا اور وہی باپ۔ اس کے سینے سے لگ کر ہی مجھے نیند آتی تھی۔ خود نور بیگم بھی مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا تھا۔ لیکن جب سے میں نے چوبارے والی ہستی کو دیکھا تھا میرے دل کا عجب حال تھا۔ میں کبھی سوچتا کہ اس سے جا کر پوچھ لوں کہ اسے دیکھ کر میرا دل کیوں کھنچا چلا آتا ہے۔ کیوں مجھے اس میں مقناطیسی کشش محسوس ہوتی ہے؟

اسی کشش و پُنج میں کئی دن گزر گئے۔ اب صبر کا یار نہ تھا۔ میں اپنے اندر سے اٹھتے ہوئے سوالات سے اتنا گھبرا اٹھا تھا کہ خود کو روک نہ پایا اور گھر سے نکل پڑا۔

باہر جاتے دیکھ کر اماں نور بیگم نے پوچھا۔ ”ارے ادگوڑ ماری! کہاں چل دی۔ کسی یار سے وعدہ وعید کر رکھا ہے؟“

”بس اماں ایک کام یاد آ گیا ہے اس سے نمٹتے ہی میں لوٹ آؤں گی۔“

”تجھ پر خاک پڑے۔ ارے اوکتے کی ٹیڑھی دم میں پوچھ رہی ہوں کہاں کو جا رہی ہے؟“ نور بیگم نے پھر پوچھا۔

”بس اماں تمہارا کفن لانا ہے۔“ میں نے کہا اور قدم تیز کر دیے۔ پیچھے سے نور بیگم کی دہائی آتی رہی۔

میں نے گلی سے نکل کر تیزی سے بھاگتی ٹریفک پر نظر ڈالی۔ ٹم ٹم ٹانگہ سب میں گویا دوڑ کا مقابلہ تھا۔ کئی ڈولیاں بھی نظر آئیں جنہیں مزدور

اٹھائے دوڑ رہے تھے۔ ان سب سے قطع نظر کر کے میں نواب صاحب کی کونھی کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

کونھی پر پہنچی تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں اندر بڑھتی چلی گئی۔ روش کو پار کر کے میں برآمدے میں پہنچی تھی کہ وہی ہستی مجھے پھر نظر آئی اور میں ٹھنک گیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا سو وہ بھی اپنی جگہ پر پتھر کی سورت کی طرح ایستادہ ہو گئی۔

”اماں.....!“ میں نے اسے آواز دی تو وہ ایسے چونک گئی جیسے میں نے اسے جھنجھوڑ دیا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”آ..... آ..... بیٹھ!“

برآمدے میں دو کپڑے کی ”آرام کرسی“ پڑی تھیں ایک پر میں بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔ ”شربت منگواؤں؟“

”جی نہیں“ میں بس ایک سوال پوچھنے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”پوچھو۔“

”آپ میں مجھے اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے؟“

”اس کا جواب میں ابھی دیتی ہوں۔“ کہہ کر وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں البم تھا۔ اس نے وہ البم میری

طرف بڑھا دیا۔ اس دور میں تصویر کھنچوانا صرف امیروں کا شوق تھا۔ کیوں کہ تصویر صرف انگریز بناتے تھے۔ امیر امراء انگریز فوٹو گرافرز سے تصویر بنواتے تھے۔ ہندوستانی تصویر ساز بہت کم تھے۔ البم تو میں نے بھی پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

میں نے البم کھولا۔ البم کھولتے ہی میں ایسے چونک گیا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ پہلے ہی صفحے پر ایک بچے کی بلیک اینڈ وائٹ کئی تصویریں تھیں۔ یہ تصاویر بھی کسی انگریز فوٹو گرافر کی بنائی ہوئی تھی اور یہ تمام تصویریں میری جانی پہچانی تھیں۔ ایسی ہی تصویریں میرے پاس بھی تھیں۔ ان تصاویر میں جو بچہ تھا وہ وہاں والی تصاویر میں بھی تھا۔ اگر کچھ فرق تھا تو بس اتنا کہ ان تصاویر میں بچے کے ساتھ جو عورت تھی وہ کافی بارعب تھی یا پھر انہی صاحبہ کی تصویر تھی جب کہ میرے پاس جو تصاویر تھیں ان میں بچے کے ساتھ نور بیگم تھا۔ میرے پاس نور بیگم والی جو تصویر تھی وہ بھی ایک انگریز صاحب نے اپنے ہاں کی پارٹی میں اتاری تھی۔

میں نے تصویروں پر سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔ ”اماں! یہ تصویریں کس کی ہیں؟“

”میرے بڑے بیٹے کی جو بچپن میں کھو گیا تھا۔“ ان کی آواز میں درد ہی درد تھا۔

”آپ نے اس کی خبر لینے کی کوشش نہیں کی؟“ میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ جیسے میں جواب دے کر جرم کر رہا ہوں۔

”ابتداء میں بہت کوشش کی پورے مظفر پور میں تلاش کرایا پھر صبر کر لیا۔ پٹنہ آنے کے بعد تو پوری طرح صبر آچکا ہے۔“

”اگر وہ آپ کو مل جائے تو؟“ میں نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا اور امید بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”نہیں وہ اب نہیں ملے گا کیونکہ کچھ دنوں پہلے مصدقہ خبر ملی ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔“ انہوں نے مردہ لہجے میں

ایسے کہا جیسے وہ کسی کو پر سہ دے رہی ہوں۔ دل کا درد چہرے پر میں نے صاف دیکھ لیا تھا۔

اماں کی بات سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل پر کسی نے چھری ماری ہو۔ میں اندر سے لہولہو ہو گیا۔ تب میں نے سر جھکا کر کہا۔ ”نہیں اماں وہ مرا نہیں ہے۔“

”ہاں وہ مر چکا ہے۔ میں نے اس کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔ میں ماں ہوں نا تو اسے کیسے نہیں پہچانتی۔“ انہوں نے آنکھوں پر ہتھیلی پھیر کر کہا۔ آنسو پونچھنے کے بعد بھی نمی نظر آرہی تھی۔

”آپ..... آپ شاید اس کا چہرہ بھول چکی ہیں۔ اسی لیے مغالطہ ہوا۔“ میں نے آنکھوں میں گھر آئے پانی کو الٹی ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے کہا۔

”آج گھر میں نواب صاحب نہیں ہیں اسی لیے میں نے تمہیں بٹھالیا۔ اگر وہ رہتے تو شاید اندر آنے بھی نہیں دیتے۔ میں ماں ہوں نا اسی لیے تمہیں بلا لیا۔“ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئیں۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مدوجزر میں گھر گئی ہیں۔ ان کے اندر طوفان سا اٹھ رہا ہے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر شہلتی رہیں پھر رک کر بولیں۔ ”جانتے ہو میں نے تمہیں کل ہی پہچان لیا تھا۔ آدھا دن اور ایک رات میں نے کیسے گزاری یہ میں ہی جانتی ہوں۔ بالآخر فیصلہ کر ہی لیا کہ میں تمہیں بیٹا نہیں کہوں گی۔“

”کیوں؟“ یہ سوال خود بخود میری زبان پر آ گیا۔

”اس لیے کہ میری ایک بیٹی بھی ہے۔ لڑکیوں کی زندگی تلوار کی دھار ہے۔ ہلکی سی بھی لغزش خواہ والدین کی ہو یا خاندان کے کسی فرد کی اس کا سیدھا اثر لڑکیوں پر پڑتا ہے اور ان کی زندگی میں اندھیرا اتر آتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بچی کی زندگی پر تمہارا کالا سایہ پڑے اور لوگ دوسرے بیٹے کو بھی تمہارے ایسا سمجھنے لگیں۔ اُس کے بچے کی ولدیت سوالیہ نشان بن جائے۔“ انہوں نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا اور اندر جانے کے لیے مڑ گئیں۔

میرے اندر ہا ہا کا رسا چُچ گیا تھا۔ چیخ چیخ کر رونے کو دل کہہ رہا تھا۔ مگر میں خود پر جبر کیے بیٹھا تھا۔ وہ جا چکی تھیں۔ بد آمدے میں اکیلا تھا۔ میرے اندر اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ میں اٹھ کر کھڑا ہوتا۔ تبھی اندر سے ایک عورت باہر آئی۔ وہ اماں سے بھی زیادہ عمر کی تھی۔ اس نے ٹوٹی کمائی کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی اور میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بغور دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”میں..... میں نے ہی تجھے دودھ پلایا ہے۔ تو میرے لیے سکے بیٹے سے زیادہ عزیز ہے۔ کاش تو یہ سوانگ نہ بھرتا۔ کاش تو مرد بن کر اس گھر میں آتا۔ بیٹے! ہم سب مجبور ہیں۔ اندر تیری ماں آنسو بہا رہی ہے اور تیری بہن رونے کی وجہ پوچھ رہی ہے۔ اب وہ انہیں کیسے بتائے کہ تمہارا بھائی بھجرا ہے۔ کل جب تمہاری شادی ہو گی تو تمہیں سسرال والے یہ کہہ کر طعنہ دیں گے کہ تمہارا بھائی بھجرا ہے۔ صرف بیٹی کی خاطر تجھے سولی پر چڑھایا جا رہا ہے۔ تو جلد سے جلد یہاں سے چلا جا۔ نواب صاحب نے حقیقت جان لی تو وہ اپنی عزت بچانے کی خاطر تجھے گولی سے اڑا دیں گے۔“

موقع کی نزاکت دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا اور وہاں سے چل پڑا۔ اس وقت مجھے اپنے پیر من من بھر کے لگ رہے تھے۔ میں بالکل ہول اٹھا

تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟ جب کوئی راہ سمجھ نہ آئی تو میں چلتا چلا گیا۔ پچھم دروازے سے چمڑیوڑیہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کافی دور آنے کے بعد مجھے ایک خالی تانگہ نظر آ گیا اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ وہ تانگا آہستہ آہستہ دودھنی کی طرف چل پڑا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ تانگے کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اتنی تیز ہو رہی ہے کہ آس پاس کے مناظر بھی دھندلا گئے تھے۔ برابر سے گزرتے تانگے، کھڑکھڑے سوار، پیدل چلتے لوگ سب ایک سائے سے نظر آتے اور گزر جاتے۔

”اے!“ میں نے کوچوان کو مخاطب کیا۔ ”گھوڑے کو قابو کرو۔“

”بی بی گھوڑا قابو میں ہے مگر کوچوان بے قابو ہے۔“ اس نے شائستہ انداز میں غیر شائستہ بات کہی۔

”میں پوچھتی ہوں یہ کس رفتار سے گھوڑا بھاگ رہا ہے۔ چلو انسان کی طرح شرافت سے رفتار کم کرو۔“

”گھوڑا میرے دل کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔ اگر رفتار کم کر دی تو میرا دل بھی ہلکا ہو جائے گا۔“

”ارے تجھے موت آئے ناس پیئے تانگہ روک۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”چیخو خوب چیخو مگر اب یہ تانگہ رکنے کا نہیں۔ یہ تانگہ ابھی رکنے کا جب میں چاہوں گا اور فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”تیری قبر میں کیڑے بلبلائیں۔ تیری لچکتی کھاٹ اٹھے۔ روک لے حرامزادے روک لے ورنہ میں چیخ چیخ کر سب کو جمع کر لوں گی۔“

”چیخو خوب چیخو تمہاری چیخ سننے والا کوئی نہیں ہے۔“ وہ رسان سے بولا۔

تانگہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا مگر کافی دیر بعد اس وقت جب ہم ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد ہر طرف ویرانی تھی خاموشی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی قبرستان میں پہنچ گئے ہیں۔ ایسی خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو دھماکا سا ہوتا۔ اس خاموشی کو میری چیخ نے تار تار کر دیا۔ میں نے تانگے پر سے چھلانگ لگا دی تھی۔ میں سخت زمین پر گرا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

کافی دیر بعد آنکھ کھلی تو میں ایک گڈھے میں گرا ہوا تھا۔ مجھ پر سکون چھا گیا تھا اور میں بالکل سکتے کی سی کیفیت میں زمین پر پڑا تھا۔ میرے سامنے ایک نوجوان ہاتھ باندھے باادب کھڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرے ہی لیے کھڑا ہے۔

”آپ..... آپ کون ہیں؟“ میں نے ہکا کر پوچھا۔

”میں ایک راغبیر ہوں۔ ادھر سے گزر رہا تھا کہ آپ کو یوں سڑک کے کنارے پڑا دیکھا تو رک گیا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

میں نے نظر گھما کر آس پاس دیکھا۔ دور و نزدیک کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ تانگہ تھا نہ کوچوان۔ یہ میں کہاں آ گیا۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تاکہ میں اس کا سہارا لے کر کھڑا ہو جاؤں مگر میں نے سہارا لینا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ”یہ..... تانگہ..... تانگہ کہاں گیا؟“

”تا نگہ تو مجھے نظر نہیں آیا۔ ہاں آپ نظر آئیں سو میں رک گیا۔ ویسے آپ اگر تانگے پر تھیں تو اس گڑھے میں کیا کر رہی تھیں؟“ اس نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

”تا نگہ الٹ گیا تھا۔ اس سے پہلے میں اچھل کر باہر گرا تھا۔“

”اچھا اس تانگے پر آپ تھیں۔ ابھی میں نے دیکھا تھا کہ ایک تانگے والا تا نگہ سیدھا کر رہا تھا پھر وہ سیدھے چلا گیا۔ ادھر۔۔۔“ اس نے اشارے سے بتایا۔

”جی ہاں میں تھا اس تانگے پر۔“ میں نے جواب دیا۔

میری اصل آواز سن کر اس نے بغور مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہر کوئی ہمیں دیکھ کر مسکراتا ضرور ہے۔

”لگتا ہے وہ مغالطے میں آ گیا ہوگا۔ اس نے تمہیں لڑکی سمجھا ہوگا۔ آج کل یہاں ایک گروہ گھس آیا ہے جو لڑکیوں کو اغوا کر کے کلکتہ لے جاتا ہے۔ تانگے والا بھی شاید اسی گروہ کا ہوگا۔“

اس کی بات پر میں دل ہی دل میں خوش ہو گئی کہ واقعی مجھے دیکھ کر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ گویا عام زندگی میں بھی میں لڑکی بن کر لوگوں کو مغالطے میں رکھ سکتا ہوں۔ ابھی تک میں نے اس سچ پر نہیں سوچا تھا مگر زندگی میں یہ جو نیا موڑ آیا تھا اس میں میرا یہ بہرہ وپ کام آ سکتا ہے۔

مگر ابھی زیادہ سوچنے بچھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”اب ہم یہاں سے شہر کیسے جائیں گے؟“

”میں قدم کنواں جا رہا ہوں میرے پاس گھوڑا ہے تم بیٹھنا چاہو تو بیٹھ لو۔ لوگ ہمیں گے مگر مجبوری ہے۔“

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس طرح میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ میرے چہرے کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر نور بیگم نے پوچھا۔ ”اے ہے بیٹی تجھے ہوا کیا ہے؟ کچھ بتائے گی؟“

”اماں!“ کہہ کر میں اس سے لپٹ گیا۔ میری آنکھوں میں ساون بھاؤں کا سماں تھا۔

وہ مجھے سینے سے لگائے کچھ دیر کھڑا رہا پھر میری پیٹھ تھپک کر بولا۔ ”کیا بات ہو گئی مجھ کو بتائے گی نہیں؟“

”مجھے کچھ تو یاد ہے پھر بھی تو آج مجھے سچ بتادے کہ تو مجھے کہاں سے لائی تھی؟“ میں نے نور بیگم سے پوچھا۔

وہ میرا سوال سن کر سوچ میں ڈوب گیا جیسے خیالوں میں وہ خود سے لڑ رہا ہو۔ مجھے حقیقت بتائے یا نہیں اسی شش و پنج میں ہے پھر شاید اس نے خود کو سنبھال لیا اور ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”میں نے تجھے ایک غنڈے کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ سو پور میں جہاں میلہ لگتا ہے اسی گھاٹ پر تو بیٹھا رو رہا تھا کہ تجھ پر ایک غنڈے کی نظر پڑ گئی۔ وہ تجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اتفاقاً میں ادھر جا نکلا۔ تیرے رونے پر میں بوکھلا اٹھا اور اس غنڈے سے بھڑ گیا۔ ہم بھی

پانچ۔ جم کر ہم نے فائٹ کی اور اسے بھگا کر دم لیا۔ اس طرح تم ہمارے پاس آئے۔ ہاں تمہارے گھر کے بارے میں جب میں نے پوچھا تو تم نے بتایا کہ میلہ دکھانے تمہیں تمہارا چچا لے کر آیا ہے۔ وہ تمہیں گھاٹ پر بٹھا کر بھاگ گیا ہے۔“ نور بیگم نے کہا۔

”تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اپنے خاندان کو جان لیا ہے۔“ میرے انکشاف پر وہ حیرت سے گویا اچھل پڑا۔ اس نے خود کو مجھ سے دور کر لیا تھا اور اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ سکتے کے عالم میں کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تو کیا تو مجھے چھوڑ دے گی؟ اس بڑھاپے میں مجھے اکیلا کر جائے گی؟“

اس کی حالت دیکھ کر میں آگے بڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔ بے یقینی کو کم کرنے کا مجھے ایک یہی طریقہ سوچا تھا۔ میں نے اس کے گلے لگ کر اس کے آنسوؤں کو پونچھ کر کہا۔ ”نہیں اماں میں تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔“

”پھر..... پھر..... تو نے یہ کیوں کہا کہ اپنے خاندان کو ڈھونڈ چکی ہے۔“

”ہاں یہ بھی سچ ہے مگر یہ بھی تو سوچ کہ میں لاکھ کوشش کر لوں مگر خود کو بدل نہیں سکتی۔ اس حالت میں وہ کیا مجھے قبول کر لیں گے؟“

”ہاں یہ سچ ہے۔ لوگ ہمیں بچے سمجھتے ہیں۔ اپنے لیے گالی سمجھتے ہیں اگر تو ان کے پاس گئی تو دنیا والے اس گھر کو مذاق بنالیں گے۔ اس طرح نہ صرف تیرا بلکہ اس پورے گھر کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ اگر تو نے ان لوگوں کو جان لیا ہے تو بھی ان سے دور رہ۔“

”کوشش میری یہی ہے۔“ میں نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

میں نے نور بیگم سے یہ تو کہہ دیا تھا کہ میں دور رہوں گا مگر وہ نہ سکا۔ دو ہی دن بعد میں بہت زیادہ بے چین ہو گیا بلکہ اس دن صبح ہی مجھے عجیب سی کیفیت نے گھیر رکھا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ عجیب سا احساس طاری تھا جیسے کوئی بڑی بات ہونے والی ہے۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ نور بیگم کھانا پکانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے دل پر طاری ہو جانے کو کم کرنے کے لیے گراموفون لگا دیا اور اس کی آواز بہت تیز کر دی۔

شور نے نور بیگم کو جزبہ کر دیا۔ وہ چولہے کے پاس سے چلایا۔ ”آئے ہے ناس بیٹی خدا کی مارتھ پر کیوں کان کے پردے پھاڑ رہی ہے؟ میں کہتی ہوں بند کر دے یہ بھونپو!“

ایسی ڈانٹ کی پروا کسے تھی۔ میں نے ایک نظر ان پر ڈالی اور سوئی کے ڈبے سے نئی سوئی نکال کر فٹ کی اور سہگل کا ایک دوسرا ریکارڈ لگا دیا۔ یہ حرکت اسے اتنی ناگوار گزری کہ اس نے سبزی کا ٹبا بند کر کے چھری پھینک ماری اور ساتھ ہی ساتھ چیخا۔ ”تیری گور میں کیڑے پڑیں۔ کیوں میری جان کی دشمن بنی ہے۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ میں ہول دل (امراض قلب) کی مریض ہوں۔ ذرا سی تیز آواز سے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ میں کہتی ہوں بند کر دے یہ شیطانی بھونپو۔“

”اری شیطان کی خالہ مرے تیرے دشمن ابھی تو تجھے بہت کچھ دیکھنا ہے۔ میں تو بس اس لیے گانے سن رہی ہوں کہ دل خوش رہے۔“

”نامراد کہیں کی اپنی خاطر تو میری جان لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اب کی بار بند نہ کیا تو میں چابی دینے والا بینڈل تیرے پیٹ میں اتار

دوں گی۔“ کہہ کر وہ چھٹی اور گراموفون کا ہینڈل کھینچ کر نکال لائی پھر اسے میرے کندھے پر مارتے ہوئے بولی۔ ”حرافہ کہیں کی۔ چل نکل باہر جا کر کہیں مر۔“

اس حرکت نے میرے ضبط کا بندھن توڑ دیا۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی گالیاں دینی شروع کر دی اور پیر پختا ہوا باہر نکل آیا۔ سوچا تھا کہ بڑوس کی خاتون بی بی کے ساتھ کچھ وقت گزار لوں گا مگر اپنی گلی سے نکل کر سڑک پر آیا تو ارادہ بدل گیا اور میں سیدھے سیدھے چلتا چلا گیا۔ میرے قدم نواب صاحب کی کوٹھی کی طرف اٹھنے لگے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا اس وقت میں اس بات کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔

چلتے چلتے بالآخر کوٹھی تک پہنچ ہی گیا۔ اس وقت میں نے زرد اور سرخ چھینٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آنچل درست کرتا ہوا میں کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گیا کیونکہ کوٹھی کا بڑا سا گیٹ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا اور لان میں بہت سارے لوگ جمع تھے۔ میں ابھی اندر پہنچا ہی تھا کہ برابر والی کوٹھی کا خانسامہ لپک کر میرے پاس پہنچا اور بولا۔ ”ارے تم تو وہی ہونا جس نے اس رات سب کو مست کر دیا تھا۔“

”آج تو مست ہونا چاہتا ہے۔ گور کے کیڑے؟“ میں نے طنز یہ انداز میں کہا۔
 ”نہیں نہیں وہ بات نہیں ہے میں تو تم سے راہ رسم بڑھانے کے لیے ایسا بولا ورنہ یہ موقع ایسا نہیں ہے۔“
 ”کیوں کیا ہو گیا؟“

”دیکھو ناں کیسا اندھیر ہے۔ صبح ہی صبح ڈاکو گھس آئے تھے۔ خوب لوٹ پاٹ کی ہے اور کسی کو گولی بھی ماری ہے۔“
 ”کسے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”چلو پتا کرتے ہیں۔“ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔
 کوٹھی کا بیرونی برآمدہ لان پورچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ پولیس والے بھی نظر آرہے تھے۔ وہاں ایک نوکرانی بھی نظر آئی اس کے سامنے بچھی کرسی پر ایک بارعب چہرے والا پولیس آفیسر بیٹھا تھا۔ وہ اس سے سوال وجواب کر رہا تھا۔ نوکرانی اس کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی کہ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور اس نے پولیس آفیسر سے کچھ کہا۔ پولیس آفیسر نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اس نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ میں خوفزدہ سا اس کی طرف بڑھنے لگا۔

نزدیک پہنچتے ہی پولیس والے نے مجھ سے کہا۔ ”اے تم کب سے اس گھر میں آرہے ہو؟“
 ”بات کیا ہے؟“ جواب دینے کی بجائے میں نے سوال کر دیا۔

اس کی تیوری پر بل آگئے تھے۔ وہ جواب میں کچھ کہتا کہ اس کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھے ایک دوسرے انگریز پولیس آفیسر نے انگلش

میں کچھ کہا تو وہ خود پر قابو پا کر بولا۔ ”ایسا کرتے ہیں اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ تم سے دو چار سوالات کروں گا۔ امید ہے قانون کا ساتھ دو گے۔“

میں ان پولیس والوں کی فطرت سے آگاہ تھا۔ یہ لوگ اوپر سے بیٹھے ہونے کی لاکھ کوشش کریں مگر اندر سے زہر بھرے ہوتے ہیں۔ اس وقت تو یہ اتنے نرم لہجے میں بات کر رہے ہیں مگر موقع ملے ہی تنگ بے نیام ہو کر تھرڑ ڈگری پر اتر آئیں گے اس لیے میں نے ان کی بات مان لی وہ دونوں ہی کوئی بڑے افسر تھے۔ ان کے ساتھ میں اندر چلا گیا۔

اس ڈرائنگ روم میں میں پہلے بھی آچکا تھا۔ یہیں بیٹھ کر میں نے تقریباً ایک گھنٹہ اماں کے ساتھ گزارہ تھا۔ اس بار ڈرائنگ روم میں کچھ اور آدمی بھی بیٹھے نظر آئے مگر سب کے چہرے افسردہ تھے۔ ان میں سے دو کو میں پہچانتا تھا۔ وہ دونوں بھی اسی کوشی کے مکین تھے لیکن ان سے نواب صاحب کا کیا رشتہ تھا یہ میں جان نہیں پایا تھا۔ بس اتنا جانا تھا کہ وہ دونوں یہیں رہتے ہیں۔

وہ دونوں خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ہمارے قدموں کی آہٹ پر ان میں سے ایک نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ پھر چونک کر بولا۔ ”صاحب جی یہی تھا وہ جو پہلی بار ناپنے کے لیے یہاں آیا تھا اور پھر دو دن بعد پھر آیا تھا۔ یہ اماں بی سے ملنے آیا تھا۔ ان دونوں کا اماں بی سے کیسا ناتا تھا یہ تو اماں بی ہی بتا سکتی تھیں یا پھر یہ خود۔ اماں بی نے اس سے کیا کیا کہا یہی بتائے گا۔“

تبھی اندر والے دروازے کی دوسری طرف سے دھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ ”اے جی آپ تو بھیا کو بلانے والے تھے۔“ اس آواز پر وہ محترم ایسے خاموش ہو گئے جیسے انہیں کچھ بھی یاد نہ تھا۔ انہیں چپ دیکھ کر پولیس آفیسر نے پھر کہا۔ ”کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہو گئے؟“

”مجھے جانا ہے ایک ضروری کام ہے۔“ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”آپ جا سکتے ہیں۔“ آفیسر بولا پھر میری جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ ”ہاں تو تم بتاؤ اماں سے کیا کیا باتیں ہوئی تھیں؟“

باتیں بتانے کے لیے مجھے وقت درکار ہے کیونکہ میرا حافظہ اتنا اچھا نہیں ہے کہ کوئی بات لفظ بہ لفظ بتا دوں۔ ”میں نے مزاح کے انداز میں کہا۔“ اگر آپ ان باتوں کو میرے الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو سن لیں۔ وہ موسیقی کی شوقین تھیں۔ انہوں نے مجھے راگ پہاڑی کی پہلی انترا کو اٹھانے کا طریقہ بتایا تھا۔ انترا کیسے اٹھے گا یہی وہ بتانا چاہتی تھیں اور ہم ٹھہرے کند ذہن پھر راگ پہاڑی کا ہم سے کیا واسطہ صرف بخشش کے لالچ میں ہم یہاں پہنچ جاتے تھے۔“

”بات یہ تھی۔“ پولیس آفیسر نے پر خیال انداز میں کہا اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھی آفیسر نے مجھ سے پوچھا۔ ”ہاں بتاؤ کبھی اش نے اپنے کسی دشمن کا ذکر کیا تھا؟“

”جی نہیں ہمارے درمیان کبھی ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔“

”اچھا تم جا سکتے ہو۔“

”مگر میں ایک بات پوچھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔“ میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔

”پوچھو۔“

”آخر بات کیا ہوگی ہے؟ یہاں اتنی بھیڑ کیوں ہے؟“

”نواب صاحب اور ان کی بیگم کا قتل ہو گیا ہے ان کی بیٹی اغوا ہو گئی ہے۔“

”کیا؟“ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا اور میں صدمے سے دوہرا ہو گیا تھا۔ کچھ بھی سہی یہ دونوں میرے ماں باپ تھے بھلے ہی انہوں

نے مجھے قبول نہیں کیا تھا مگر تھے تو میرے جنم داتا۔ انہیں کس نے اور کیوں قتل کیا اس کا پتا لگانا مجھ پر فرض تھا۔

”تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم کسی سوچ میں ہو۔ دیکھو وقت رہتے بتا دو ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اگر تم نے سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا تو ہم جلد

سے جلد لڑکی تک پہنچ جائیں گے۔ اسے برآمد کر لیں گے۔“

وہ میری بہن تھی۔ اسے پہچانا ضروری تھا۔

میں اسے کیسے بچاؤں اسی الجھن میں گرفتار تھا۔

مجھے تو یہ بھی پتا نہ تھا کہ دشمن کون ہے۔ والد صاحب کی کس کس سے دشمنی تھی۔

اب ان کا بدلہ لینا مجھ پر فرض تھا۔ ابھی میں انہی لوگوں سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک بچے نے آکر کہا۔ ”آپ کو انکا بی بیلا رہی ہیں۔“

بچے کے جاتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔

”ابھی آیا سرا!“ کہہ کر میں اندر داخل ہو گیا۔

میں جس جنس کا تھا ایسے افراد سے پردہ دار خواتین بھی پردہ نہیں کرتیں اس لیے میں زنان خانے میں بے دھڑک داخل ہو گیا تھا۔ اندر پہنچتے

ہی مجھے وہ بچہ ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں انکا بوا بیٹھی تھیں۔ انہوں نے بچے سے کہا۔ ”ارشد! تم جاؤ اور سب کو منع کر دینا ادھر کوئی نہ آئے۔“

جیسے ہی وہ بچہ باہر گیا انکا بوانے مجھ سے کہا۔ ”بیٹا! دروازہ بند کر کے میرے پاس آؤ تم سے ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

میں نے دروازہ بند کیا اور آکر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ تب وہ بولیں۔ ”چھوٹے نواب کو میں نے بہت سمجھایا تھا مگر وہ مان کر نہ دیئے۔ مجھے

شک ہے کہ اس قتل میں انہی لوگوں کا ہاتھ ہے۔“

”انکا! اگر مناسب سمجھیں تو مجھے بتائیں بابا کی کس کس سے دشمنی تھی؟“

”بڑے نواب کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ یہ جو تیرا بھائی ہے ناں صفدر ارے وہی جس کے بیٹا ہوا ہے مظفر پور میں رہتے ہوئے اس کی

کسی انگریز سے دوستی ہو گئی۔ وہ اکثر ہمارے ہاں آتا تھا پھر ایک روز کسی نے اس فرنگی کے گھر میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیا۔ اس کے جنازے میں

بڑے نواب بھی گئے تھے۔ قبرستان سے آنے کے تیسرے روز ایک رات تین نقاب پوش حویلی میں گھس آئے۔ انہوں نے طنچہ کے زور پر سب کو ایک

کمرے میں جمع کیا اور بڑے وچھوٹے نواب کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ کافی دیر تک پوچھتا چھ کی۔ وہ لوگ کسی گروہ کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ وہ گروہ ویکٹوریائی ایک انگریز کا ہے۔ اس گروہ کے متعلق نہ تو بڑے نواب کو خبر تھی اور نہ چھوٹے نواب کو اس دن تو وہ لوگ چلے گئے مگر اگلے روز پھر آ گئے۔ انہوں نے بڑے نواب کو زد و کوب بھی کیا تھا۔ کہیں کوئی بڑی بات نہ ہو جائے اسی لیے نواب صاحب نے مظفر پور چھوڑ دیا اور یہاں آ گئے۔

”وہ گروہ کس قسم ہے؟ کچھ اندازہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں، مگر بار بار گروہ کا پوچھتے تھے اسی لیے مجھے یاد رہ گیا۔“

”وہ لوگ کون تھے انگریز یا دیسی؟“

”انگریز تھے مگر اردو بول رہے تھے۔“

اکا بوانے ابھی ڈور کا ایک سرا مجھے تھما دیا تھا۔ وہ لوگ اگر یہاں پٹنہ میں ہوں گے تو ضرور میں انہیں ڈھونڈ لوں گا۔ یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا۔ اکا بوانے اور بھی کئی اہم باتیں بتائیں۔ اٹھتے وقت میں نے پوچھا۔ ”صفدر کہاں ہیں؟“

”وہ تو حاجی پورا پنے سرال گیا ہوا ہے۔“

”انہیں خبر بھیج دی ہوگی۔ وہ آجائے تو میں ایک بار پھر آؤں گا مگر میری اصلیت ابھی کسی کو نہ بتائیں۔“

”میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔“

میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں مہناز بانو کو تلاش کروں گا۔ جہاں بھی ہوگی میں اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔ پھر اجازت لے کر باہر آ گیا۔ مجھے باہر آتا دیکھ کر آفیسر نے پوچھا۔ ”کیا بات ہوئی؟“

”ایک بڑی بی تھیں وہ مجھ سے دعا کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔“

”تم کوئی پیر فقیر ہو کہ دعا کرو گے؟“ دوسرے آفیسر نے طنز کیا۔

”بابو جی، ہم سدا سہاگن ہیں۔ جس کے حق میں دعا کر دیں وہ پوری ضرور ہوتی ہے۔“

”اچھا، اچھا، جاؤ! ہاں میں شہر چھوڑنے سے پہلے ہمیں خبر ضرور کرنا۔“

”اچھا!“ کہہ کر میں اس کوٹھی سے باہر نکل آیا۔

سڑک پر پہنچا تو دو تین ٹھہرے مل گئے اور لگے آوازیں کسنے مگر میں نے کسی کی جانب توجہ نہیں کی اور اپنے محلے کی طرف بڑھتا رہا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں بھی لطف لیتا۔ وہ مجھے چھیڑتے اور میں انہیں تاکہ دوسرے لوگ بھی لطف لے سکتے۔ مجھے خاموش پا کر وہ بھی آگے بڑھ گئے۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ میرے ناتواں کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری آپڑی تھی۔

جس ماں باپ نے مجھے جنم دیا تھا ان کے قتل کا بدلہ اگر میں نہ لیتا تو حقیقت میں میں وہی ہوتا جو زبردستی بنا ہوا تھا، لیکن یہ بھی حقیقت تھی

کہ بدلہ لینا آسان نہیں ہے۔ بدلہ لینا ہے، کہنا آسان تھا، مگر اس بات کو پورا کرنا بہت مشکل بات تھی بلکہ ہمارے ایسے کے لیے تو ناممکن۔

بہن کو تلاش کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرنا پڑتی اور بھاگ دوڑ کرنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہیں تھی۔ میں کہاں سے اتنی رقم کا انتظام کروں، ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا اور مسکرا اٹھا۔ وہ ٹکلیل تھا، ٹکلیل حسن آرابی بی کا آدمی تھا۔ جس طرح مہذب معاشرے میں ہر عورت کا ایک شوہر ہوتا ہے اسی طرح ہمارے معاشرے میں بھی ہر ایک کا ایک آدمی ہوتا ہے۔ وہ ہر مہینے خرچ بھی دیتا ہے۔ ٹکلیل بھی حسن آرا کو ہر ماہ ایک معقول رقم دیتا تھا۔ اس نے مجھے رکتا دیکھ کر کہا۔ ”کہاں جا رہی ہو شنو؟“

”بس یوں ہی نکل پڑی تھی۔“

”تو چلو آج میں تمہیں پھر کی سیر کرا لاتا ہوں۔“

”پھر“ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں جو اکھٹا جاتا ہے۔ ایسی جگہ میں کبھی گیا نہیں تھا پھر ابھی جس سانچے کو دیکھ کر آیا تھا اس کے بعد ایسی جگہ جانا مناسب نہیں تھا مگر ٹکلیل کے اصرار پر چل پڑا۔

دراصل میرا ذہن ماؤف تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بس اسی غمخیزے میں پھنسا ہوا میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ایک تاریک گلی کے خستہ سے مکان پر پہنچا اور دروازے پر دستک دے کر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

پہلے اوپر کی منزل سے کسی نے جھانک کر دیکھا پھر ہلکی آواز میں سیٹی بجی اور دروازہ کھل گیا۔

دروازہ ایک بڑھیا نے کھولا تھا۔ ٹکلیل اسے سلام کر کے اندر داخل ہوا۔ سامنے پختہ فرش کا آئینہ تھا، اسے پار کر کے ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں کئی لوگ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ٹکلیل ان کا جائزہ لیتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں پہنچا۔ وہاں بھی تاش کی محفل جمی ہوئی تھی مگر یہاں جو لوگ تھے وہ صورت شکل ہی سے مہذب نظر آ رہے تھے اور انگریزی کرسی میز پر بیٹھے تھے۔ وہ سب مارواڑی سینٹھ لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ٹکلیل سے کہا۔ ”او بھایا! کا دیکھ رہے ہو آؤ سنتوش تو اب کھلاس ہوا۔“

”ہاں یار! میں تقریباً آٹھ سو بار چکا ہوں۔“ سنتوش نامی شخص بولا۔

”آج میں نہیں، میری یہ جان کھیلے گی۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

”مگر میرے پاس تو کل 25 روپے ہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”کوئی بات نہیں، چھوٹی بازی سے شروع کرو۔“

پتا نہیں میں کس جذبے کے تحت ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ سب فلش کھیل رہے تھے۔ پہلی ہی بازی دو روپے کی تھی۔ میں نے بلاسٹ دو روپے کا کھیلا۔ باقی تینوں میں سے ایک نے بھی بلاسٹ چلی۔

مجھے فلتش کھیلنے میں کوئی زیادہ مہارت نہیں تھی اور نہ کبھی مجھے اس کا شوق تھا جب کہ ہمارے کمرے میں بھی اکثر فلتش کی محفل جمع ہوتی تھی اور آنے والے پر بلاسنڈ کھیلا جاتا تھا۔ انہیں ہی کھیلتے دیکھ کر میں بھی اس کی ابجد سے تھوڑا بہت واقف ہو گیا تھا۔ 25 روپے میں کتنی دیر کھیلتا، اس لیے سوچ لیا تھا کہ جیب میں پڑی رقم ختم ہونے کے بعد کسی بہانے سے وہاں سے اٹھ جاؤں گا۔

بہر حال کھیل میں شریک ہوا تو پہلی کے بعد دوسری چال میں بھی بلاسنڈ کھیلا۔ تیسری چال میں بھی میں نے بیس روپے سے بلاسنڈ کیا تو باقی کے پانچ آدمیوں نے پتے اٹھا لیے۔ اب میرے پاس روپے بھی نہیں تھے کہ بلاسنڈ کھیلتا مگر اسی وقت ایک نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور میرے اطمینان پر دھوکا کھا کر اس نے شوکر ادا کیا۔ میرے پاس پہلا پتا نہ ہلا تھا دوسرا بھی پان کا دہلا تھا اور تیسرا غلام۔ ٹرائل دیکھتے ہی ٹھیکیل نے ہڑے کا نعرہ لگا دیا۔ ایک ہی جھٹکے میں میں نے چار سو روپے کا بورڈ لے لیا۔ میرے سامنے والے کھلاڑی نے اپنا پتا گڈی میں ملاتے ہوئے کہا: ”یار ٹھیکیل یہ تو بہت اچھا کھلاڑی ہے۔“

اب میری ہمت بڑھ چکی تھی لیکن میں بدستور محتاط انداز میں التاسیدھا کھیلتا رہا اور قسمت سے جیتتا رہا۔ زیادہ تر میں بلاسنڈ چل رہا تھا اور اتفاق سے میرے پتے بھی اچھے نکل رہے تھے اور پھر جب مارواڑی سیٹھ نے جھلا کر شوکرانے کی بجائے اپنے دو جھٹکے گڈی میں ڈال دیے اور میں نے بیگم پیش کر کے تقریباً آٹھ سو کا بورڈ سمیٹا تو وہ تلملا کر رہ گیا۔ ”سالا! اپن کی تو آج قسمت ہی کھراب ہے۔“

”غلطی بھی تو تم ہی نے کی۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں شوکراتا۔“ ٹھیکیل بولا۔

سیٹھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چونکہ جھلا گیا تھا اس لیے بڑی بڑی رقیں ہارنے لگا۔ رات کو تقریباً ڈیڑھ بجے کھیل ختم ہوا تو میں ڈھائی ہزار سے زائد رقم سمیٹ چکا تھا۔ ٹھیکیل نے بھی تقریباً سات آٹھ سو سے کم کی رقم نہ جیتی تھی۔ باقی تین کھلاڑی برابر پر چھوٹے تھے البتہ مارواڑی سیٹھ تقریباً تین ساڑھے تین ہزار کی خطیر رقم ہار چکا تھا۔ آج کے تاظر میں یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے مگر اس وقت یہ بہت بڑی رقم تھی کیونکہ وہ نہایت سستا زمانہ تھا۔ ایک روپے میں مہینے بھر کا راشن آ جاتا تھا۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ آ جانے سے میں خوش ہوا اٹھا تھا۔

پھر سے نکلتے وقت ٹھیکیل بولا۔ ”جانی! تم تو چھپی رستم ہو۔ یہ فن حسن آرا کو بھی سکھا دو۔“

”ایک بات کہوں یقین کرو گے؟“

”کہو.....!“

”آج میں نے زندگی میں پہلی بار جوا کھیلا ہے۔“ میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا۔ ”اور جس وقت تم لوگوں نے مجھے کھیلنے پر مجبور کیا تھا اس وقت میرے پاس بہت معمولی سی رقم تھی اس لیے میں بلاسنڈ پر گزارہ کر رہی تھی۔“

”تو گویا آج میری وجہ سے تم نے اتنی بڑی رقم جیتی ہے کیونکہ نہ تم سے ملاقات ہوتی نہ میں تمہیں اپنے ساتھ کھیلنے پر مجبور کرتا اور نہ تم اتنی

بڑی رقم جیتتیں۔ وہ بھی اس پھڑکے سب سے چالاک کھلاڑی سے۔ وہ ماڑواڑی سینٹھ صرف جیتنے آتا ہے۔ آج رات وہ شاید سو بھی نہ سکے۔“

”لیکن میں ضرور چین کی نیند سوؤں گی کیونکہ حقیقتاً مجھے آج رقم کی بڑی شدید ضرورت تھی۔“

”کیا ضرورت پوری ہوگئی؟“

”نہیں ابھی اور رقم کی ضرورت ہے۔“

”کس سلسلے میں؟“

”کاروبار شروع کرنا چاہتی ہوں۔“ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”اگر اور رقم کی ضرورت ہے تو مجھ سے مانگ لینا۔“ اُس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”دو چار ہزار روپے میرے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔“

”آں.....! تو کیا تم کسی نواب گھرانے کے ہو؟“

”نہیں، میرا کاروبار ہی کچھ ایسا ہے۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”حسن آرا کو تو اُس کی اوقات کے مطابق سو روپے ماہانہ دیتا ہوں جبکہ تین

تین طوائفوں کو بھی نوکر رکھے ہوئے ہوں اور ہر طوائف کو ہزار ہزار روپے دیتا ہوں۔ لکھنؤ کی نکلت جان سے بات چل رہی ہے۔ اُسے پانچ ہزار ماہانہ

دوں گا۔“ اُس نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ اتنا امیر آدمی ہے۔ یقیناً بہت بڑا کاروبار ہوگا۔

تانگہ منڈی کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر چوک کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اب راستہ سسنان نظر آ رہا تھا۔ ہم موڑ تک پہنچے ہی تھے کہ تانگے والے

نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اُسے روک لیا۔

سڑک کے تپوں بچ ایک بیل گاڑی کھڑی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ دائیں بائیں کہیں سے بھی آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ میں اس بیل

گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی کہ دو طرف سے کئی آدمیوں نے تانگے کو گھیر لیا۔ سب کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے۔

اس اچانک آئی اُفتاد سے میں بری طرح بوکھلا اٹھا تھا کیونکہ ہم پوری طرح اُن کے زرخے میں تھے۔ دو آدمی پائیدان پر چڑھ آئے تھے۔

اُن میں سے ایک چھریرے بدن اور دراز قد کا تھا اور دوسرا درمیانے قد اور دہرے بدن کا مالک تھا۔ چھریرے بدن والے نے کرخت لہجے میں مجھے

مخاطب کیا۔

”زندگی چاہتی ہو تو شرافت سے جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمارے حوالے کر دو ورنہ پورا جسم چاقوؤں کے زخم سے بھر جائے گا۔“

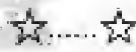
”تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“ میں نے بے جگری سے سوال کیا۔

”ہمیں مال چاہیے مال.....! ہمیں خبر ہے کہ اس وقت بھی تمہارے پاس ایک بڑی رقم ہے۔ جلدی نکالو.....!“

جواب میں میں کچھ کہتا کہ ثقیل نے ڈانٹ کر کہا۔ ”چلو بھاگو یہ میری جان جاں ہے۔“

کھلے ہوئے چاقو سنبھالے کھڑے لوگوں کو اس بے جگری سے ڈانٹا آسان نہ تھا، لیکن اس ڈانٹ نے انہیں ڈھلا دیا۔ پائیدان پر کھڑے دونوں آدمیوں نے نیچے چھلانگ لگا دی اور نہایت تیزی سے وہ سب سامنے والی گلی میں بھاگتے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ٹکیل نے کہا۔ ”یہ لوگ پھڑ سے ہمارے تعاقب میں آئے تھے۔ اُس پھڑ میں میرا ساٹھ فیصد حصہ ہے۔ یہاں سے جب کوئی نیا آدمی جیت کر جاتا ہے تو اُس کی جیب راستے میں خالی کرالی جاتی ہے۔ اب تو تم بھی جان گئیں کہ میرا اصل کاروبار کیا ہے؟“

”گلتا ہے تم سے دوستی رکھنی پڑے گی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ یوں بھی میں نے جس راستے پر آگے بڑھنے کا سوچ رکھا تھا اس راستے پر ایسے لوگوں کی بہت ضرورت تھی جو ضرورت پڑنے پر مار پیٹ کر سکیں۔



آرمس پروہت

آرمس پروہت، نام ہے عمران سیریز کے نئے ناول کا جسے آپ کے لیے مظہر کلیم جیسے کہنے مشق مصنف نے تحریر کیا ہے۔ اس بار برادر ملک مصر کی سیکرٹ سروس کے سربراہ نے پاکیشا سیکرٹ سروس سے درخواست کی کہ وہ اُن کے ملک سے چوری ہو جانے والے قیمتی تاریخی نوادرات کو بازیاب کرانے کے لیے اُن کی مدد کرے لیکن ایکس ٹونے سیکرٹ سروس کے لیے یہ کیس لینے سے انکار کر دیا۔ کیوں؟ مصر کے نامور عالم نے عمران سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں اُن کی مدد کرے تو عمران خود سے کوئی فیصلہ لینے کی بجائے سید چراغ شاہ صاحب سے مشورہ لینے چلا آیا۔ کیوں؟ اس کیس میں ایسا کیا تھا جس کے لیے عمران جیسا شخص تذبذب میں پڑ گیا؟ مصر کے عجائبات سے چوری ہونے والی قدیم تختیاں جن کے حصول کے لیے عمران اور ٹائیگر کو ایک خونریز جنگ لڑنی پڑی۔ وہ تختیاں ایسا کون سا راز اپنے اندر چھپائے ہوئے تھیں کہ مجرم ایجنٹ اُن کے لیے عمران کے خون کے پیاسے ہو گئے؟ آرمس پروہت، ایک شیطان صفت پروہت جس کے مقبرے کی کھوج لگانے کے لیے لوگ صدیوں سے سرگرداں تھے لیکن وہ مقبرہ دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔ آخر ایسا کیا تھا اُس مقبرے میں جو سید چراغ شاہ صاحب جیسے درویش صفت انسان بھی اُس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے؟ اور جب عمران کو آرمس پروہت کے مقبرے کو ٹریس کرنے کا ٹاسک ملا تو کیسے کیسے حالات پیش آئے، عمران اور ٹائیگر کو اُن کی کاروں پر راکٹ فائر کر کے اڑا دیا گیا۔ عمران اور ٹائیگر کس طرح اس راکٹ حملے سے بچ پائے؟ آخر کیوں جوزف کو اپنی کلائی کاٹ کر اپنا خون عمران کے حلق میں پٹکانا پڑا؟ کیا عمران اور ٹائیگر کوئی زندگی مل سکی؟ کیا عمران آرمس پروہت کا مقبرہ ٹریس کر سکا۔ یہ سب جاننے کے لئے پڑھیے ناول ”آرمس پروہت“

”آرمس پروہت“ کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے جاسوسی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

اب میرے پاس رقم بھی تھی اور مزید رقم کا ذریعہ بھی۔ شکیل سے ضرورت کے وقت رقم ادھار لی جاسکتی تھی اس لیے میں نے بہن کو ڈھونڈنے کے راستے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ قسمت نے پہلے ہی قدم پر میرا ساتھ دے دیا تھا اس لیے مجھے قوی امید تھی کہ میں اپنے والدین کے قاتل اور بہن کے اغواء کار کو تلاش کر لوں گا۔ گوکہ ابھی میرا ایک بھائی زندہ تھا مگر وہ بیوی بچوں کی زنجیر میں بندھا ہوا تھا اس لیے وہ بھی بزدل ہی ہوگا۔ جو کچھ بھی کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہوگا مگر کس طرح میں اسی پر غور کر رہا تھا اور کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی تھی۔ اتنے بڑے شہر میں ایک ایسے آدمی کو تلاش کرنا تھا جسے میں نے دیکھا بھی نہیں تھا پھر بھی میں نے ٹھان لی تھی کہ اُسے ڈھونڈ کر ہی دم لوں گا کیونکہ پتا نہیں میری معصوم بہن پر کیا گزری؟ کافی سوچ بچار کے بعد میں نور بیگم سے ہر رشتہ توڑ لینے پر غور کرنے لگا کیونکہ اُن کے ساتھ رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”کس سوچ میں ڈوبی ہے تو؟“ نور بیگم بی بی نے ٹوکا۔

”اماں! میں تمہیں چھوڑنے والی ہوں۔“

”کیوں کیا کسی سے آنکھ لڑائی ہے؟ مگر یاد رکھ کوئی بھی ہم ایسے لوگوں کا نہیں ہوتا۔“

”نہیں اماں! ایسی بات نہیں ہے۔“ کہہ کر میں دھیرے دھیرے ساری بات بتاتا چلا گیا۔ اُس وقت نور بیگم کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ پھر میں بولا۔ ”مجھ پر تمہارا بہت احسان ہے مگر جنہوں نے مجھے جہنم دیا ہے اُن کے بھی احسانات کم نہیں ہیں اس لیے اُن کا بدلہ لینا چاہتی ہوں۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ اُن کے احسانات نہیں ہیں پھر بھی میں تجھے اکیلی نہیں چھوڑ سکتی۔“ نور بیگم اٹل لہجے میں بولی۔

کہیں یہ میری راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے میں اس پر غور کرنے لگا۔ جب کوئی راہ بھائی نہ دی تو میں اٹھ کر سونے چلا گیا۔ آرام کر لینے سے ذہن کھلتا ہے یہی میں نے اٹھتے اٹھتے کہا تھا۔

بستر پر لیٹ کر بھی یہی خیالات ستاتے رہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ اگر رہا تو میں اپنا مشن پورا نہیں کر سکوں گا۔ مجھے ہر حال میں اپنی بہن کو ڈھونڈنا ہے۔

مگر یہاں سے نکل کر جاؤں تو کہاں جاؤں یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت غور کرنے پر ایک راستہ نظر آیا کہ اگر میں کچھ دنوں کے لیے کلکتہ حسینہ کے پاس چلی جاؤں دو دن کے بعد واپس آ کر کسی علاقے میں گھر کرایہ پر لے کر تلاش کا کام شروع کر دوں۔

اپنے اس خیال کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے میں نے ٹھان لیا اور اسی وقت چپکے سے دو کپڑے اور اپنے میک اپ کرنے والا سرخی پاؤڈر سوٹ کیس میں رکھا اور ایک پرانا سا برقع لیا جو ایک بیگم صاحبہ نے خیرات میں دیا تھا۔ ان سب چیزوں کو لے کر کھڑکی سے باہر آ گیا۔

مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میں بیچرا نہیں لڑکا ہوں لیکن خود کو نور بیگم اور حسن آرا سے مخفی رکھنے کے لیے برقع پہن لیا تھا۔ اور اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صدر گلی سے گلزار باغ اسٹیشن تک میں تانگے پر آیا تھا اور اب پلیٹ فارم کے ایک بیچ پر بیٹھا تھا۔ اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ ابھی ابھی ایک گاڑی آئی تھی اور اس گاڑی سے اترنے والے باہر نکل رہے تھے۔ ہر جانب اثر دھام تھا۔ اتنی بھیڑ میں بھی میں خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ دل میں غم و

الم کا دریا موجزن تھا۔ نور بیگم کا سہارا بہت مضبوط تھا۔ میں ہر طرح سے اس کے گھر میں محفوظ تھا۔ لیکن حویلی سے آنے کے بعد سے میں بہت بدول ہو گیا تھا۔ دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ مجھے پٹنہ کا ذرہ ذرہ لعنت کرتا محسوس ہو رہا تھا، اسی لیے میں نے رخت سفر باندھ لیا تھا۔ کچھ دیر پہلے نور بیگم نے کیسے رو رو کر آنکھیں پھلا لیں تھی۔ وہ باتیں یاد آ رہی تھیں۔

ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ اور آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ بار بار گالوں پر ڈھلک آ رہے تھے۔ میں نے برقع کے اندر ہی ہاتھ لے جا کر آنکھوں پر پھیر لیے تھے۔ تبھی میری نظر ان دو لفٹوں پر پڑی جو میرے بیچ کے نزدیک کھڑے تھے۔ اور مجھے تیز نظروں سے گھور رہے تھے۔ میرے ہاتھوں میں بھر بھر کلائی چوڑیاں تھیں۔ جن کی جھنکار لوگوں کو متوجہ کر رہی تھی۔ میرا ہاتھ ہلتا اور لوگ مڑ کر دیکھتے۔ صنف نازک میں جو کشش ہے اسی کشش کو دوبالا کرنے کے لیے تو کانچ کی چوڑیاں پازیب اور پائل پہنایا جاتا ہے۔ اور اس شور مچاتے زیور کو بھی سولہ سنگھار میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ مردوں کو متوجہ کر سکتا ہے۔ میں پوری کشش کر رہا تھا کہ چوڑی کی کھنک نہ گونجے مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں چاہ کر بھی جھنکار کو روک نہیں پارہا تھا۔ ہاتھ کے ہلتے ہی جھنکار گونج اٹھتی تھی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ وہ لفٹ کے پتا نہیں کہاں سے آ کر نزدیکی دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے تھے اور نسبتاً حیز آواز میں بائیسکوپ کا مشہور گانا گارہے تھے۔ ”چلو آج کھو جائیں بہاروں میں کہیں۔“

پری چہرہ نسیم بانو کا یہ گانا مجھے بھی پسند تھا اور میں اکثر اسے گاتا تھا۔ جب گاتا تھا تو محفل پر سکوت چھا جاتا تھا اس لیے کہ میں تو آہستہ آہستہ دوہراتا تھا اور رقص کے بھاؤ سے محفل کو لبھاتا تھا مگر حسن آرا اس گانے کو بلند آواز میں گاتی تھی۔ اس کی آواز اور میرا رقص محفل کیوں نہ گرم ہوتی؟ مگر اس وقت مجھے اس کی بے سری آواز ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

میری خاموشی کو اس نے میری بزدلی سمجھا اور مجھے اکیلی لڑکی سمجھ کر کچھ اور قریب آ گیا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو میں بھی لطف لیتا۔ انہیں بے وقوف بنا کر کچھ نہ کچھ اینٹھ لیتا کیونکہ بچپن سے یہی دیکھتا آیا تھا لیکن اس وقت میں اس موڈ میں نہیں تھا۔ دل میں غم کا دریا موجزن ہو تو دل لگی کیسے سوچے؟ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا اور جھک کر سوٹ کیس کو اٹھا لیا تھا۔ اس میں کچھ کپڑے تھے جو اب میرے کسی کام کے نہ تھے۔ ان کی ضرورت اب ختم ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں نے رکھ لیے تھے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ڈگر کو چھوڑ آیا تھا۔ میں بھر بھر کلائی چوڑی پہننے کا عادی تھا۔ سوٹ کیس اٹھانے جھکی تو چوڑیاں کھنکنا اٹھیں۔ اس کھنکناہٹ پر کئی سر ہلے کئی لوگوں نے گردن موڑی۔ میں ہر طرف سے بے پرواہ سوٹ کیس اٹھائے لیڈیز ویننگ روم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میں نے انگریز عورتوں کی طرح ہائی ہل کی سینڈل پہن رکھی تھی۔ چنچہ فرش پر اس کی کھٹ کھٹ گونج رہی تھی۔

اندر داخل ہو کر میں نے ویننگ روم کا جائزہ لیا جہاں کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں جوان بھی تھیں اور بوڑھی بھی۔ سب کی نظریں میری جانب اٹھ گئیں تھیں۔ ان سب پر نظریں دوڑاتا ہوا میں ایک خالی بیچ پر بیٹھ گیا۔ مگر فوراً ہی اٹھ گیا اور برابر میں بیٹھی عورت سے بولا۔ ”بہن ذرا سوٹ کیس دیکھنا۔“ اور واش روم میں داخل ہو گیا۔ پہلے چنچنی لگائی پھر نقاب اٹھا کر آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ چہرے کا جائزہ لیتے ہی دل دھک سے رہ

گیا۔ شاداب چہرہ عجیب سا اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ آنسوؤں نے میک اپ خراب کر دیا تھا۔ میں نے نکا کھول کر چہرے پر چھینٹے مارے۔ اچھی طرح چہرہ دھو کر انگریزی سرخی یعنی لپ اسٹیک لگائی۔ چہرے پر پاؤڈر اور گالوں پر روج لگایا۔ اور دوبارہ چہرے کا جائزہ لیا۔ چہرہ پھر سے نکھر آیا تھا۔ بے رونقی چھپ گئی تھی۔ نقاب گرا کر ہاتھ روم سے نکل آیا۔

ابھی باہر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔ ریل آرہی تھی۔ میں دیننگ روم سے باہر نکل آیا۔ پلیٹ فارم پر ہانچل مچ گئی تھی۔ ریل آتی نظر آ گئی تھی۔ خونچہ والوں، چائے والوں، دال چاول والوں نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ ہندو کھانا، مسلمان کھانا کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں بھیڑ کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ عورت سمجھ کر لوگ راستہ دے رہے تھے ورنہ تو وہ پریشانی ہوتی کہ بتائیں سکتا۔ دروازوں پر دھکم پیل مچی ہوئی تھی۔ عورتوں کے کمپارٹمنٹ میں تو چڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ عام طور سے مرد حضرات سامان عورتوں کے ڈبے میں چڑھانا زیادہ اچھا سمجھتے ہیں کہ عورتیں سامان کی حفاظت زیادہ بہتر انداز میں کرتی ہیں۔ اس لیے وہاں رش کا عالم الامان الحفیظ۔۔ میں نے مردوں والے ڈبے کو ترجیح دی اور ادھر بڑھ گیا۔ کسی نہ کسی طرح اوپر چڑھنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ ایک بڑی بی نے جو صورت سے ہی رحم دل لگتی تھیں مجھے اپنے پاس والی نشست پر جگہ بنا دی۔ میں وہاں ہی بیٹھ گیا۔

میں برقع میں تھا اس لیے دور ہی سے پہچان ہو رہی تھی کہ میں کسی مسلمان گھرانے سے ہوں۔ مجھے دیکھ کر ایک بڑے میاں اپنے ساتھ کی عورت کو میرے برابر میں بٹھا گئے۔ وہ بھی باپردہ تھی۔ مگر شاید کچھ زیادہ ہی شوخ تھی۔ اس لیے کے بڑے میاں کے ہتے ہی اس نے پوچھا۔ ”بابی کہاں تک جائیں گی۔“

میں بولنے سے سے کترار ہا تھا کہ آواز چغلی کھا سکتی ہے۔ میرا پول کھل سکتا ہے۔ مگر بولے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”کلکتہ۔“

”ارے واہ ہم بھی کلکتہ جا رہے ہیں۔“

اس نے کھسک کر میرے لیے مزید جگہ بنا دی تھی۔ ٹھنڈ میں اس کے بدن کی گرمی مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ میں آرام سے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ایک نوجوان کھڑا انگریزی مشروب ”چائے“ پی رہا تھا۔ اس مشروب کی بھی کیا بات ہے۔ پل بھر میں تھکن اتار دیتی ہے۔ مجھے یوں اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ نوجوان کچھ زیادہ ہی اکڑنے لگا۔ پوز مارنے لگا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اشارے سے چائے والے کا پوچھا۔ میرا اشارہ پا کر وہ تو گویا ریشہ ختمی ہو گیا۔ اس نے بغیر کچھ پوچھے اسٹال پر پہنچ کر جو سامنے ہی تھا۔ ایک کپ چائے لی اور کپ لے کر ٹرین کی طرف دوڑا۔ میں نے بغیر کچھ بولے۔ شکریہ ادا کیے چائے کا کپ تھام لیا۔ میں کوئی لڑکی تو تھا نہیں کہ مجھے شرم آتی یا میں تردد کرتا۔ ایسا تو میرے لیے روز کا معمول تھا۔ یہ تو میرا کام تھا۔ ایسا کر کے سکون ملتا تھا۔

ابھی میں چائے ہی پی رہا تھا کہ ریل نے سیٹی بجائی۔ میں نے جلد بازی میں ایک بڑا گھونٹ لے کر چائے کا کپ خالی کیا اور اس نوجوان کی طرف بڑھایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور کپ لے کر چلا گیا۔ وہ کپ رکھ کر واپس پلٹنا چاہتا تھا کہ دکاندار نے پیچھے سے اس کی قمیض پکڑ لی۔ شاید اس نے

پیسے کم دیے تھے۔ ریل نے ریگنا شروع کر دیا تھا۔ لڑکے نے پیسے دیے اور پھر وہ بے چارہ تیزی سے دوڑا۔ اس طرح کے اس نے ایک چاول کے پتیلے والے کوکرماری خوائے سے ٹکرایا۔ راستے میں آگے بڑے سے بکس کو پھلانگا اور ایک عورت کو دھکا مارا۔

اتنی پریشانیوں کے بعد وہ ہینڈل پکڑ کر ڈبے میں چڑھ ہی گیا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک دیہاتی نے اس کے پاس پہنچ کر ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ بغیر کسی وجہ کے پٹائی، وہ بھی گھبرا گیا۔ کچھ پوچھتا کہ دیہاتی نے خود ہی بتا دیا۔ ”تم نے ہماری مہر (بیوی) کے دھکا کا ہے دیو؟“ میں سمجھ گئی کہ چڑھتے وقت نو جوان جس عورت سے ٹکرایا تھا یہ اسی کا ٹھہم ہے۔

”بھائی جان! میں کوئی جان کے تو ٹکرایا نہیں تھا بس ٹکرا ہو گئی تھی۔“ نو جوان نے رسمی صورت بنا کر کہا۔

”اے بے بھولے راج! ہمارا سیکھا رہا ہے۔ ہماری مہر اور زیادہ کھو بصورت رسی اسی لیے تم اسے ٹکرا رہے ہو۔ اب ہم تم کا ٹکرا مار کر کھوس پادیں گے۔“ وہ دیہاتی پوری طرح لڑنے مارنے پر آمادہ تھا۔

”میں نے کہا نا وہ اتفاقہ ٹکرتھی۔ کہو تو معافی مانگ لیتے ہیں۔“ نو جوان بولا۔

”ایک سرت ہے تم ایہاں سے پکار کے بولو تری مہر اور ہماری بہن ہے تبھی ہم تم کو چھوڑیں گے۔“

”اچھا بھائی! تمہاری بیوی میری بہن ہے۔“ نو جوان نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔

کئی لوگوں نے مداخلت کی تھی تب جا کر دیہاتی جان بخشی پر آمادہ ہوا تھا۔ اس بے عزتی کے بعد نو جوان خاموش بیٹھ گیا۔ شاید اسے شرم آرہی ہوگی کہ وہ ایک دیہاتی سے پٹ گیا ہے۔

ابھی ریل نے پینڈی پار کیا تھا کہ ایک نئی آفت آگئی۔ ایسی آفت جس کا گمان بھی نہیں تھا۔

میں بڑے آرام سے بیٹھا تھا کہ ڈبے کے اگلے حصے سے ایک آواز آئی۔ ”تم نے کیا سمجھا تھا کہ ہم سے بچ کر بھاگ لوگی۔ سیدھے سیدھے اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤ ورنہ برا حشر کروں گی۔“

یہ آواز نور بیگم کی تھی۔ گویا وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔

”نہیں میں نہیں اتروں گی۔“ میں نے صاف انکار کیا۔

”اگر نہیں اترو گی تو ہم اتار لیں گے۔“ نور بیگم بولا۔

یہ جڑوں کو مجھ سے الجھتے دیکھ کر بڑے میاں جو اپنے ساتھ کی لڑکی کو میرے برابر بٹھا گئے تھے وہ بولے۔ ”تم لوگ کیوں اس لڑکی کے پیچھے پڑے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“

”ہے ہے میرے راجا! ہم ایسے سوکھے سوکھے چلے جائیں؟ ایسا کبھی نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ زیادہ بولو گے تو تم کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ تب تم خوب تانا تھیا کرنا۔“ حسن آرانے ہاتھ نچا کر کہا۔

یہ جڑے بے شرمی پر اتر آئیں تو ان سے پارلگنا آسان نہیں۔ وہ بھی ڈر کر خاموش ہو گئے۔

”سن او بڈھے۔ غور سے سن یہ لڑکی نہیں پہچن رہا ہے۔ ہماری برادری سے بھاگ کر آیا ہے۔“

اس کا اتنا کہنا تھا کہ ڈبے میں بیٹھے تمام لوگ مجھے بغور دیکھنے لگے۔ تب نور بیگم میری طرف مڑ کر بولا۔ ”چل اب اتر۔“

اب اترے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ میں بے نیل و مرام اگلے اسٹیشن پر اتر گیا اور دوسری ریل سے واپس آ گیا۔ گویا سارا منصوبہ دھرا رہ گیا۔

اتنی بھاگ دوڑ بھی اکارت گئی۔

گھر پہنچ کر نور نے کہا۔ ”آئندہ ایسی بے وقوفی مت کرنا۔“

میں نے جواب نہیں دیا۔ سوچ میں ڈوبی رہی۔

مجھے سوچ میں غم دیکھ کر نور بیگم نے کہا۔ ”میری جان سمجھنے کی کوشش کر۔ ہم تیرے دشمن نہیں ہیں، تو اکیلی نہیں ہے۔ خود کو اکیلی کیوں سمجھ رہی ہے؟ میں بھی تو تیرے ساتھ ہوں۔ دنیا والے ہمیں بے ضرر سمجھتے ہیں اس لیے ہم بے آسانی الجھی ہوئی دور کا سرا تلاش کر لیں گے۔“ پھر وہ آگے

بڑھا اور دُور محبت سے مجھے اپنے سینے سے بچھنچ کر بولا۔ ”اب آنسو نہ بہا۔ تو نہیں جانتی میں نے تیری خاطر کیا کچھ نہیں کیا ہے۔ تیرے لیے میں نے

پورے سماج سے ٹکری ہے۔ تجھے یاد ہے نا، تیری خاطر میرا حقہ پانی بند کیا گیا تھا مگر میں نے پروا نہ کی اور تجھے لے کر شہر شہر بھاگتی رہی۔ کبھی کلکتہ تو

کبھی بمبئی اور کبھی دہلی۔ صرف اس لیے کہ تجھے کوئی مجھ سے چھین نہ لے۔ میں تیری محبت میں پاگل ہوں، سمجھی.....! تجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہوں۔ تو نے جو

کچھ بتایا ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اسے تو اکیلے سلجھا ہی نہیں سکتی جبکہ میں ساتھ ہوں گی تو پورے شہر کی برادری ہمارے ساتھ ہوگی۔ آخر کو میں سردار

ہوں، پورے شہر کی گرد ہوں۔“

”ٹھیک ہے، اب تو ہی بتا، ہم اُن فرنگیوں کو کہاں ڈھونڈیں؟“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

”پہلے یہ بتا کہ تو نے اُن فرنگیوں کا حلیہ پوچھا ہے؟“

”اُکا بوانے بتایا ہے کہ وہ فرنگی ڈھانڈا باندھ کر آتے تھے۔ مگر ایک کا نام انہیں معلوم ہو گیا تھا۔ کسی نے کسی ایک کو ویکٹر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔“

”یہ تو بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنے والی بات ہوئی۔ خیر، پھر بھی میں تیرے ساتھ ہوں۔ چل، ہم بائگی پور کا چکر لگا آتے ہیں۔“

وہیں زیادہ فرنگی رہتے ہیں۔“ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ڈھول کو گلے میں لٹکایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب بڑھا۔

ہمیں باہر نکلتے دیکھ کر حسن آرا بولا۔ ”اے ہے بہن.....! ہمیں اکیلا چھوڑ کر کہاں چل دیں؟“

”مردار.....! دیکھ نہیں رہی ہے کہ میری شفا ادا ہے۔ اس کی دلجوئی کے لیے جا رہے ہیں۔“ نور بیگم نے میری طرف اشارہ کر کے

حسن آرا سے کہا۔

”اے لو، ہم کیا غیر ہیں، ہم بھی چلیں گے۔“ کہہ کر حسن آرا نے جھانجھ لیا اور ہمارے ساتھ ہولیا۔

ہم تینوں مرکزی سڑک پر آئے اور بائگی پور کی طرف چل دیے۔ سڑک پر پہنچ کر ہم نے غم غم لیا اور چار آئے کرانیہ طے کر کے اُس پر سوار

ہو گئے۔ اور بازار کی رونق پر نظریں جمادیں۔

اُس وقت ہم مراد پور سے گزر رہے تھے۔ خریداروں کا جھوم تھا۔ پھکڑوں پر سبزیاں لادی جا رہی تھیں یا پھکڑے خالی کیے جا رہے تھے۔ ایک جگہ کافی سارے لوگ جمع تھے۔ آگے کوئی رکاوٹ آگئی تھی اس لیے پھکڑے، ٹم ٹم اور تانگے رک گئے تھے۔ ہمارا ٹم ٹم بھی رکھا ہوا تھا۔ برابر سے گزرتے ہوئے ایک نوجوان نے بھیبتی کسی۔ ”اے ہے تمہنک جھنلو.....! کہاں کا ارادہ ہے؟“

”تیرے منہر جا رہے ہیں اچھوانی لانے۔“ حسن آرا بھی کب چپ رہنے والا تھا۔ اُس نے ہاتھ نچا کر جواب دے دیا۔
جواب اتنا ٹیکھا تھا کہ وہ بھی تمل گیا۔

راہ چلتے لوگ بھی مسکرانے لگے۔

یہ بھی ہماری زندگی کا حصہ تھا اس لیے ہم لوگ زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے مگر حسن آرا کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ تھا اس لیے فوراً بول پڑتا تھا۔ آج بھی جب اُس نے ایسا کرارا جواب دیا تو مجھے غصہ آ گیا مگر میں بولا کچھ نہیں، صرف اُسے گھور کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اتنے میں راستہ کھل گیا اور ٹم ٹم آگے بڑھتا چلا گیا۔ کئی اور جگہ بھی راہ چلتے منچلوں نے آوازے کسے مگر حسن آرا چپ رہا۔ ہم جواب دیتے ہیں تو دل لگی کے لیے ورنہ ایسے جملوں کے تو ہم عادی ہو چکے ہیں۔

”کہاں اترنا ہے؟“ حسن آرا خاموشی سے اکتا کر بولا۔

ہم بانگی پور آچکے تھے اس لیے میں نے ہی ٹم ٹم والے کو رکنے کا کہا۔ ”نیچے اتر کر اسے ایک اٹھنی دی جسے اُس نے چہرے پر ابھر آئی پسینے کی بوندوں کو دھوتی کے پٹو سے پونچھتے ہوئے لیا اور دھوتی کے ڈاب میں رکھ لیا۔ ہم تینوں آگے بڑھنے لگے۔ سامنے ہی ایک بنگلا تھا اُس کے گیٹ پر پہنچ کر نور بیگم نے ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ حسن آرا نے بھی گلا پھاڑنا ضروری سمجھا اور سر میں لاپنے لگا۔ ”اے لومبارک باد! ہم آئے ہیں دوارے تمہارے۔ اے لومبارک باد!“

ڈھول کی آواز سن کر تین چار انگریز بچے باہر نکل آئے۔ اُن کے پیچھے دو دیہی بھی تھے جو علیے سے نوکر لگ رہے تھے۔ وہ دونوں بچوں کو روکنا چاہتے تھے مگر بچے تیر کی طرح گیٹ کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک انگریز عورت بھی نکل آئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے نزدیک آئی۔ نوکروں نے ہمیں ڈانٹ کر بھگانا چاہا تھا کہ وہ فرنگی عورت بولی۔ ”نو، نو، ٹم جاؤ، آم ڈیکھنا اے۔“ پھر وہ بولی۔ ”ویل، ٹم کو کیا مانگنا؟“

”ہم مبارک باد دینے آئے ہیں۔ سنا ہے اس گھر میں بچہ ہوا ہے۔“

”یونانی مین.....! ٹم کو کس نے بولا؟ ادھر کسی کو بچہ نہیں ہوا۔“

”کل ہم کو راستے میں ویکٹر صاحب ملا تھا۔ وہی ویکٹر جو مظفر پور میں رہتا ہے اُس نے بولا۔“

”ادھر کوئی ویکٹر نہیں رہتا۔ ادھر جارج نوبل رہتا، مائی ہسپیڈ.....!“ وہ بولی پھر ایک چوٹی نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ کر بولی۔ ”یہ انعام اب ٹم جاؤ۔“

چار آنے بہت زیادہ تھے اُس لیے ہم خوش ہو گئے تھے مگر جس کام سے آئے تھے وہ ادھورا تھا اس لیے ہم آگے بڑھ گئے۔ اس گلی کے دیگر

بگلوں کو نظر انداز کر دیا اور دوسری گلی میں پہنچ کر ایک بنگلے کے گیٹ پر وہی ڈراما پھر سے شروع کر دیا۔ ”مبارک بادلو مبارک باد!“ کی آواز سے پورا بنگلا گونجنے لگا۔ کافی دیر بعد ایک انگریز بڈھا باہر آیا۔ پہلے تو اُس نے حیرت سے ہمارا جائزہ لیا، پھر انگش میں بڑبڑاتا ہوا ہمارے پاس آیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ”ٹم اڈھر چلا چلی کرنا۔ کس نے بولا اڈھر بچہ ہوا؟ اڈھر عورت نہیں رہتا۔ اڈھر سب مرد لوگ رہتا۔“

”ویکٹر صاحب بولا اڈھر بچہ ہوا ہے۔“ حسن آرا بولا۔

”کون ویکٹر؟ اڈھر کوئی ویکٹر نائیں رہتا۔ اڈھر مسٹر ہیری ڈیوس، مسٹر گرہن، مسٹر اوہنری رہتا۔“

”ویکٹر جو مظفر پور سے اڈھر آیا وہ بولا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ویکٹر اور ایلفر ڈ مظفر پور سے آیا مگر وہ اڈھر نہیں رہتا۔ وہ تو کونز روڈ میں رہتا۔ اڈھر مسٹر چینیل کے بنگلا میں اڈھر جاؤ اُس سے پوچھو۔“

”وہ والا ویکٹر نہیں، ناٹے قد کا ویکٹر.....!“ نور بیگم جلدی سے بولا۔

”تو پھر تم بھاگ جاؤ۔ گوڈویل.....!“ اُس نے غصے میں چیخ کر کہا اور مڑ گیا۔

”ایک ویکٹر کا پتا تو چلا اب اُسے کریدتے ہیں۔ شاید وہی ولیم ہو۔“ کہہ کر میں نے نور بیگم کی طرف دیکھا۔

”چلو.....!“ کہہ کر وہ مڑا تھا کہ ایک انگریز ہمارے قریب آ گیا۔ اُس نے اوپر سے نیچے تک ہمیں دیکھا، پھر کہا۔ ”ٹم لوگ ویکٹر کو تلاش

کرنا۔ آؤ ہم ملنا۔“

”ہم خود تلاش کر لیں گے۔“

”اڈھر چلو موٹر میں۔ کبھی موٹر میں بیٹھنا ہی نا..... ٹو چلو ہم ٹم کو سیر کرائے گا۔“

”ہاں ہاں چلو آج ہم بھی موٹر میں بیٹھنے کا مزہ لے لیں۔“ کہہ کر حسن آرا نے ہماری طرف دیکھا۔

موٹر گاڑی بڑے بڑے لوگوں کے تصرف کی سواری ہم جیسے غریب لوگ تو اُسے دور ہی سے دیکھ سکتے تھے۔ سنتے ہیں کہ دنی اور بمبئی میں ایسی بڑی بڑی موٹر میں بھی چلتی ہیں جن میں بہت سارے لوگ بیٹھتے ہیں۔ یہاں کوئی ایسی سواری ملتی نہیں ہے اس لیے میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ اس سواری میں بیٹھ کر دیکھیں۔ ہم تینوں اس موٹر میں سوار ہو گئے۔

اُس انگریز نے موٹر چلا دی۔ ہمیں بڑا مزہ آ رہا تھا کہ موٹر رک گئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ یہ علاقہ ہمارے لیے نیا نہیں تھا۔ ہم پٹنہ ہی کی حدود میں تھے۔ سامنے ہی مسجد تھی۔ وہ مشہور مسجد۔ اس مسجد کو مغل بادشاہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بنائی تھی۔ اس مسجد میں نمازی بھی خوب ہوتے تھے۔ لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ اس مسجد کے سامنے والی گلی کی طرف انگریز نے اشارہ کر کے کہا۔ ”اڈھر چلو.....!“

”خیریت؟ اڈھر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اڈھر وہ سب کچھ ہے جس کو ٹم تلاش کرنا۔ چلو.....!“

ایک انگریز کو ہم جیسے لوگوں کے ساتھ دیکھ کر لوگ تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

”اے بہن آگے بڑھو ہم بھی تو دیکھیں یہ مواسفید بندر کیا دکھائے گا؟“ حسن آرا نے شوخ لہجے میں کہا اور ہم اُدھر بڑھنے لگے۔

گلی کے تیسرے مکان پر پہنچ کر اُس نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا دیسی آدمی تھا۔ اُس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ شہد ہے۔ غنڈے موالی کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ یہاں اچھے لوگ نہیں رہتے۔ ویسے ہمیں کسی سے کیا خطرہ تھا اُس لیے ہم دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ وہ فرنگی ہمیں ساتھ لیے ہوئے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے میں دو انگریز بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے ہمارے ساتھ آئے انگریز سے پوچھا۔

”یہ جانور کہاں سے پکڑ لائے؟“

”یہ تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔“

”کیوں بے بیجڑے.....! مجھے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟“ اُس انگریز نے صاف اور سُستہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ بھی بتاؤں گی مگر پہلے یہ بتاؤ کہ نواب محسن الملک کی بیٹی مہناز بانو کو کہاں چھپایا ہے؟“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ نواب نے ہجڑوں کی فوج بنائی ہے۔ ہم نے تو سنا تھا وہ شہر بھر کے لڑاکا لوگوں کو جمع کر رہا تھا۔“ اُس نے مزاح کے انداز میں کہا۔

اُس کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ہم سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا ہے۔ یوں بھی ہجڑوں سے کون مرعوب ہوتا ہے۔ صدیوں قرونوں سے اس معصوم مخلوق کو سب روندتے آئے ہیں۔ مذاق کا نشانہ بناتے آئے ہیں۔ کھلونا سمجھتے آئے ہیں مگر اب حالات نے نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ میں خود ایک نئی تاریخ لکھنے والا تھا۔ زندان ہی نہیں داروغہ زنداں کو بھی اب ختم ہونا تھا اور اس انقلابِ اول کا سپہ سالار میں بن رہا تھا۔ مجھے عقل سے کام لینا تھا تا کہ اُس کا مغالطہ نہ رہے۔ میں نے اُس کے طنز کو نظر انداز کر کے کہا۔ ”نواب صاحب نے کیا کیا تھا اس سے ہمیں مطلب نہیں ہے۔ ہمیں مطلب ہے مہناز بانو سے۔ اُس کا پتا بتا دو۔“

”لو تم تو پریشان ہو گئے۔ فکر نہ کرو تمہیں بھی اُسی کے پاس پہنچا دیتے ہیں پھر آرام سے خود اُس سے اُس کی کیفیت و حالات پوچھ لینا۔“ کہہ کر اُس نے اپنے دوسرے ساتھی سے انگلیش میں کچھ کہا۔

اتنی دیر میں میں نے اچھی طرح سے اُس کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔ کمرے میں صرف یہی تین آدمی تھے اور تینوں کے تینوں اس اطمینان میں تھے کہ ہم تو بے ضرر لوگ ہیں۔ اس مغالطے کا فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے نور بیگم اور حسن آرا کی طرف دیکھا۔ ہماری ایک مخصوص زبان ہے ایسے بہت سارے الفاظ ہیں جن سے ہم اپنوں کے درمیان خفیہ بات کرتے ہیں۔ میں نے دوسرے والے فرنگی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”لےنا! باڈے کو اڑی دے۔ لمبے کوٹو، مونے کو میں تیرے کو وہ۔“

میرا اتنا کہنا تھا کہ نور بیگم لمبے والے سے اور ہمیں لانے والے سے حسن آرا دوڑ کر لپٹ گئی۔ مونے والے کو میں نے سنبھال لیا۔ شاید عام لوگوں کو پتا نہیں ہے کہ زخموں کے جسم میں بلا کی قوت ہوتی ہے۔ ہم تینوں جو تک کی طرح اُن تینوں سے لپٹ گئے تھے اور وہ تینوں بری طرح سے

بوکھلا اٹھے تھے۔

میں نے کمال پھرتی سے اُس کی کمر سے لٹکتے ننجر کو غلاف سے کھینچ کر نکال لیا تھا اور اُسے دور پھینک دیا تھا۔ یہ عجیب و غریب لڑائی تھی۔ بھلے ہی وہ لوگ بہت بڑے غنڈے ہوں، مگر انہوں نے ایسی لڑائی کبھی نہیں لڑی ہوگی۔ وہ جکڑ سے آزاد ہونے کے لیے پوری کوشش کر رہے تھے اور ہم تینوں کی زبان طوفانی رفتار سے چل رہی تھی۔ حسن آرا اپنے مقابل سے لپٹا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”اے ہے.....! میری موتی پُور کے لڈو.....! میں واری بلہاری.....! دے دے ایک چوٹا دے دے.....!“

نور بیگم نے مارنے کی بجائے دھڑا دھڑ چوٹا لینا شروع کر دیا تھا۔ بوکھلاہٹ میں وہ لوگ حملے کی بجائے خود کو چھڑانے میں لگے تھے۔ ”اے ہے جانی.....! میں قربان کیوں بھاگے ہے؟ لے مزہ لے نا!“ کہہ کر حسن آرا نے کچکا کرا اُس کے گال کو کاٹ لیا۔ حسن آرا کے مقابل نے غصے میں آ کر اُس کے سر پر اپنا سر مارنے کی کوشش کی تھی کہ وہ پھرتی سے بیٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا تصور کریں وہ فرنگی بس ایک پل میں اُس کے کندھوں پر آ گیا تھا اور حسن آرا اُسے اٹھائے اٹھائے کمرے کا چکر لگا رہی تھی۔ اُس کی عقل مندی دیکھ کر میں نے بھی وہی داؤ آزما یا اور اپنے مقابل کو کندھے پر اٹھا لیا اور باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ عقب میں قدموں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ وہ دونوں بھی میرے پیچھے ہیں۔ میں دوڑنے کے ساتھ ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ ”بے کی آئی برأت.....! دے دو مبارک! ہوئے کی آئی برأت مبارک باد!“ آگلن اور دروازے کو پار کر کے ہم سڑک پر پہنچ گئے۔

دن کا وقت خریداروں کا ہجوم اور اُس ہجوم میں ہم تین اور ہمارے کندھوں پہ تین فرنگی.....! قائد اعظم کی للکار گاندی کی سیٹہ گرہ اور خاکسار کا بیچلے اپنی جگہ ”انگریز بھگاؤ تحریک“ کو آگے بڑھا رہا تھا۔ ہر مسلمان و ہندو کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اب جو لوگوں نے تین انگریزوں کو اس حالت میں دیکھا کہ ہم تینوں کے کندھے پر تین انگریز اور ہماری ساڑھیوں کے آنچل زمین پر لوٹتے ہوئے اور تینوں کے بال اُن کی مٹھیوں میں۔

وہ تینوں اپنی زبان میں مغالطات کا طوفان اٹھا رہے تھے مگر ہمیں پروا نہ تھی کیونکہ گالی کا اصل مزہ تو اپنی مادری زبان میں ہے۔ وہ کیا بک رہا تھا، ہمیں خود خبر نہ تھی۔

بازار کے منچلوں نے بھی ہمارا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا کہ ایک جی دارنو جوان سبز بلالی پرچم اٹھائے آ گیا۔ اُس نے نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ ”اسی طرح ہم لال بندر کو لنگا میں پھینکیں گے۔ اپنا ملک آزاد کرائیں گے۔ پاکستان بن کے رہے گا۔“

مسلم لیگ کا جھنڈا دیکھ کر دو تین کھدر پوشوں کو بھی جوش آ گیا۔ وہ ”بندے ماترم“ کا نعرہ لگاتے ہوئے ہمارے ساتھ اچھلنے لگے۔ ہم پہلے کی طرح ”بے کی آئی برأت“ والا گانا گاتے رہے۔

پورے بازار کا ماحول یکھٹ بدل گیا تھا۔ پچاسوں افراد اس انوکھے ناچ میں شامل ہو گئے تھے۔ کچھ نے تو باضابطہ گلال وایبر (رنگین پاؤڈر جو ہندو ہولی کے موقع پر ہوا میں اڑاتے ہیں) اڑانے لگے تھے۔

تینوں فرنگیوں نے مزاحمت بند کر دی تھی۔ شاید یہ ڈر ہو کہ یہ مجمع بھگ گیا تو کیا ہوگا؟ مجھے اپنا کندھا ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا، پھر بھی میں اس ڈھائی من کے بورے کو اٹھائے ناچ رہا تھا۔ دوسرے لوگ اب تالیاں بھی بجانے لگے تھے۔

انگریز آقا تھے۔ انہی کی حکومت تھی۔ غلامی برقرار رکھنے میں کوشاں پولیس کیوں پیچھے رہتی؟ دور سے ڈنڈا سونے مغلظات بکتے پولیس والے بھاگتے آرہے تھے۔ دوسری طرف سے وہ غنڈا جس نے گھر کا دروازہ کھولا تھا، تین چار ساتھیوں کے ساتھ چاقو کھولے دوڑا آ رہا تھا کہ میں نے نور بیگم سے کہا۔ ”دھر پھٹک بھاگ.....!“

میرے ساتھ ساتھ ان دونوں نے بھی اُسے جھٹکے سے بچا اور بھیڑ میں بھاگنے کی کوشش کی مگر یہ آسان نہ تھا۔ اتنے لوگ جمع تھے کہ ان کے درمیان سے نکلنا آسان نہ تھا۔ اس پر اب مجمع مزید بے قابو ہو گیا تھا۔ ان تینوں کو ٹھڈے مارنے کی ”سعادت“ حاصل کرنے لگ گئی تھی۔ ہم کسی نہ کسی طرح اس بے قابو بھیڑ سے نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

باہر نکلتے ہی ہم نے دوڑ لگا دی۔ ہم اس تیزی سے بھاگ رہے تھے جیسے ہمارے پیچھے موت لگی ہو۔ وہاں سے نکل کر ہم مرکزی سڑک پر آ گئے تھے۔ ذرا آپ تصور کیجئے، ہمیں دوڑتے دیکھ لوگ کس طرح چوکتے ہوں گے۔ ایک عالم ہمیں دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہنس رہے تھے تو کچھ آوازیں کس رہے تھے۔ ہم بھاگتے بھاگتے ایک سنان رستے پر آ گئے تھے۔ ہماری سانس پھولنے لگی تھی۔ ہم رک کر سانس درست کر رہے تھے کہ سامنے والی گلی سے دو آدمی بھاگتے ہوئے نکلے۔ وہ کیوں بھاگ رہے ہیں؟ کہیں دنگا تو نہیں ہو گیا ہم ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ ایک اور نو جوان ان کا پیچھا کرتا ہوا آیا۔ اس کی رفتار ان دونوں سے کئی گنا تیز تھی۔ اتنی تیز کہ ہم بھی حیران رہ گئے۔ اس نو جوان نے بھاگتے بھاگتے ان دونوں میں سے ایک کو لنگڑی ماری۔ وہ اس کے پیر سے الجھ کر گرا۔ دوسرا آگے نکلا ہی تھا کہ نو جوان نے اسے بھی گرا دیا پھر ہم نے ایک نہایت عجیب منظر دیکھا۔ اس نو جوان نے پلٹ کر گرے ہوئے شخص کی گردن میں دانت گڑا دیئے۔ پھر نہایت تیزی سے اٹھ کر دوسرے شخص کی طرف لپکا۔ وہ اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ نو جوان نے اس کی گردن پر بھی اپنے دانت آزمائے۔

ہم سب حیرت زدہ سے کھڑے دیکھ رہے تھے کہ حسن آرا چلایا۔ ”اوہر دیکھو!“ ہماری نظریں اس سمت میں اٹھ گئیں۔ دونوں آدمی کے منہ سے سفید جھاگ نکل رہا تھا۔ ان کے بدن اینٹھ رہے تھے جیسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ مگر وہ نو جوان بے پروا سا کھڑا ان کی جیب سے نکالے ہوئے نوٹوں کے بنڈل کو دیکھ رہا تھا۔

ہم اس کے قریب پہنچے اور پوچھا۔ ”بھائی تم کیا ہو؟ ان دونوں کو کاٹا تو یہ مرنے لگے۔ کیا یہ مرجائیں گے؟“ ”ہمیں کیا پتا؟“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور بنڈل کو پیٹھ پر بندھے تھیلے میں ٹھونسنے لگا۔

”تم تو لگتا ہے کسی جنگل سے آئے ہو؟“ نور بیگم نے حیران لہجے میں کہا۔

”ہاں میں جنگل سے آیا ہوں، مگر تم نے کیسے جان لیا؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”آدمی کام کا ہے۔ اسے گھر لے چلو۔“ میں نے سرگوشی میں نور بیگم کو مشورہ دیا۔

”اے تم کتنی ہی آہستہ کیوں نہ بولو میں سب سن لیتا ہوں۔“ نو جوان نے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ تم نے اس نو جوان کو کتنا کیوں کیا تم وشل کنیا کی جاتی کے ہو؟“ نور بیگم نے پوچھا۔

”وشل کنیا کیا ہے مجھے نہیں پتا۔ ہاں میرے منہ میں زہر ضرور ہے۔“ اس نے ایسے کہا جیسے یہ عام سی بات ہے۔

”اے تم لوگ اگر یہاں کھڑے سوال جواب کرتے رہے تو کوئی نہ کوئی آجائے گا اور اگر یہ دونوں مر گئے تو ہم پر قتل کا الزام آجائے گا۔“

”حسن آرا بولا۔“

”بات معقول ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”یہاں کھڑے رہنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔“

”چلو ہمارے ساتھ چلو۔“ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر کہا۔

”تم لوگ دیکھنے میں عورت ہو مگر تمہارے بدن سے ویسی خوشبو کیوں نہیں آرہی ہے جو عورتوں کے بدن سے آتی ہے۔“ اس نے عجیب سا

سوال کیا۔

”کیوں کہ ہم عورت نہیں ہیں۔“ میں نے جواب دیا اور آگے قدم بڑھا دیا۔

”پھر تم لوگ کیا ہو۔ میرے جیسے بھی نہیں ہونا بابا جیسے ہو اور نہ عورت جیسے پھر تم لوگ کیا ہو جلدی بولو۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا۔

آدمی کام کا ہے۔ اس سے مجھے بہت مدد مل سکتی ہے یہی سوچ کر میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا مگر اس کے سوالات نے چکرا کر رکھ دیا

تھا کہ آخر یہ ہے کیا چیز۔

چلتے چلتے میں نے پوچھا۔ ”تم نے اس سے پہلے کس کس علاقے کو دیکھا ہے؟“

”اپنے جنگل سے نکلا تو یہاں آیا۔“

”جنگل میں کیا کرتے تھے۔ کس کے ساتھ رہتے تھے؟“

”بابا کے ساتھ۔“

”یہ بابا کون تھا؟ کیا تم اپنے ابا کو بابا کہتے ہو؟“

”نہیں بابا نے مجھے پالا ہے۔“

”کیا وہ کوئی آدمی واسی تھا؟“

”بابا بتایا کرتا تھا کہ وہ بہت بڑا سپیرا تھا۔ جب وہ تیس سال کا تھا تو اس کی بیوی مر گئی کوئی بچہ تھا نہیں اس لیے وہ شیش ناگ جو سو سال میں

آدمی کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس جنگل کو لوگ سانپوں کی وادی کہتے تھے اس نے وہیں ڈیرا جمالیا۔“

”کوئی شیش ناگ ملا؟“ نور بیگم نے سوال کیا۔

”نہیں مگر وہ وادی اسے بھاگئی اور وہ وہیں اس امید پر رہنے لگا کہ کبھی تو اس عجیب و غریب سانپ سے ملاقات ہوگی۔ وہ علاقہ سانپوں کی وجہ سے حد درجہ خطرناک سمجھا جاتا تھا اس لیے آدمی وادی (قبائلی) بھی وہاں آنے سے ڈرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا شکاری آ جاتا تھا۔ ورنہ تو برسوں کسی آدمی وادی کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بابا نے جب سانپوں کا کاروبار شروع کیا تو اتنے پیسے ملنے لگے کہ وہ کھانے پینے کا سامان بہ آسانی لے آتا تھا۔ وہ جنگل کے ابتدائی حصے میں واقع بھیڑاپور سانپوں سے بھری پٹاری اور جمع کردہ زہر لے کر جاتا وہاں کا کھیا اس کا دوست بن چکا تھا۔ وہ اس سے سانپ اور زہر خرید لیتا جسے سرکس والوں کے ہاتھ بیچ دیتا اور زہر دوا بنانے والوں کے ہاتھ۔ بابا مجھے اپنے ساتھ کبھی نہیں لے جاتا تھا۔۔۔۔۔“

”کیوں؟ وہ تمہیں کیوں نہیں لے جاتا تھا؟“ حسن آرانے پوچھا۔

”بابا بتایا کرتا تھا کہ ایک بار انگریز شکاریوں کی ایک ٹولی بھٹکتی ہوئی وہاں آگئی تھی۔ ان کے ساتھ ایک دیسی شخص اور اس کی بیوی بھی تھی۔ انگریز اور اس دیسی آدمی میں جھگڑا ہو گیا۔ انگریز نے اسے گولی مار دی۔ اس کی بیوی نے ان دونوں انگریزوں کو گولی مار دی اور بھٹکتی ہوئی بابا کی کنیا تک آگئی۔ اسے اس کی موت کھینچ کر اس وادی تک لائی تھی۔ بابا کی کنیا کے نزدیک پہنچتے ہی اسے ایک سانپ نے ڈس لیا۔ بابا نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی مگر موت کے آگے وہ ہار گیا، اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اس عورت نے بچے کو بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اس بچے کی حفاظت کیجئے گا۔ یہ ایک بہت بڑے نواب کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے باپ کا نام نواب افتخار الدولہ ہے۔ اس کے دشمن بہت ہیں۔ بابا نے بچے کو بچانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ بچہ میں ہوں۔ اسی لیے بابا مجھے آدمیوں کی بہتی میں لے کر نہیں جاتا تھا۔“

”پھر تم وہاں سے کیسے نکل آئے؟“ میں نے پوچھا۔

”پچھلے دنوں بابا بیماری سے مر گیا اور میں وہاں سے نکل آیا۔ وہاں سے نکل کر میں اسی کھیا کے پاس گیا تھا۔ وہ میرے بارے میں جانتا تھا کہ میں زہر سے بھرا ہوا ہوں۔ وہ جس سرکس والے کو سانپ دیا کرتا تھا اسی سے میرا سودا کر دیا۔ سرکس والے میری نمائش کرتے۔ کھیا یہ نہیں جانتا تھا کہ سانپوں کے درمیان رہتے رہتے میری سننے کی قوت قوی ہو گئی ہے۔ میں نے دوسرے کمرے میں ہونے والی باتوں کو سن لیا۔ سرکس والے کے جاتے ہی میں نے کھیا کی گردن میں دانت گزادیا اور اس کی کھلی ہوئی تجوری سے وہ تمام کاغذ جو سرکس والے نے دیا تھا اور خود اس کا جو تھا سب لے کر اس گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں بہت سے ڈبے سانپ کی طرح چلتے ہیں۔ اتنے کاغذ ملے تھے۔“ کہہ کر اس نے نوٹوں کی گڈیاں دکھائی۔

”اچھا تو تم ریل پر بیٹھ گئے؟“

”ہاں اس کا نام شاید ریل تھا۔ ایک آدمی نے راستے میں بتایا تھا۔ اسی پر سوار ہو کر میں اس علاقے میں پہنچا ہوں۔“

باتوں کے درمیان ہم اپنے محلے میں پہنچ گئے۔

”یہ ہے ہمارا امیر خانہ اب تم بھی یہیں رہو گے۔“ نور بانو نے کہا۔

”اچھا!“ اس نے دلچسپی سے کمرے کا معائنہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اب تم آرام کرو ہم بھی اپنی اپنی کمرسیدھی کر لیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسے کمرے میں چھوڑ کر ہم دوسرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے نور بیگم کو اس کے کمرے میں سونے کے لیے کہا مگر اس نے انکار کر دیا کہ اس کا کوئی بھروسہ نہیں اگر اس نے رات میں کاٹ لیا تو؟

”اسے لے تو آئیں ہیں مگر اس کا کریں گے کیا؟“ حسن آرانے سوال کیا۔
 ”اسے ہم دشمنوں پر چھوڑ دیا کریں گے۔ جس طرح شکاری شکار پر کتا چھوڑ دیتا ہے۔“ میں نے سرگوشی میں کہا کیوں کہ وہ بتا چکا تھا کہ وہ سرگوشی بھی دور سے سن لیتا ہے۔

”ہاں رے شنو تو نے بڑا اچھا سوچا ہے رے۔“ نور بیگم نے میری بلائیں لے کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
 ”ان باتوں کو چھوڑ یہ بتا کہ اب کرنا کیا ہے۔ اس ویکٹر کے بچے سے کیسے نمٹا جائے۔“ حسن آرانے کہا۔
 ”ویکٹر تک پہنچ ہی گئے ہیں۔ اسے پہچان بھی لیا ہے۔ گویا آدھا کام ہو گیا۔ اب موقع ملتے ہی اس پر چڑھائی کر دیں گے۔“ نور بیگم ہاتھ کر بولا۔

”ایسا کرتے ہیں آج ہی رات کے اندھیرے میں اس کے گھر کی تلاشی لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے مہنا ز بانو وہیں ہو۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”بس تو انتظار کر۔ ہم تو چلے سونے۔“ کہہ کر نور بیگم کھڑا ہو گیا۔ تبھی ہمیں ہلکے سے دھماکے کی آواز سنائی دی اور دوسرے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ ہم سب تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھے۔ اندھیرے میں ہمیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے باہر سے ہی پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“
 ”کچھ نہیں یہ چراغ پھونک سے بجھا نہیں تو میں نے اسے بجھانے کے لیے کٹورے سے اس پر پانی ڈالا تھا کہ یہ آواز کر گیا۔“ اندر سے اس نوجوان نے جواب دیا اور ہم سب ہنسنے لگے۔ نور بیگم بیڑی پیتا تھا۔ اس نے کمرے سے مچھلی نکالی اور جلا کر لائیں جلایا پھر بولا۔ ”بے وقوف یہ ایسے نہیں ایسے بجھتا ہے۔“ کہہ کر اس نے ہٹن کی طرف اشارہ کیا۔

پھر نیا بلب لا کر لگا دیا۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس وقت تک پنڈ میں ڈی سی کرنٹ سپلائی ہوتا تھا اگر اے سی کرنٹ ایجاد ہو چکا ہوتا تو کوئی بڑا حادثہ ہو چکا ہوتا۔ ہم واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔
 کمرے میں آ کر میں نے حسن آرا سے کہا۔ ”اس نے اپنا کوئی نام تو بتایا نہیں، ہم اسے کس نام سے پکاریں گے؟“
 ”اس کے باپ کا نام افتخار الدولہ تھا۔ اسے مختار کہیں گے مختار الدولہ۔“ حسن آرانے جواب دیا۔

”ہاں یہ نام اچھا ہے۔ اب مجھے سونے دو۔“ کہہ کر نور بیگم لیٹ گیا۔ اسے آرام کرنے کی بیماری تھی۔ ذرا سا موقع ملا نہیں کہ خرائے لینا شروع کر دیتا تھا۔ ہمیں بھی آج رات میں ویکٹر کی تلاش میں ڈھنڈھ تھا اس لیے آرام کر لینے کے خیال سے لیٹ گیا۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی ہم اپنے گھر سے نکل پڑے۔ اس وقت تک وہ نوجوان مختار سو رہا تھا۔ ہمارے گھر میں ایسی کوئی قیمتی چیز بھی نہیں تھی کہ اسے اکیلے چھوڑتے ہوئے فکر ہوتی۔ اگر بھاگ گیا تو بھی کوئی نقصان کی بات نہیں تھی اس لیے ہم نے اسے جگانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم سب نکل کر سڑک پر آئے۔ ویرانی نے ہر طرف ڈیرا بھار رکھا تھا۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ یا گھوڑے والے گزر جاتے تھے۔

ہم کسی سواری کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ دور سے آتا ایک تانگہ نظر آیا۔ میں نے اسے روک کر کرایہ طے کیا اور اس میں ہم سب بیٹھ گئے۔

تانگے والے نے ہمیں کوئٹہ روڈ پہنچا دیا۔ ہم تانگے سے اتر کر اس بڑے سے گیٹ پر پہنچے جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اس گھر میں ویکٹر رہتا تھا۔ اور ایک بار آ بھی چکے تھے۔ حسن آرانے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دیا۔ تو چھوٹا دروازہ کھل گیا۔ اندر سے ایک آدمی نے سر نکال کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”ہم ویکٹر صاحب سے ملنے آئے ہیں۔“ نور بیگم نے کہا۔ اس کی بات پر اس نے حیرت سے نور بیگم کو دیکھا اور دروازہ کھینچ کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ساتھ ایک انگریز بھی تھا۔

انگریز نے حیرت بھری نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ کس سے ملنا چاہتی ہو؟“ وہ صاف اور شستہ اردو بول رہا تھا اور چہرے پر خوف بھی نہیں تھا۔

”مجھے ویکٹر صاحب سے ملنا ہے۔“ نور بیگم بولا اور غیر محسوس انداز میں کھسک کر ملازم کے قریب پہنچ گیا۔ اب وہ اُس کے اتنے قریب تھا کہ کسی بھی لمحے وہ اُس پر وار کر سکتا تھا۔

ملازم اُسے لڑکی سمجھ رہا تھا اس لیے کچھ بے پروا سا نظر آ رہا تھا۔

”بولو کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہو؟“ انگریز نوجوان بھی دو قدم آگے بڑھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے بھی اُس کی طرف کھسکا شروع کر دیا تھا۔ تبھی حسن آرانے بجلی کی سی پھرتی دکھائی اور پوری قوت سے ملازم کے سر پر کھانچ بجا دیا۔ اب تک وہ اسے ناچ رنگ کی محفل میں بجاتا تھا پہلی بار کسی کے سر پر بجا دیا تھا۔ کھٹ کی آواز اور ملازم کی کراہ ایک ساتھ گونجی تھی۔ انگریز نے گردن موڑ کر ادھر دیکھا تھا۔ میرے لیے یہ موقع نادر تھا اور میں نے فائدہ اٹھالیا۔ ساڑھی سنبھالتے ہوئے ہوا میں اچھال بھری اور ایک بائیسکوپ (فلیم) میں جیسا دیکھا تھا اسی طرح دونوں پیروں کو جوڑ کر اُس کے سینے پر کھڑی لات ماری۔ انگریز نوجوان اچھل کر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اُس کے سر اور دیوار کے تصادم سے کھٹاک کی آواز بھری تھی۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا دوبارہ اچھال بھری تھی اور اس کے سر پر جا پہنچی تھی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے بدن میں بجلی سی دوڑ رہی ہو۔ میں نے لاتوں کو مشینی انداز میں چلانا شروع کر دیا۔ ہر وار پر وہ کراہ اٹھتا تھا۔ جی دار تھا اسی لیے اتنی لاتیں کھانے کے بعد بھی ہوش میں تھا۔ اگر اُسے ذرا سا موقع مل جاتا تو وہ مجھے پس کر رکھ دیتا۔ میں تو اُسے ایسے قابو میں کیے ہوئے تھا جیسے اندھے کے ہاتھ شیر لگا ہو۔ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ کے انداز میں میں لاتیں برسا رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار مار کٹائی کر رہا تھا اس لیے خوب مزہ آ رہا تھا۔ لائیں مارنے کا نتیجہ بھی جلد سامنے آ گیا۔ لہو لہان انگریز نو جوان ہوش کھو بیٹھا۔ اُس کا سر ڈھلک گیا۔

”اب ایسا کروان دونوں کو جھاڑیوں کے پیچھے ڈال آؤ۔“ حسن آ رہا ہوا۔

میں نے انگریز کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا اور اُسے گھسیٹتا ہوا برآمدے سے نیچے اترا۔ بجری پر موٹی لکیر سی بنتی ہوئی چلی۔ ابھی میں ڈم ڈم کی باڑھ کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ میری چھٹی جس نے اشارہ دیا اور میں بغیر سوچے سمجھے انگریز کو چھوڑ کر زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ لیپ پوسٹ کی ٹمنٹائی روشنی میں اُس چیز کو دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کتا تھا۔ گوکہ دیسی کتا تھا، مگر سدھایا ہوا تھا تبھی تو بغیر آواز نکالے مجھ پر چھٹا تھا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ اُس نے پھر چھلانگ لگائی اور سیدھے میرے سینے پر آ کر سوار ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اُس کی گردن میرے ہاتھوں میں آ گئی اور میں اُس کے جڑے کو خود سے اوپر اٹھاتے ہوئے گردن پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

اُس کے حلق سے غراہٹ نکل رہی تھی اور نیچے میری رانوں میں پیوست ہونا چاہتے تھے۔ اگر ساڑھی کی جگہ کوئی اور لباس ہوتا تو میں زخمی ہو جاتا۔ بس تھوڑی دیر تک یہ زور آزمائی چلی اور فتح میرا مقدر ٹھہرا۔ میں اُس کا گلادبانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کتے کے ٹھنڈا ہوتے ہی میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی، تبھی ایک غراتی ہوئی آواز آئی۔ ”خبردار اسی طرح لیٹے رہو۔“ ساتھ ہی ساتھ گراہی دار راہ پوری چاقو کی کڑکڑاہٹ گونجی تھی۔

میں نے لیٹے لیٹے آواز کی طرف دیکھا۔ وہ ایک قد آور جوان تھا، دیسی جوان جو چاقو کھولے آگے بڑھ رہا تھا۔ یقیناً یہ دوسرا نوکر تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش ترک کر دی اور لیٹے لیٹے اُس کے قریب آنے کا منتظر رہا۔ تبھی وہ آگے بڑھتے بڑھتے ہائے کانغرہ لگا کر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے سراٹھا کر دیکھا۔ نور بیگم اس کے پیچھے دبے قدموں آ گیا تھا۔ اُسی نے ڈنڈے کو اُس کے سر پر بجایا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم کیا یہاں آرام فرمانے تشریف لائی تھیں؟“

”جی نہیں، کتے سے گشتی لڑنے آئی تھی۔ وہ دیکھو وہاں تمہارا رشتے دار پڑا ہے۔“

نور بیگم نے برامانے بغیر کہا۔ ”اب اٹھ بھی جاؤ۔“

میں پھرتی سے جمپ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اتنی مار کٹائی کے بعد بار بار فتح ملنے کی وجہ سے میں خود کو رستم زماں سمجھنے لگا تھا اور ساڑھی کے آنچل سے گال پر جچی مٹی کو صاف کرتے کرتے بولا۔ ”فرنگی کا نوکر ایک ساتھی تو چیں پوں ہو گیا۔ اب بچا وہ خود ویکٹر۔ اُسے بھی ٹھکانے لگانا پڑے گا۔“

”یہ تمہارے میاں جی کا گھر نہیں ہے۔ دشمن کا اڈہ ہے، فوراً برآمدے میں آؤ۔“

میں اٹھ رہا تھا کہ ڈم ڈم کی باڑھ کے نیچے مجھے رسی کا لٹھا نظر آیا اور میں نے اُسے اٹھالیا۔ ناریل کی رسی کا لٹھا دیکھ کر نور بیگم بولا۔ ”کیا پھانسی چڑھنے کا ارادہ ہے؟“

”تمہارے سُسر جی کے ہاتھ پیر باندھنے ہیں ورنہ ہوش میں آتے ہی وہ ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔“

ری لے کر پہلے میں چوکیدار کے پاس پہنچا۔ اُس کے ہاتھ پیر باندھنے کے بعد انگریز نو جوان کوری میں کسا اور برآمدے میں آ گیا۔
برآمدے میں دوسرے نوکر کوری کے شکنجے میں لیا اور بازو کے پاس پڑے نوکر کے پاس آیا۔ اس کے بھی دونوں ہاتھ پشت پر باندھے
اور پیروں کو مضبوطی سے باندھ کر برآمدے میں دوبارہ آ گیا۔

”اندر چلنا ہے مگر ہوشیاری سے۔ ویکٹر کے پاس طے ہے۔ وہ گولی مار سکتا ہے۔“ حسن آرا نے کہا۔
”جا کر اچھے سانیاں مار سکے نہ کوئے چاہے جگ پیری ہوئے۔“ میں نے کبیر داس کا دوا پڑھا اور آگے بڑھ گیا۔
دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔ میں بے دھڑک اندر گھستا چلا گیا۔ اب ہم مسلح بھی تھے۔ نوکروں سے چھینے گئے دو چاقو میرے اور حسن آرا
کے ہاتھ میں تھے۔ نور بیگم نے ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔

ہم آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ ہال نما کمر بالکل خالی تھا۔ اُس کے بعد ایک دروازہ تھا۔ میں نے ہلکے سے دھکے سے اُسے کھولا
اور اندر داخل ہوا۔ وہ کمر ابھی خالی تھا۔ باہر والا کمر تو فرشی دری اور چاندنی سے مزین تھا مگر اُس کمرے میں کچھ بھی نہ تھا۔ پتنگ تک نہ تھا۔ میں نے
ہاتھ کے اشارے سے نور بیگم کو روکا اور اکیلے ہی آگے بڑھا۔ دراصل میری چھٹی حس کا اشارہ تھا کہ آگے خطرہ ہے۔ میں ہر طرف نظریں دوڑاتا ہوا
آگے بڑھ رہا تھا کہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ یکا یک ہی فرش نیچے کی طرف نہایت تیزی سے سفر کرنے لگا تھا۔

گرتے گرتے میری سماعت سے گولی کا دھماکا ٹکرایا اور حسن آرا کی چیخ۔ میں خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کر رہا تھا مگر سنبھلتے سنبھلتے فرش
خود رک گیا۔

میں نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا۔ وہ بھی ایک ہال نما کمر تھا۔ اُس کمرے کے آس پاس بھی کمرے تھے کیونکہ کئی بند دروازے نظر آئے
تھے۔ میں نے ایک دروازے پر زور آزمائی کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ دوسرا اور تیسرا دروازہ مقفل تھا۔ تبھی بند دروازے کے پیچھے قدموں کی آہٹ
گوئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھولنے والی ایک لڑکی تھی۔ وہ بھی دیسی تھی۔ میں نے جھنجھلا کر سوچا یہ میں کس عذاب میں گھر گیا۔
لڑکی نے بہت ادب سے پوچھا۔ ”میرے لائق کوئی خدمت؟“
”خدمت کی بچی.....!“ میں بھنا کر بولا۔ ”مجھے یہاں کیوں قید کیا گیا ہے؟“

”شاید صاحب جی آپ کے ساتھ چوسر کھیلنا چاہتے ہوں۔“ اُس نے جھک کر نہایت مہذب انداز میں کہا۔
”میں کیا جواری ہوں جو چوسر کھیلوں گا۔ اپنے صاحب جی کو بھیجو.....!“ میں نے حلق کے بل چیخ کر کہا۔
”صاحب جی اوپر ہیں۔ جیسے ہی وہ نیچے آئے انہیں اطلاع دے دی جائے گی۔“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے.....!“ لڑکی اُلٹے قدموں لوٹ گئی۔ جاتے ہوئے اُس نے پھر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔
مجھے الجھن ہو رہی تھی کہ پتا نہیں حسن آرا پر کیا گزری؟ اُس تک میں کیسے پہنچوں؟ کیسے یہاں سے نکلوں؟ تبھی دروازہ دوبارہ کھلا اور اُسی

لڑکی کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے پشتینی کنیز کے انداز میں خم ہو کر کہا۔ ”صاحب جی نیچے آچکے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔“

میں اُس کے ساتھ اُس کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ کئی آرام کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو کرسیاں جھولنے والی بھی تھیں جو اُس وقت کے شرفاء اپنے گھر میں ضرور رکھتے تھے۔ ایک کرسی پر وہی منحوس صورت ویکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”ویکٹر صاحب.....!“ میں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے مجھے کس لیے قید کیا ہے؟“

”میں نے تمہیں بلایا نہیں، تم خود آئی یا آئے۔ تم سے میری کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ صدف سے بات کرنے آیا تھا اور صدف غائب ہو گیا۔“

”کیا صدف کو میرے پاس سے برآمد کرو گے؟“

”میں نے کہا ناں تم سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ میں تم سے کوئی جھگڑا کرنا چاہتا ہوں۔“ کہہ کر وہ مڑا۔ ”جب تک وہ صدف نہیں ملتا، مہناز بانو کی طرح تم بھی میری قید میں رہو گی۔“

پھر تیزی سے چلتا ہوا وہ ایک دوسرے دروازے سے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے بول گیا تھا۔ ”یہاں سے نکلنے کا صرف ایک راستہ ہے وہ بیڑھی جو اوپر پہنچاتی ہے اور اُس طرف کا نہ صرف دروازہ باہر سے بند کر جاؤں گا بلکہ ایک خونخوار شخص چاقو سے مسلح وہاں بیٹھا بھی رہے گا۔ اب تم آرام کرو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔“

اُس کا کہنا غلط نہیں تھا۔ وہاں مجھے گھر جیسا آرام مل رہا تھا۔ وہ لڑکی دُم جھلنے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتی۔ میرے ایک حکم پر فوراً ہی مطلوبہ چیز لے آتی۔

وہاں قید ہوئے مجھے ڈیڑھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس دوران میں ایک بار بھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔ ضرورت کی تمام اشیاء یہیں موجود تھیں۔ میرے لیے کھانا بھی وہی لڑکی بناتی تھی۔ اُس کا نام ساوتری تھا۔ وہ یہاں آنے سے پہلے کسی طوائف خانے میں تھی اس لیے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ بہ آسانی کر سکتی تھی۔ کہتی تھی کہ میں ”میںا مردانی“ بننا چاہتی تھی۔ (اُس دور میں مینا نامی ایک لڑکی نے پہلوانی سیکھ کر مرد پہلوانوں کو چیلنج دینا شروع کر دیا تھا) لیکن مردانی بن نہ سکی۔ حالات نے زنانی بنا کر رکھ دیا۔ وہ کچھ بھی ہو مرد دلچسپ تھی۔ بڑی خوب صورت باتیں کیا کرتی تھی۔ میں نے اُس سے فرمائش کی کہ وہ مجھے چائے بنا کر پلائے۔ اُن دنوں اس انوکھے مشروب کی خوب اشتہار بازی ہو رہی تھی۔ برصغیر میں پلٹن صاحب نامی ایک انگریز بہادر مفت مشروب کی تقسیم کراتے تھے۔ دس بارہ سال پیشتر انہوں نے مفت مشروب پلایا تھا اور اب وہ اسے بازار میں بیچ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ مشروب مقبولیت کی معراج پر پہنچ گیا تھا۔

ساوتری چائے بنانے کے لیے اٹھ کر چلی گئی۔ میں بستر پر لیٹا اُس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ آج میں نے سوچا تھا کہ ساوتری کو بہلا پھسلا کر پوچھوں گا کہ مہناز بانو کو کہاں رکھا گیا ہے؟

میں سوچ کی وادی میں بھٹک رہا تھا۔ دور دور تک کوئی راہ کوئی منزل بھائی نہیں دے رہی تھی۔ اندھیرے کی چادر تھی اور ٹامک ٹونیاں

مارتے ہم تھے۔ کیسے اور کس طرح اس تک پہنچا جائے۔ مگر اس راہ کو تلاش کرنے کے لیے باہر نکلنا ضروری ہے اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی میں اسی گرداب فکر میں ڈوب اُبھر رہا تھا کہ ساوتری چائے لے کر آ گئی۔

تام چینی کنگ میں بھر کر وہ چائے لائی تھی۔ ابھی وہ میری طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ بند دروازہ کھٹاک سے کھلا اور ایک انگریز اندر داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں طمچہ تھا جس کی نال ساوتری کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اُسے یوں اندر آتے دیکھ کر ساوتری کا چہرہ اتر گیا۔ گھبراہٹ صاف نظر آ رہی تھی حالانکہ وہ خاصی نڈر لڑکی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں جھگ تھا وہ مرزتا ہوا نظر آیا۔

مجھے دیکھ کر اُس انگریز نے کہا۔ ”ینگ مین.....! کم آن.....! ہم ٹم کو لینے آیا ہمارے ساتھ چلو.....!“

”تم ہو کون اور میں کیوں تمہارے ساتھ جاؤں؟“ میں نے نڈر بن کر پوچھا۔ مجھے حیرت کا ایک جھٹکا بھی لگا تھا اس لیے کہ انگریز تو ویکٹر تھا۔ یہ بھی اسی نسل کا تھا گویا یہ میرا دشمن تھا پھر میری مدد پر کیوں آمادہ تھا؟

”نیں، ٹم، ہم کونائیں پہنچائیں؟ ام الفانسو ہے الفانسو تھا مسن ہے۔ ویکٹر کا دشمن نمبرون.....!“

”میں تم پر کیسے بھروسہ کر لوں؟“ میں نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”دیکھو ینگ مین.....!“ اُس نے انگریزی لب و لہجے میں کہا۔ ”اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس وقت تم خطروں میں گھرے ہوئے ہو اور یہ خطرہ میری وجہ سے ہے۔ میں صفر کا بھی خواہ ہوں اس لیے کہ رہا ہوں کہ پلیز میری بات مان لو اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو اور اس کوشش میں تمہارا مددگار میں ہوں۔“

میں نے کچھ دیر غور کیا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری ساڑھی اس دھینگا مُشتی کی وجہ سے مُسل مُسل گئی تھی اور بہت بری لگ رہی تھی۔ میں نے اسے دوبارہ پہنا اور آنچل درست کرتے ہوئے اُس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

ابھی اُس کمرے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ کسی جن کی طرح اُچھل کر ایک شخص ہمارے سامنے آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں یہ بسی سی چھری تھی۔ اُس نے چھری لہراتے ہوئے کہا۔ ”دھوکے سے وار کر دینا آسان ہے میرے جیتے جی اس عورت کو کوئی یہاں سے باہر نہیں لے جاسکتا۔“

”ابے عورت ہو گا تو تیرا باپ میں کیوں عورت ہونے لگا۔ میں تو یہ ہوں.....!“ میں نے تالی بجا کر ہاتھ کے اشارے سے اپنی صنف کا بتایا۔ میرے انداز پر وہ چاقو باز بھی مسکرا دیا مگر وہ غافل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کی نظریں الفانسو پر لگی ہوئی تھیں جیسے وہ منتظر ہو کہ الفانسو پہل کرے مگر الفانسو بھی کم چالاک نہ تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور اس طرح کا پوز بنائے ہوئے تھا کہ جیسے لڑائی بھڑائی کے فن کا ماہر ہو۔ وہ لڑاکا مرنے کی طرح بازو پھیلائے ہوئے آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ چاقو والے نے ہوا میں اُچھال بھری۔ ایسا لگا جیسے وہ واقعی اُس پر آپڑے گا۔ تبھی

ایک انوکھی بات نظر آئی۔ الفانسو نے بھی ہوا میں اُچھال بھری اور دونوں ایک ساتھ ہوا میں ٹکرائے پھر دھپ سے زمین پر گرے۔ اتنی سی دیر میں الفانسو نے کمال دکھا دیا تھا۔ اُس نے ہوا میں ٹکراتے وقت کمال پھرتی سے قلابازی کھا کر اُس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا تھا اور اب وہ چاقو اُس کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔

وہ جس تیزی سے زمین پر گرا تھا اسی تیزی سے کھڑا بھی ہو گیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اچھل کر دور جا کھڑا ہوا تھا۔

چاقو والا بھی کراہتا ہوا کھڑا ہوا مگر اس کے چہرے پر کرب کی ہلکی ہلکی جھلک تھی۔ شاید وہ اونچائی سے کوہے کے بل گرا تھا اسی لیے کوہا پکڑے کھڑا تھا۔

”آؤ بھائی، قریب آؤ، میرا شکار نہیں کرو گے؟“ الفانسو نے مذاق اڑانے والے انداز میں انگریزی لب و لہجے میں اس سے کہا اور پھر چاقو دکھا کر بولا۔ ”لڑا سے تو لے لؤ یہ بھی کام آئے گا۔ تمہارا ہی ہے لے لو۔“

”تیری تو..... میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ تو نے سمجھا کیا ہے۔“ اس نے کوہے پر داہنا ہاتھ رکھ کر تقریباً غراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر دیر کیسی۔ آؤ یہ رہا میرا گلا اور یہ رہا چاقو۔ پھیر دو میرے گلے پر چاقو پھیر دو۔“

”یہ لے.....!“ کہتا ہوا وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں تقریباً تیرتا ہوا الفانسو کی طرف بڑھا۔ میں نے لڑائی بھڑائی کبھی بھی نزدیک سے نہیں دیکھی۔ اگر دیکھی بھی تو بس دور دور سے یا پھر فلموں میں مگر زندگی نے جو یہ کروٹ بدلی تو سب کچھ نظروں کے سامنے ہونے لگا۔ خود بھی لڑائی بھڑائی میں شامل ہونے لگا مگر ایسی لڑائی ہوا میں اچھل اچھل کر لڑائی پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس چاقو والے کے ہوا میں اچھال بھرتے ہی الفانسو بھی اچھلا تھا اور دونوں ہی پہلی بار کی طرح اس بار بھی ہوا میں اسی طرح کمرائے تھے۔ فرق اگر تھا تو بس اتنا کہ اس بار دونوں کے سر کمرائے تھے۔ کھٹاکے کی آواز کافی اونچی تھی۔ سر ان کے کمرائے تھے اور چکر مجھے محسوس ہوا تھا۔ واقعی کمزور دل والوں کو لڑائی بھڑائی کی جگہ سے دور رہنا چاہیے مگر مجھے قسمت خواہو اور ان جھگڑوں کا حصہ بنانے پڑی ہوئی تھی۔

وہ دونوں پھر سے ڈھپ سے زمین پر گرے تھے اور اسی تیزی سے کھڑے بھی ہو گئے تھے۔ حملہ آور کھڑے ہوتے ہی کمر کو کمان بنا کر سر کو خم دے کر پوری قوت سے کسی بھرے ہوئے سائند کی طرح الفانسو کی طرف دوڑا تھا جیسے وہ ٹکرامار کر اسے پچکا دے گا۔

الفانسو کو اس کی نکر سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی مگر وہ اپنی جگہ سے ذرا سا ہل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے صرف کہنی اٹھا دی تھی حملہ آور دوڑتا ہوا آیا تھا اور ڈکراتا ہوا بیٹھتا چلا گیا تھا۔ الفانسو کی کہنی اس کے سینے سے ٹکرائی تھی۔ حملہ آور کی قوت خود اسی کے لیے وبال جان بن گئی تھی پھر یکا یک ہی الفانسو نے اُلٹی طرف چپ لگائی تھی اور حملہ آور سے کافی فاصلے پر آ گیا تھا۔ اس کا ہر انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس قسم کی لڑائی کا ماہر ہے تبھی تو وہ اب تک ڈٹا ہوا تھا۔ اس کا مقابل اب دیوار کے سہارے اکڑوں بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کی ناک سے ٹپ ٹپ خون کے قطرے گر رہے تھے۔ اس نے ناک پکڑ کر چھینکا۔ ڈھیر سا ر خون فرش پر پھیل گیا۔ وہ کراہتا ہوا اٹھا۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ وہ اب کمرے سے باہر نکل جائے گا مگر اس نے تو کھڑے ہوتے ہی لات گھما دی تھی۔ وہ داہنے پاؤں کے بل گھوما تھا اور خود کو گروڈش دیتا ہوا الفانسو کے نزدیک پہنچا تھا۔

اس کی گھومتی ہوئی لات الفانسو کی سینے سے ٹکرائی تھی اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ اس نے دوبارہ وہی داؤ آ زمانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ الفانسو نے اس مرتبہ بائیں طرف سے جھک کر اس کی ٹانگے کے پائے سے پکڑ لی تھی۔

حملہ آور آوندھے منہ زمین پر گرا تھا پھر اسے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ الفانسو کی بھرپور ٹھوک اس کے سر پر پڑی اور چند ہی لمحوں میں اس نے

ہاتھ پیرڈھیلے چھوڑ دیئے۔ الفانسو نے میری طرف مڑ کر کہا۔ ”آؤ باہر چلیں۔۔۔۔۔! لڑکی کو بھی ساتھ لے لو۔ اسے ہم بطور ڈھال استعمال کریں گے۔“ اوپر لاتے وقت اس نے مجھے بتایا کہ تمہارا ایک ساتھی اوپر ہے۔ میں یہ سنتے ہی اوپر کی جانب بھاگا تبھی کسی نے میرے شانے پر وار کیا۔ کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح وہ ڈنڈا میرے شانے پر پڑا تھا اور میں ہائے کہہ کر گرنا چلا گیا تھا۔ میں گرا تھا کہ ایک اور ڈنڈا میری پیٹھ پر پڑا۔ تبھی مجھے مارنے والے پر کوئی اچھل کر آگرا اور اس نے حملہ آور کو گویا گھونسوں پر رکھ لیا۔

میں کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تب میں نے اپنے مددگار کو دیکھا۔ وہ مختار تھا جو اچھل اچھل کر حملہ آور کی پٹائی کر رہا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر میں حملہ آور کو چیت کر دیا پھر اس کی گردن پر بس ایک بار دانت گڑایا پھر مجھ سے بولا۔ ”اوپر جا کر اپنے ساتھی کو دیکھو۔“ میں تیزی سے اوپر کی سمت بھاگا۔ اوپر والے کمرے میں کئی افراد بے ہوش پڑے تھے۔ ایک کونے میں حسن آرا بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں نور بیگم کا سر تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا۔

حسن آرا کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کا پرتو تھا۔ وہ اس طرح سے بیٹھا تھا جیسے کسی کا ماتم کر رہا ہو۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ میں نے نزدیک پہنچتے ہی حسن آرا کے کندھے کو پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ میرے جھنجھوڑنے پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھپک کر رو پڑا۔ ”اے بہن شنو اماں کو دیکھو کیا ہو گیا۔ آنکھیں ہی نہیں کھولتی۔“

میں نے نور بیگم کی ناک کے آگے انگلی رکھی۔ سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ میرے سینے میں اطمینان کی چادر تن گئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

نور بیگم کے سر پر وار پڑا تھا۔ سر پھٹ کر خون چہرے تک آ گیا تھا۔ میں نے حسن آرا سے کہا۔ ”بہن! سہارا دے کراٹھاؤ انہیں۔ جراح کے پاس لے جانا ہوگا۔“

الفانسو نزدیک آچکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”باہر میری موٹر کھڑی ہے۔ وہاں تک لے چلو۔“ پھر اس نے سہارے کے لیے نور بیگم کی کمر کے نیچے ہاتھ لگا دیا۔ اسے ڈنڈا ڈولی کر کے ہم باہر موٹر کار میں لائے۔ پیچھے ہم تینوں تھے اور آگے الفانسو کے ساتھ مختار جو اسی کی طرح انگریزی کپڑوں میں ملبوس تھا۔ یعنی پتلون اور بوشرٹ میں تھا۔ ”یہ بہت کام کا آدمی ہے۔ میرے بہت کام آئے گا۔ میں اسے اپنے ساتھ ولایت لے جاؤں گا۔“ الفانسو نے مختار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”مگر کافٹا بھی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”یہی اس کا فن ہے۔“ الفانسو کے منہ سے ٹوٹی پھوٹی اردو بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ حسن آرا اب تک غم سے ابھر نہیں پایا تھا۔ میں نے ماحول کے بھاری پن کو ہلکا کرنے کے لیے حسن آرا کو مخاطب کیا۔ ”تو تو ایسے سر جھکائے غم میں ڈوبی بیٹھی ہے جیسے تیری ڈولی اٹھنے والی ہے۔“

”مذاق نہ کر مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ تو ایسا کر کہ بس چپکی بیٹھی رہ۔“ حسن آرانے غم آلود لہجے میں کہا۔

”تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔“ الفانسو شکستہ اردو میں بولا۔

”تم بھی چپکے رہو۔“ اس نے ڈانٹ دیا۔

ہم انگریز جراح جسے ڈاکٹر کہا جاتا تھا وہاں پہنچے۔ وہ بھی انگریز تھا۔ اس نے الفانسو سے پتا نہیں کیا گٹ پٹ کیا پھر اس نے مرہم پٹی کر دی اور سوئی لگائی تو نور بیگم کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر نے دوا بنا دی۔ دوا لے کر ہم گھر آ گئے۔

”مجھے اجازت دو۔“ الفانسو نے کھڑے ہو کر کہا۔

”چائے پی لو۔“ میں نے دعوت دی۔

”جلدی پلا سکتے ہو تو پلا دو۔ انگریزوں کا یہ تحفہ اب کمزوری بنتا جا رہا ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”تم بھی تو انگریز ہو پھر ایسی بات کر رہے ہو۔“

”کس نے کہا کہ میں انگریز ہوں۔ میرے والدین اگر پرتگالی النسل نہ ہوتے تو میں بھی ہند کا کہلاتا۔ یوں بھی پرتگالی انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ حکومت پرتگال یہاں کے انقلابیوں کی مدد کر رہی ہے۔ ماضی میں بھی ہم نے ٹیپو سلطان کی بھرپور مدد کی تھی۔

ہماری حکومت نے ٹیپو کو لڑنے کے لیے اپنا فوجی بیڑا بھی دیا تھا۔ اگر ہندوستانی آپسی اختلاف کا شکار نہ ہوتے تو ہمارے فوجی ٹیپو کے ساتھ مل کر انگریزوں کو کب کا یہاں سے بھگا چکے ہوتے۔ اب بھی مجھے اسی لیے پٹنہ بھیجا گیا ہے کہ میں یہاں کے انقلابیوں کی مدد کروں۔“

”انقلابیوں کو ڈھونڈو گے کیسے؟“

”نواب صاحب بھی تو انقلابی تھے۔ اسی لیے تو ان کو انگریزوں نے قتل کرادیا۔“

”اصل قصہ کیا ہے؟“

”تم نے سر سلطان کا نام سنا ہے؟ اسی پٹنہ کے وہ رہنے والے تھے۔ برطانوی فوج میں عہدے دار تھے۔“

”نام سنا لگتا ہے۔“

”وہ فوج میں بہت مقبول تھے۔ وطن پرست تھے اس لیے جب بھارتی سہاش چندر بوس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو سر سلطان بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ سہاش چندر بوس نے ان کو اپنی آزاد ہند فوج میں شامل کر لیا۔ نواب صاحب سر سلطان کے دوست تھے۔

پٹنہ کا لجیٹ اسکول میں ہم جماعت بھی تھے اس لیے سر سلطان کے کہنے پر نواب صاحب نے یہاں بھی آزاد ہند فوج بنانے کے لیے خفیہ انداز میں کام شروع کر دیا۔ وہ جانبازوں کو جمع کر رہے تھے کہ بھرتی ہو گئی۔ بہت سے لوگ گرفتار ہو گئے۔ نواب صاحب بہت عمدہ انداز میں کام کر رہے تھے

اس لیے ان کے خلاف کوئی ثبوت ہاتھ نہیں آیا اور وہ مظفر پور سے یہاں آ گئے۔ یہاں آ کر وہ خاموش تھے مگر دشمن ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ قانون کے ذریعہ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے تو ان کو قتل کرادیا۔ انہیں اب بھی شک ہے کہ آزاد ہند فوج کے سپاہی پٹنہ میں ہیں اور اس کی خبر صدر کو ہے اسی لیے ان

لوگوں نے ایک غنڈے ویکٹر کے ذریعہ مہناز کو اغوا کر دیا تاکہ دباؤ ڈال کر صفدر سے اگلا سکیں۔ یہ تمام کام حکومت کر رہی ہے مگر خفیہ انداز میں تاکہ بات پھیل نہ سکے۔ ورنہ آزاد ہند فوج میں بھرتی ہونے کے لیے لوگ دوڑ پڑیں گے۔“ الفانسو نے پوری تقریر کر دی۔

”گویا آزادی کی لڑائی شروع ہو چکی ہے۔ گاندھی اور قائد اعظم کے پر امن طریقہ کے ساتھ خونی انقلاب کی بھی تیاری پوری ہے۔“

”یہ انگریز ایسے نہیں جائیں گے ان کو مار مار کر بھگنا پڑے گا۔ اسی لیے میں آیا ہوں۔ صفدر لوگوں کو جمع کر رہا ہے۔ اگر چاہو تو یہ کام تم بھی کر سکتے ہو۔ کیونکہ تم پر کسی کو شک نہیں ہوگا۔“

”لوگوں کو جمع کر کے کیا کیا جائے گا؟“

”ہم ان کو ٹرینگ دیں گے۔ جیسے ہی سبھاں چندر بوس کی فوج جاپانیوں کی مدد سے آگے بڑھے گی اسے روکنے کے لیے برطانوی فوج برما جائے گی ہم ان پر پیچھے سے حملہ کر دیں گے۔ کلکتہ اور پٹنہ میں دھماچو کڑی مچا دیں گے۔ جگہ جگہ دھماکے کریں گے۔ سرکاری افسران کو نشانہ بنائیں گے اس طرح برطانیہ کی حکومت گھبرا اٹھے گی۔“

”اس کے لیے تو بھاری اسلحہ چاہیے اتنا اسلحہ کہاں سے آئے گا؟“

”میں ہوں ناں۔ میں اسلحہ کے لیے جا رہا ہوں۔ تم لوگوں کے لیے بھی کچھ اسلحہ چاہیے کیوں کہ میں نے بتایا نا کہ ویکٹر ایک غنڈا ہے اور محکمہ خفیہ کے لیے کام کرتا ہے اب وہ پوری قوت سے حملہ کرے گا۔ وہ مہناز کو یہاں سے دور لے جانے کی کوشش میں ہے اس سے پہلے ہمیں کچھ کرنا ہے۔“

”میرے پاس طمنچہ ہے۔“ میں نے دکھایا۔

”یہ طمنچہ کسی کام کا نہیں دیکھی ہے نا میں جرمن اسلحے کا آرڈر دے کر آیا ہوں۔ رات میں پھر آؤں گا۔“

”مگر اصل بات تو رہ ہی گئی۔ مہناز بانو کا کیا ہوگا۔“

”اسے تو آزاد کرانا پہلی ترجیح ہے۔“ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نور بیگم کے برابر میں لیٹ گیا جب کہ حسن آرا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جاتے جاتے تاکید کر گیا تھا کہ اسے جاتے وقت ضرور اٹھا دیا جائے۔

میں گھڑی بھر کے آرام کی خاطر لیٹا تھا مگر نیند نے موقع پا کر دبوچ لیا اور میں بے خبر ہو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو شام کا سایہ گہرا ہو چکا تھا۔ میں نے جلدی سے بستر چھوڑ دیا اور منہ ہاتھ دھو کر چائے بنالی۔ نور بیگم ابھی تک سو رہا تھا۔ اسے بیدار کر کے چائے دی۔

ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ حسن آرا آ گیا۔ اس نے خوب شوخ رنگ کی ساڑھی پہنی تھی۔ چہرے پر من بھر پاؤں تھوپ کر آیا تھا۔

”کیا کسی مقابلہ حسن میں جانے کا ارادہ ہے۔ ہم مار کٹائی کرنے جا رہے ہیں سمجھے۔“ نور بیگم بولا۔

”مار کٹائی ہاتھ سے ہوتی اور ہاتھ خالی ہے۔ سرخی پاؤں تو شوقیہ لگایا ہے۔ جب میں لڑوں گی نا تو دیکھنا کیسا لڑتی ہوں۔ زندگی میں پہلی

بار لڑائی بھڑائی میں حصہ لیا ہے۔ اس لیے مزہ بھی بہت آ رہا ہے۔“ حسن آ رہا بولا۔

”لڑائی کو کھیل مت سمجھ کبھی کبھی جان بھی چلی جاتی ہے۔“ نور بیگم نے کہا۔

”جان جائے تو جائے اپنی بلا سے۔ مجھے کون سا عمر خضر چاہیے۔“

”بے کاری کی بحث سے کیا فائدہ۔ ابھی کچھ ہی دیر میں گورا صاحب آ جائے گا۔“ میں نے ان دونوں کی بحث میں دخل دیا۔

ہمیں صاحب کا انتظار تھا اور وہ آ کر نہیں دے رہا تھا۔ اس کے نہ آنے سے ہماری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆.....☆

وقت گزرتا جا رہا تھا اور الفانسو کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ نور بیگم تکیہ کے سہارے نیم دراز تھا اور ہماری بے چینی پر مسکرا رہا تھا۔ بالآخر اس

نے کمرے میں چھائے سکوت کو توڑا۔ ”کیوں ناحق پریشان ہو رہی ہو۔ میں زخمی ہوں اس لیے تمہارا ساتھ دے نہیں سکتی اور میرے بغیر تم کو کامیابی

ملنا مشکل ہے۔ یہ راز فرنگی صاحب کو معلوم ہو گیا ہوگا اسی لیے تو وہ فرنگی اکیلے اکیلے مہم پر نکل گیا۔“

”نہیں میرا دل نہیں مانتا وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں ساتھ لے جائے گا ضرور آئے گا۔“ میں نے بڑے

اطمینان سے جواب دیا۔

”اگر وہ اکیلے گیا تو میں اس کو کاٹ لوں گا۔“ مختار جو نہ جانے کب آ کر کھڑا ہو گیا تھا اس نے ہنس کر کہا۔

”اب تو آدمی ہے یا کانٹے کی مشین جو ہر ایک کو کانٹے کی دھمکی دیتا ہے۔“ نور بیگم بولا۔

”وہ گورا اتنے اچھے انداز میں اچھل اچھل کر لڑتا ہے۔ تو کیا میں اس سے کم ہوں؟ وہ گھونٹے سے جو کام نہیں کر سکتا میں دانت سے کر سکتا

ہوں۔ بولو تمہیں کاٹ لوں۔“

”تو جیتے جی مرے تیری گور میں کیڑے پڑیں مجھے کانٹے گا۔ ٹھہر تجھے بتاتی ہوں۔“ نور بیگم نے چپل اٹھالی۔

”لڑائی بھڑائی چھوڑو یہ دیکھو اتنی دیر تو ہو گئی اگر اسے آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔“ حسن آ رہا بھی نور بیگم کی ہم خیال بن گیا تھا۔ تبھی دور

گھنٹہ گھر کے گھڑیاں نے ٹن ٹن کر کے بارہ کے گھر بجائے۔ گویا رات کے بارہ ہو چکے تھے۔ میں بھی اب ناامید ہو چکا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی

اور میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کون؟“

”میں ہوں الفانسو! باہر سے آواز آئی۔“

”دروازہ کھلا ہوا ہے۔“ میں نے کہا اور طنزیہ انداز میں نور بیگم کی طرف دیکھا۔

اتنی دیر میں الفانسو اندر آچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑوں کے دو تھیلے تھے جو کافی وزنی نظر آ رہے تھے۔ اس نے تھیلوں کو بستر پر رکھ کر کہا۔

”کچھ ضروری چیزیں لینی تھیں اسی لیے دیر ہو گئی۔“ پھر اس نے تھیلوں میں سے سامان باہر نکالنا شروع کیا۔ انتہائی تیز دھار کے دودھاری

تین خنجر تھے۔ تین جرمن پستول، گولیوں کا ڈبہ، چمڑے کا چوڑا تسمہ۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ایسی چیزیں تھیں جنہیں میں پہچانتا نہیں تھا۔ ایک بڑا سا

ڈبہ بھی تھا جس پر ڈھکن لگا ہوا تھا۔

”میرے قریب آؤ۔“ اس نے مجھ سے کہا تو میں اس کے قریب آ گیا۔ اس نے ایک چاقو اٹھایا۔ پھر اسے میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔ ”اس کی دھار دیکھ لو۔ یہ فوجیوں کے استعمال کا چاقو ہے۔ اتنی تیز دھار ہے کہ بتا نہیں سکتا۔“ پھر اس نے چمڑے کا چھوٹا تسمہ اٹھایا اور بولا۔ ”اپنا داپٹا پیر پلنگ پر رکھو۔“

میں نے حکم کی تعمیل کر دی تو اس نے میری ساڑھی کچھ اوپر اٹھادی پھر پنڈلی پر چمڑے کا تسمہ باندھ کر اس میں خنجر رکھ کر بولا۔ ”یہ سب سے محفوظ جگہ ہے ضرورت پڑنے پر خنجر فوراً ہاتھ میں آ جاتا ہے۔“

میں نے پیر سیدھا کر کے دو تین بار خنجر نکالا پھر مسکرا کر بولا۔ ”ہاں یہ اچھی چیز ہے۔“

”اچھی نہیں خطرناک چیز ہے۔ نکالنے میں ذرا سا ہاتھ ترچھا ہوا تو یہ پنڈلی پر زخم ڈال دے گا۔“

پھر اس نے بڑا دالا تسمہ اٹھا کر دیا۔ ”اسے سینے پر باندھ لو۔ خنجر وغیرہ کے وار سے بہت حد تک بچاتا ہے اور یہ طمنچہ رکھ لو۔“

میں نے اور حسن آرا نے طمنچہ لے لیا پھر اس نے ڈبے سے بہت ساری لیسڈار چیز نکالی اور میری طرف بڑھا کر بولا۔ ”اسے جسم پر مل لو۔ اس کا فائدہ بعد میں پتا چلے گا۔“

میں نے چربی کی مالش پورے جسم پر کر لی۔ حسن آرا اور مختار نے بھی میری تقلید کی۔ خود الفانسو نے بھی وہ شے ہاتھ پیر پیٹ و سینہ اور

چہرے پر مل لی۔ اس میں عجیب سی بو تھی۔ بہت نہ صحیح مگر ناگوار لگ رہی تھی۔

ہر طرح سے تیار ہو کر اس نے کہا۔ ”اب چلو باہر جا کر میری موٹر میں بیٹھو۔“

میں حسن آرا کے ساتھ باہر نکل آیا، مختار بھی آ گیا تھا۔ موٹر میں بیٹھا ہی تھا کہ الفانسو آ گیا۔ اس نے اسٹیرنگ پر بیٹھ کر چابی گھمائی پھر بولا۔

”یہ گاڑی میں نے خصوصی طور پر جرمن سے منگوائی ہے۔ عام طور سے دیکھتے ہی ہوں گے کہ لوگ گاڑی کو ہینڈل مار کر اشارت کرتے ہیں۔“

مجھے یاد آ گیا کہ ان دنوں ہر قسم کی موٹر گاڑی کو اشارت کرنے کے لیے ایک لمبی سے سلاح کو بونٹ کی طرف سے کچھ نیچے بنے سوراخ میں

ڈال کر زور سے دہنی جانب جھٹکا دیتے تھے۔ دو تین بار جھٹکا دینے پر ہی موٹر گاڑی اشارت ہوتی تھی۔ لیکن الفانسو کی گاڑی چابی سے اشارت ہو گئی۔

کچھ دور جانے کے بعد وہ بولا۔ ”صبح ہم جس حویلی میں گئے تھے وہی حویلی اس کا مرکز ہے مگر وہ حویلی گورکھ دھندہ ہے۔ تہ خانوں کا جال ہے۔ پتا نہیں

کس را جانے اسے بنوایا ہے ایسا لگتا ہے جیسے بھول بھلیاں کو حویلی کا نام دے دیا گیا ہے۔“

”تو گویا ہم جہاں مقید تھے وہ تہ خانہ نہیں تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تہ خانہ تو تھا مگر ہم غلط طرف تھے۔ اصل عمارت دوسری طرف ہے اس بار ہم ادھر سے داخل ہوں گے۔ پھر اصل تہ خانہ میں اتریں

گے مگر یاد رہے ادھر خطرہ بہت ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی مر جائے پھر بھی رکنا نہیں ہے۔ ہر حال میں مہنا زکورد ہا کرنا ہے۔“

”تو کیا وہاں لڑاکا دستہ ہے؟“ حسن آرا بولا۔

”وہ ناقابل تسخیر قلعہ جیسا ہے۔ اس میں داخل ہونا جوئے شیر لانے کا ہے اگر کسی طرح داخل ہو گئے تو زندہ واپس آنا بھی کسی معجزے سے کم

نہیں ہے۔“

”ایسا کیا انتظام ہے کچھ معلوم ہے؟“

”بس یوں سمجھ لو باہر کی چہار دیواری سے اصل عمارت تک پہنچنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا پاگل ہاتھی کو باندھنا۔“

”کوئی سہل راستہ نہیں ہے کیا؟“

”مرکزی دروازے سے داخل ہوتے ہی بندوق برداروں کا پورا جھٹکا گھات میں بیٹھا ملے گا۔ پھر کئی خطرناک نسل کے کتے ہیں۔ ان

سب سے سخت کر بڑے میں پہنچو تو وہاں کا دروازہ بھی اتنا ہی مضبوط ہے اور دروازے کے پیچھے بھی کئی آدمی گھات لگائے بیٹھے ملتے ہیں۔ دراصل

ویکٹر نے اتنی تیاری کسی اور مقصد سے کی ہے۔ ان دنوں یہاں کے حالات بہت خراب ہیں۔ حکومت انگلیشیہ بھاگنے کی تیاری میں ہے۔ اس خطے کو

آزادی ملنے والی ہے۔ اس افراتفری کا وہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ مقامی لوگوں کو تیار کر رہا ہے جیسے ہی لندن سے آزادی کا اعلان ہوگا۔ ویکٹر کے

خبردار ہوئے آدمی اس پورے علاقے کو قبضے میں لے کر اپنی حکومت کا اعلان کر دیں گے۔ مقامی حکومت نو مولود ہوگی اس لیے مقابلہ کر نہیں پائے

گی اس عرصے میں پہلے تو وہ حکومت کے خزانوں کو لوٹے گا پھر حکومت سے ڈیل کر کے علاقہ خالی کر دے گا۔ اس طرح وہ ایک تیرے کئی شکار کھیلنا

چاہتا ہے۔ لوٹ مار کرنے میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ وہ لندن کا مشہور غنڈا ہے۔ خود کو حکومت انگلیشیہ اور دوسرے غنڈوں سے بچانے کے لیے ہی وہ

لندن سے بھاگ کر یہاں آیا ہے۔ یہاں آتے ہی اس نے مقامی حکومت سے نوکری کی استدعا کی۔ انگریزوں کو فوراً نوکری دی جاتی ہے اس لیے

اسے بطور مددگار محکمہ خفیہ میں رکھ لیا گیا مگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہا جرائم میں ہنوز ملوث ہے۔“

”یہ جو یکا یک پٹنہ اور اس کے اطراف میں ڈکیتیاں پڑنے لگی ہیں جس کا چرچہ ہرزبان پر ہے کہیں یہ بھی تو اسی کی کارستانی تو نہیں ہے؟“

میں نے پوچھا۔

”بالکل صحیح سمجھا۔ مظفر پور سے پٹنہ تک جتنے بھی بڑے ڈاکے پڑے ہیں راجا اندر جیت کی حویلی، کاشی ناتھ گودر ناتھ کا محل، نواب محسن کی

حویلی اسی نے تو لوٹی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ بہت بڑا گروہ بنا لیا ہے اسی لیے تو اس دن میں نے نکرانے کی بجائے فرار کی راہ پسند کی تھی۔ اگر وہ

نواب صفدر جنگ پر ہاتھ نہ ڈالتا تو میں کبھی اس سے نکرانے کی نہیں سوچتا۔“ الفانسو نے کہا۔

باتوں کے درمیان راستہ ملے ہو چکا تھا اور ہم مہندر دہنچ چکے تھے۔ وہ علاقہ خاصہ ویران تھا۔ یوں بھی رات گئے گنگا کے کنارے کون آتا

ہے۔ کشتی گھات بھی دوسری طرف تھا اسی لیے میں نے پوچھا۔ ”یہاں تو کوئی حویلی نظر نہیں آ رہی ہے؟“

”یہاں سے سیدھے حویلی جائیں گے۔ اس ویرانے میں آنے کا ایک خاص مقصد ہے۔“

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے طمنچہ تو دیکھ لیا مگر اسے استعمال کیسے کرو گی یہ پتا ہے؟“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ پھر وہ گاڑی کی بتی جلا کر مجھے اس کے بارے میں سمجھانے

لگا۔ اس کے ایک ایک پرزے کے بارے میں بتانے لگا۔ جب میں بہت حد تک اسے چلانے کا طریقہ سمجھ گیا تو وہ بولا ”اب اس سے گولی چلاؤ۔“
”ابھی لو۔“ کہہ کر میں نے ٹمچہ پکڑا تھا کہ وہ بولا:

”ایسے نہیں ایسے۔“ پھر اس نے کہا ”پستول کو ایسے پکڑا جاتا ہے اور نال کے اوپر یہ جوا بھری ہوئی جگہ ہے اسے سیدھا حائی میں رکھ کر نشانہ لیتے ہیں۔ پھر ٹیگر دباتے ہیں۔“

میں نے نشانہ لینے کے لیے ٹمچہ سیدھا کیا تو الفانسو بولا۔ ”وہ سامنے جو بیڑ ہے اس کے تنے کا نشانہ لو۔“
میں نے ایک فائر کیا۔ گولی زن سے نکلی اور سیدھے جا کر تنے میں دھنس گئی۔

”واہ۔ تم بہت جلدی نشانہ لگانا سیکھ جاؤ گے۔“ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”فائر کی آواز بہت دور تک سنائی دی ہوگی اس لیے اب یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔“

اس نے موٹر اسٹارٹ کیا اور واپس کدم کنواں کی جانب چل پڑا۔ کچھ دیر بعد ویکٹر کی حویلی ہمارے سامنے تھی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے الفانسو سے پوچھا۔ ”کدھر سے داخل ہونا ہے۔“

”عقبی طرف ایک بہت بڑا گندانا ہے۔ اس نالے سے ایک سرنگ ہے جس کا مجھے آج صبح ہی پتا چلا ہے۔ اسی سرنگ سے ہم داخل ہوں گے۔“ کہہ کر وہ موٹر گاڑی کو حویلی کے عقب میں لے گیا۔ ادھر ہر طرف درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیاں بھی اتنی بڑی بڑی تھیں کہ اس میں چھپنے والا کسی کو نظر ہی نہیں آتا۔ الفانسو اپنی موٹر گاڑی کو انہی جھاڑیوں میں لیتا چلا گیا۔ ہم نے بڑی مشکل سے موٹر گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکلے پھر الفانسو کی سربراہی میں چلنے لگے۔

کچھ دور چلنے کے بعد ہمیں وہ نالہ مل گیا جس کا ذکر الفانسو نے کیا تھا۔ وہ نالہ بالکل خشک تھا۔ شاید برساتی پانی کی نکاسی کے لیے وہ نالہ بنایا گیا تھا۔ اس نالے کے آخری سرے پر سلاخوں کا دروازہ نظر آیا۔ ہر طرف سناٹا تھا صرف جھینگروں کی جھانکیں یا پھر رہ رہ کر دور سے کتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اتنی رات میں کسی آدم زاد کا نظر آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ستاروں کی ٹٹماتی روشنی میں سب کچھ ہیولہ سا لگ رہا تھا پھر بھی ہم ہوشیار تھے کہ کہیں کوئی آنہ جائے۔

الفانسو نے سلاخوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر دیوار میں کچھ ٹٹولا پھر ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ دروازہ چرچاہٹ کی آواز سے کھل گیا۔ ہم تینوں اس میں داخل ہو گئے۔

اندھیرے میں ہمیں حیرت کا جھٹکا لگا۔ کافی دور تک اس سرنگ میں مشعل جل رہی تھی۔ ہم اسی طرف بڑھتے چلے گئے۔ کافی آگے جانے کے بعد سرنگ مڑ گئی تھی۔ ہم بھی مڑے سب سے آگے میں تھا اس لیے جھٹکے سے رکنے والا پہلا شخص بھی میں ہی تھا۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ میرے سامنے ایک نہیں دو چیتے کھڑے تھے۔ سرنگ میں چیتے؟ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ مگر اس پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا کیونکہ ان کی اہمیت ہی لرزادینے کو کافی تھی۔ ان کو سامنے دیکھ کر تو اچھے اچھوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ پھر میں تو ایسے بھی لڑائی بھڑائی کا آدمی نہ تھا۔ ناچ رنگ ہی میری زندگی

تھی اس لیے بھی چیتے کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

وہ دونوں مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ حملہ کے لیے پرتول رہے ہوں۔ تبھی الفانسو نے پیچھے سے دھکا دیا۔ ”آگے بڑھو۔“

مگر میں کیسے آگے بڑھتا۔ میرے تو پیروں میں بھی جان نہ تھی۔ میں دھکے سے لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ حیرت کی بات یہ نظر آئی کہ میرے آگے بڑھتے ہی دونوں چیتے پیچھے ہٹ گئے۔ انہیں پیچھے ہٹتے دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں مزید ایک قدم آگے بڑھا میرے آگے بڑھتے ہی دونوں چیتے مزید پیچھے ہٹ گئے۔

ایسا تو میں نے کبھی سنا بھی نہیں تھا کہ چیتے انسان سے ڈر کر پیچھے ہٹتے ہیں مگر ایسا ہو رہا تھا۔ میں جتنا آگے بڑھتا وہ اتنا ہی پیچھے ہٹ جاتے۔ یہ ایک ناقابل یقین منظر تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ آج تک میں نے یہی دیکھا تھا کہ کتے جب خوفزدہ ہوتے ہیں تو اپنی دم کو گرا لیتے ہیں۔ دونوں چیتوں نے بھی یہی کیا تھا۔ گویا وہ دونوں خوفزدہ تھے اور رہ رہ کر منہ اٹھاتے اور فضا میں کچھ سوگھنے لگتے۔ تبھی مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری پنڈلی میں سوئی چھبی ہو۔ میں نے نادانستگی میں ساڑھی کچھ اوپر اٹھا کر ایک نظر ڈالی۔ پنڈلی پر ایک چوئی جی ہوئی تھی۔ میں نے انگلی سے اسے گرا دیا۔ ہاتھ جھاڑنے سے میرا ہاتھ چاقو کے تسمے سے ٹکرایا اور میں نے خنجر کھینچ لیا۔ دونوں چیتے جانے کس چیز سے خوفزدہ تھے۔ ایک لمحے کو خیال آیا کہ اس سرنگ میں شیر بھی ہے کیونکہ شیر ہی سے چیتے ڈرتے ہیں۔ میں ان دونوں پر نظریں جمائے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

دونوں چیتے اب مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ میری ساری توجہ انہی پر تھی کہ وہ کسی بھی وقت زقند لگا کر مجھے دبوچ سکتے تھے۔ مگر وہ تو اپنی جگہ پر یوں خاموش کھڑے تھے جیسے ان پر جادو کر دیا گیا ہو۔

”حملہ کرو۔ یہ اس وقت خوفزدہ ہیں۔ تمہارے لیے یہ نادر موقع ہے۔“ الفانسو بولا۔

”اور اگر اس نے میرا نیٹو پکڑ لیا تو؟“ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”یہ اس وقت کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ تم بے خطر ہو کر حملہ کر دو۔“

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے یہ تمہارا خالہ زاد ہے۔ چیتا چیتا ہوتا ہے۔ اس کا اور میرا بھلا مقابلہ۔“

”حوصلہ تو کرو۔“ کہہ کر اس نے مجھے دھکا دیا اور میں سیدھا جا کر چیتے پر جا پڑا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے گھبراہٹ میں چیتے پر خنجر چلا دیا۔

میری کوشش تھی کہ ایک ہی وار میں ان میں سے ایک کا کام تمام کر دوں۔

اس وقت میری حیرت دو چند ہو گئی جب وہ حملہ کرنے کی بجائے بکری کی طرح خوفزدگی کے عالم میں پلٹ کر بھاگنے لگا۔ تبھی میں نے اچھل کر دوسرا وار کیا۔ میرا خنجر دستے تک اس کی کمر میں پیوست ہو گیا۔ میں نے پھرتی سے خنجر کھینچا اور اتنی ہی طاقت سے دوسرا پھر تیسرا وار کیا۔ چیتا تڑپنے لگا تھا جب کہ دوسرا چیتا خوف کے عالم میں دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا پھر اس کے پیٹ پر وار کیا۔ پہلا ہی وار کاری ثابت ہوا اور اس کی آنتیں باہر نکل آئیں۔ میں جو کچھ بتا رہا ہوں یہ عقل سے پرے کی بات ہے مگر سچ ہے۔

ہر طرف خون ہی خون پھیل گیا تھا۔ مجھے یقین کامل تھا کہ اب وہ کسی طور بھی اٹھ نہ سکے گا۔ میں نے اطمینان کرنے کے بعد گہری گہری سانسیں لیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے صرف ایک معمولی خنجر سے دو چیتوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔

اب مجھے الفانسو اور حسن آرا کی فکر ہوئی اور میں نے پیچھے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ مڑتے ہی سامنے مجھے وہ دونوں نظر آ گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میرے پیر کسی پھندے پر نہیں پڑے تھے جب کہ وہ دونوں جی ہاں ان دونوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تبھی تو انہیں وہ پھندا نظر نہیں آیا تھا اور دونوں کے پیر سی کے پھندے میں پھنس گئے تھے۔ اس وقت دونوں کے دونوں اٹے لٹکے ہوئے تھے۔ یعنی پیر اوپر اور سر نیچے تھا۔ میں نے ایک کے بعد ایک دونوں کو نیچے اتارا۔ الفانسو نے کہا۔ ”مجھے پتا لگ گیا تھا کہ سرنگ میں چیتے ہیں اسی لیے میں نے سب کو ہر شیر کی چربی لگوا دی۔ یہ ترکیب افریقہ کے جنگلوں میں آزمائی جاتی ہے۔ اسی لیے تو چیتے ڈر گئے تھے۔ انہیں شیر کی بو محسوس ہو گئی ہوگی۔“

”مختار کہاں ہے؟“ اب مجھے اس کی فکر ہونے لگی تھی کہ وہ کہاں غائب ہو گیا۔ پیچھے کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے کہا ”ہاں“ جب پھندے میں پھنسے تھے تو تم نے مجھے آواز کیوں نہیں دی؟“

”یہ سرنگ ہے۔ آواز دیتا تو آخری سرے تک آواز جاتی۔ اب بھی یہی کہنا ہے کہ چپ ہو جاؤ اور آگے بڑھو۔“ الفانسو بولا۔

ہم سب پھر چلنے لگے۔ کچھ دور جاتے ہی وہ نظر آ گیا۔ وہ بھی پھندے میں پھنسا لٹک رہا تھا۔ پتا نہیں کتنے اور ایسے پھندے تھے جن پر پیر پڑتے ہی پھندا تن جاتا تھا اور بندہ لٹک جاتا تھا۔ یقیناً اسے اس طرح لگایا گیا تھا کہ چیتے اس میں نہیں پھنستے تھے۔

دونوں چیتوں کی لاشیں پھلانگ کر ہم مختار کے ساتھ دوبارہ آگے ہی آگے بڑھنے لگے۔

مجھے خطرہ تھا کہ کسی بھی طرف سے کوئی محافظ آ سکتا ہے۔ مگر اب تک کوئی نہیں ملا تھا۔ شاید حویلی والے چیتوں کی وجہ سے کافی حد تک مطمئن ہوں گے۔ ان کا اطمینان غلط نہیں ہوگا کیونکہ سرنگ کا دہانہ تو بند رہتا تھا۔ اگر کوئی کسی طرح اندر داخل بھی ہو گیا تو وہ ان خوفناک چیتوں کا شکار بن جاتا اسی وجہ سے شاید ہی کوئی ادھر آنے کی جرأت کرتا ہوگا۔

چلتے چلتے بالآخر ہم اس جگہ پہنچ ہی گئے جہاں لوہے کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ہم اس سیڑھی کے ذریعے اوپر آئے۔

اوپر کا کمرابھی خالی تھا۔ ہم دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک خانسا منٹاپ آدمی اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ہم تینوں الارٹ ہو گئے۔ جب کہ اس کی حالت عجیب تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔ میں نے کبھی دنگا فساد میں حصہ نہیں لیا تھا۔ مگر اب زندگی کا یہ رخ بڑا مزہ دینے لگا تھا۔ میں خود کو سورا بکھنے لگا تھا۔ اسی لیے تو میں نے چیخ کر کہا تھا۔ ”چلو ہاتھ اٹھاؤ سامنے والی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“

”اے تم نے سنا نہیں؟“ مختار نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”ورنہ میں کاٹ لوں گا۔“

اس کی اس بات پر وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

اس کے چہرے پر پشیمانی حیرت بتا رہی تھی کہ وہ کائے کا مطلب نہیں سمجھ سکا ہے۔ پھر وہ بہت زیادہ سہا ہوا بھی تھا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ دشمن اتنے کڑے پہرے میں بھی اندر گھس آئیں گے۔

الفانسو نے اس کی حیرت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی پھر اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ جھٹکا لگتے ہی ایک چٹ کی آواز سنائی دی اور نووارد کی گردن جھول گئی۔

اس سے نمٹ کر ہم آگے بڑھے۔ وہ ایک گلیا راتھا۔ ہم اس میں داخل ہو گئے۔ وہاں نہایت مدھم مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے سوچ بورڈ نظر آ گیا۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر وہ بلب بھی آف کر دیا۔ اب ہم دبے پاؤں آگے ایک کمرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ الفانسو نے کہا۔ ”شاید یہی وہ کمرہ ہے جس میں نواب کی بہن کو رکھا گیا ہے۔“ تبھی ہمیں کھلکھلاہٹ کی آواز سنائی دی اور ہم قہقہہ مچ گئے۔

یہ آواز نسوانی تھی۔ ہم اس آواز کے تعاقب میں دبے پاؤں آگے بڑھے۔ کچھ دور جاتے ہی وہ کمرہ سمجھ میں آ گیا جس سے نسوانی کھلکھلاہٹ باہر آرہی تھی۔ اس کمرے کی کھڑی کھلی ہوئی تھی مگر اندر اندھیرا تھا۔ ایسا گہرا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھجائی نہ دے۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں جنہیں توڑنا اتنا آسان نہیں تھا۔

”دروازہ کیسے کھلوا یا جائے؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

”میں دروازے کو کاٹ لیتا ہوں۔“ مختار نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”تم کچھ دیر چپ نہیں رہ سکتے۔“ میں نے سرگوشی میں اسے ڈانٹا۔

”وہی پرانا طریقہ آزمائو جس طرح دروازہ کھلوا یا جاتا ہے۔“ الفانسو نے دھیمی آواز میں کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر دستک دی اور کھانتے ہوئے کہا۔ ”میں ہوں دروازہ کھولو۔“

”کیا بات ہے مراری؟“ اندر سے مردانہ آواز سنائی دی۔

میں نے کھانتے کھانتے کہا۔ ”دروازہ تو کھولو؟“

میں ایسا پوز کر رہا تھا جیسے میری طبیعت خراب ہو گئی ہو۔

”کیا مصیبت ہے۔“ اندر سے جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی قدموں کی آہٹ ابھری۔ کوئی بڑا بڑا ہوا دروازے کی طرف آرہا تھا۔ ”ہزار دفعہ کہا اتنی بیڑی مت پٹی بی ہو کر مرے گا۔ سارا دن ساری رات کھانتا ہے۔ پھر بھی چین نہیں ہے۔ بیڑی پیئے جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا۔

حسن آرا اور الفانسو دروازے کے دائیں بائیں چپکے کھڑے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی میں کھانتے کھانتے دوہرا ہو گیا تاکہ باہر آنے والا فوراً میری شکل نہ دیکھ لے۔

”کیا ہوا مراری؟“ اس نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیا پھر اندر کی طرف منہ کر کے بولا۔ ”رکنی باہر تو آ۔“

فوراً ہی ایک عورت باہر آ گئی۔

جیسے ہی عورت باہر آئی۔ الفانسو نے عورت کے اور حسن آرا نے اس آدمی کی کپٹی سے طنچہ لگا دیا۔

”اب میں کاٹوں؟“ مختار نے پھر دخل دیا۔

”کاشا خوب کاٹا مگر ابھی خاموش رہو۔“ حسن آرا نے جھڑکا۔

وہ دونوں کے دونوں ہی ہمیں دیکھ کر حواس باختہ رہ گئے تھے۔ وہ دونوں ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہم انسان نہیں کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں۔ مرد نے کچھ سنبھل کر کہا۔ ”کون ہو تم لوگ؟“

الفانسو نے اس کے گال پر تھپڑ مار کر کہا۔ ”سوال کرنے کا حق صرف مجھے ہے۔ اگر اب ایک بھی لفظ نکالا تو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں گا؟“ میں آگے بڑھا۔ ”چلو برابر والا کمر اکھولو۔“

”برابر..... برابر والے کمرے کی چابی میرے پاس نہیں ہے۔“ وہ گھگھیا نے کے انداز میں بولا۔

”چابی میرے پاس ہے۔“ کہہ کر الفانسو نے چابیوں کا گچھا اس کی طرف اچھالا۔

اس نے چابیوں کا گچھا لے کر کہا۔ ”آپ خود دروازہ کیوں نہیں کھول لیتے؟“

الفانسو نے پوری قوت سے اس کے گال پر طمانچہ مارا پھر غرا کر بولا۔ ”یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ جا کر دروازہ کھولو ورنہ اب کی بار خنجر شہرگ پر پھیر دوں گا۔“

”اگر فرنگی استاد کو معلوم ہو گیا تو وہ مجھے زندہ دفن کر دیں گے۔“

”تو کیا انکار کے بعد ہم تمہیں لڈو پیڑا کھلائیں گے؟ سیدھے سیدھے چل کر تالا کھولو۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

لا چاری میں وہ آگے بڑھا۔ حسن آرا اور میں نے بھی خنجر نکال لیے تھے۔

ہم تینوں کے ہاتھ میں خنجر اس کے پہلے وہ طنچہ بھی دیکھ چکی تھی پھر ہمارے تیور نے بھی اس پر اثر ڈالا تھا۔ عورت سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ ہم نے اسے بھی کھینچ کر اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ سب سے آگے وہ شخص اس کے پیچھے الفانسو اور الفانسو کے برابر میں حسن آرا اور وہ عورت۔ سب سے پیچھے میں اور مختار چل رہے تھے۔

ہم سب آگے پیچھے کمرے سے باہر نکلے اور برابر والے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ چابیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ان چابیوں کو مراری اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ کیا وہ مر چکا ہے؟“

”اسے زندہ رکھ کر ہمیں کتنی رکعت کا ثواب ملتا۔“ میں نے کہا۔

”تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ فرنگی صاحب بہت ظالم ہے وہ دشمنوں کو کتے سے نچواتا ہے۔“ وہ شخص بولا۔

”فکر نہ کرو یہی سلوک ہم اس کے ساتھ بھی کریں گے اب اپنی زبان بند کر کے ہاتھ چلاؤ۔“ الفانسو نے حکم دیا۔

”جلدی کرو میرا سر چکرا رہا ہے۔“ عورت بے بسی سے بولی۔ اس کی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ تڑپ رہی ہے۔

میں نے آواز لگائی۔ ”جلدی کرو ورنہ میں لڑکی کے پشت میں خنجر گھونپ دوں گی۔“

اس نے کئی چابیاں آزمائیں مگر ایک بھی نہ لگی تو وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”اس میں تالے کی چابی نہیں ہے۔ غلط گچھالے آئے ہو۔“

”پیچھے ہٹو!“ کہہ کر الفانسو آگے بڑھا پھر خنجر کے دستے کو تالے پر لگا کر بولا۔ ”اسے توڑنا پڑے گا۔“

”اس سلاخ کو اتار لو۔“ چھت سے لٹکانی گئی فانوس نما لائٹن جس سلاخ پر جھول رہی تھی اس کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا۔

الفانسو نے پہلے سوچ آف کیا انگریزی لائٹن کو اتارنا پھر اسے ایک طرف رکھ کر سلاخ نکالی اور اس سلاخ کو دروازے کے تالے میں

پھنسا کر جھٹکا دیا۔ تالا کھل گیا۔ تالا کھولنے کے ساتھ ایسا لگا جیسے دور کہیں سائرن بجا ہو۔ بالکل ویسا ہی جیسا جاپان کے جہاز بمباری کے لیے آتے

تھے تو سائرن بجاتا تھا۔ الفانسو گھبرا کر بولا۔ ”بھاگو۔“ ساتھ ہی ساتھ اس نے کھڑی ہتھیلی کا وار اس شخص کی گردن پر کیا، حسن آرانے بھی ہاتھ کی صفائی

کر لی۔ اس نے عورت کے پیٹ میں کئی بار خنجر گھونپا۔ الفانسو نے چیخ کر کہا۔ ”واپس سرنگ میں چلو۔“

ہم سب ادھر ہی دوڑے۔ دوڑتے دوڑتے مختار بولا ”اب میں کس کو کاٹوں گا؟“

”کہانا خوب کاٹنا مگر ابھی چپ رہو ورنہ تمہاری گردن کٹ جائے گی۔“ حسن آرا جھلا کر بولا۔

سرنگ میں پہنچ کر میں نے پوچھا۔ ”ادھر نہ آ کر دوسرے راستے سے بھی تو نکل سکتے تھے۔ ادھر کیوں نہیں گئے۔“

”باہر کے برآمدے اور سامنے کے حصے میں کم سے کم پانچ آدمی مستعد بیٹھے ہیں۔ ادھر جاتے تو زیادہ خطرہ تھا۔ اب عقلمندی یہی ہے کہ

باہر نکل چلو۔ ہمیں معلوم تو ہو گیا ناں کہ بانو اس کمرے میں ہے تبھی تو اس کی حفاظت کے لیے سائرن لگایا گیا ہے۔“

کچھ دیر اسی سرنگ میں گزار لیا جائے تو یہ بہتر نہیں ہے؟ جب معاملہ ٹھنڈا پڑے گا تو ہم دوبارہ کوشش کر لیں گے۔“ حسن آرا بولا۔

”آج کسی طور یہ ممکن نہیں ہے۔ جب وہ لوگ لاشوں کو دیکھیں گے تو ہمیں تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور اس کوشش میں

یہاں تک آجائیں گے۔ آج کی رات صبر سے گزار لو۔ کل دیکھا جائے گا۔“ الفانسو نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

ہم واپس اسی تالے میں آئے پھر وہاں سے موٹر گاڑی تک۔ الفانسو نے گاڑی اشارت کی اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

رات کا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ سڑک پر لگی لائٹ پوسٹ ہاں یہی لفظ الفانسو نے بتایا تھا۔ اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کر رہا

تھا۔ نیم اندھیری سڑک پر بھاگتی موٹر کچھ زیادہ ہی شور مچا رہی تھی۔ اکاؤ کا یکہ تا نگہ بھی آتا جاتا نظر آ جاتا۔

موٹر میں چھائی خاموشی سے اکٹا کر میں نے کہا۔ ”کل کیا وہ لوگ دفاع کا مناسب انتظام نہیں کر لیں گے؟“

”بالکل کریں گے۔۔۔۔۔ مگر ہم بھی اسی طرح ان کا جواب دیں گے۔ ایک بات اور اب تم سب کو مکمل ٹریننگ لینا پڑے گا۔ میں نے سیڑھی

گھاٹ پر ایک بڑی سی عمارت لی ہے۔ اس عمارت میں نہایت خاموشی سے لوگوں کو ٹریننگ دینے کا انتظام کیا ہے۔ ابھی پتا نہیں کب تک یہ جنگ

چلے۔ اس کے لیے ٹریننگ ضروری ہے۔“

”آبادی میں گولیوں کی آواز پر لوگ متوجہ نہیں ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہارود کا کھیل وہاں نہیں ہوگا۔ بندوق کی ٹریننگ راج گھاٹ پر دی جائے گی۔ وہاں صرف ہاتھ پیر چلانا اپنے بچاؤ کا طریقہ اور بندوق

کے اقسام اور پہچان سیکھایا جائے گا۔“ الفانسو نے ہنس کر کہا ”ویسے یاد رہے کہ ان سب کی اصل استاد تم ہو گے۔ یہاں کا چارج تمہارے ہاتھ میں رہے گا۔ کیوں کہ میں مشرقی بنگال میں بھی ایک سینٹر کھولنے والا ہوں۔ وہاں کا انتظام بھی ہمیں ہی دیکھنا ہے۔ مجھے جو ساتھی پرنگال سے ملے ہیں وہ سب اردو کم جانتے ہیں۔“

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو دراز ہی ہوتا گیا اور ہم گھر پہنچ گئے۔
 گھر پہنچے تو نور بیگم جاگ رہا تھا۔ شاید فکر میں اسے نیند نہیں آئی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔ ”بانو آزاد ہوئی؟“
 ”نہیں بس کچھ دیر کی بات تھی کہ گڑ بڑ ہو گئی۔ کل رات ہم پھر جائیں گے۔“
 ”جب تک میں ساتھ نہیں رہوں گی تم لوگ کامیاب ہو ہی نہیں سکتے۔ خواہ خواہ نیند خراب کی۔ اب چلو سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“
 کہہ کر اس نے جی بند کر دی۔

تھکن مجھے بھی تھی اور حسن آرا کو بھی۔ وہ بھی میرے ساتھ بستر پر سو گیا۔ الفانسو باہری سے جا چکا تھا۔
 ہمیں لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ نیند آنکھوں میں اتر آئی اور ہم بے خبر ہو گئے۔
 صبح آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ نور بیگم ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ میں نے اور حسن آرا نے پیٹ بھر کر کھایا پھر میں نے کہا۔ ”اماں! میں ذرا نواب کی حویلی کا چکر لگا آتی ہوں۔ شاید چھوٹے نواب آگئے ہوں؟“
 حسن آرا نے بھی ساتھ چلنا چاہا تھا مگر میں نے منع کر دیا اور اکیلے ہی نکل پڑا۔ نواب کی حویلی زیادہ دور تو تھی نہیں۔ جلد ہی اس دروازے پر جا پہنچے۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی تو چوکیدار نے چھوٹی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“
 ”ہم انا سے ملنے آئے ہیں۔“

”یہیں ٹھہرو میں پوچھ کر آتا ہوں۔“
 کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا اور چوکیدار نے مجھے اندر آنے کو کہا۔
 میں اندر پہنچا تو چوکیدار نے پھر سے دروازہ بند کر دیا۔
 پوری حویلی پر سو گواریت کا سایہ ڈول رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ شاید اس لیے کہ حویلی کے مینوں کی تعداد میں کمی آ گئی تھی کیونکہ ایسا سانا جو روح میں اتر رہا تھا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ میں نے لمحے بھر میں لان اور برآمدے کا جائزہ لے لیا تھا اور اب برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا۔
 برآمدے میں پہنچ کر میں نے بند دروازے پر دستک دی۔ ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ پہلے کمرے کو پار کر کے جب میں نے آنگن پر نظر ڈالی تو سامنے ہی آرام کرسی پر نیم درازا بنا ہوا نظر آ گئیں۔ میں نے سلام کیا اور جا کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا، مجھے دیکھ کر انا بوا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھج گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”انا بوا بھائی کی کوئی خبر ملی؟“
 تبھی میری نظر سامنے کی طرف اٹھی۔ سامنے ہی دلہن بی بی نے بچے کو گود میں اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی تھی۔

بات ہی ایسی رونما ہوئی تھی کہ ہر کوئی خوفزدہ ہو جائے۔ قتل ہو جانا معمولی بات نہیں تھی۔ فی الوقت تو اس گھر میں کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ اس لیے گھر کی عورتوں کا خوفزدہ ہونا تعجب خیز نہ تھا۔

”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ انا بوانے دلہن کو مشورہ دیا۔ وہ لوٹ گئی۔

انا نے میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ”چھوٹے نواب کو اب آ جانا چاہیے تھا پھر بھی وہ ابھی تک نہیں آئے اس لیے اب ہول اٹھنے لگا ہے کہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔“

کہیں ویکٹر نے انہیں بھی قید نہ کر لیا ہو۔ میرے دل میں خدشے نے سرا بھارا مگر میں کچھ بولا نہیں۔

مجھے خاموش دیکھ کر انا بوانے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہیں اس فرنگی نے کوئی چال تو نہیں چلی جو چھوٹے نواب ابھی تک آئے نہیں ہیں؟“ میں نے ایک نظر سامنے والے کمرے پر ڈالی۔ وہ کمرہ اچھوٹی دلہن کا تھا کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے چہرہ پر بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ مگر اس کی نظریں ہماری طرف تھیں۔ وہ مجھ سے دوری بنائے ہوئے تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس کی نظریں ہی نہیں کان بھی ہماری طرف لگے ہوئے ہوں گے۔ کیوں کہ بات اس کے شوہر کی ہو رہی تھی اور ہر بیوی کی طرح وہ بھی اپنے شوہر کے لیے پریشان ہوگی۔ مگر انا کی وجہ سے میرے پاس نہیں آرہی ہے۔ ویسے بھی اچھے گھروں کی عورتیں زخموں کو کب منہ لگاتی ہیں۔ میرا دل چاہا کہ میں خود جا کر اسے باہر لے آؤں اور انا بی کے ساتھ بٹھا کر اس سے باتیں کروں۔ خوب ڈھیر ساری باتیں تاکہ اس کے دل کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ مگر اس سے بے تکلف ہونے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ جبکہ وہ میرے چھوٹے بھائی کی بیوی تھی مگر میں کس رشتے سے اسے مخاطب کرتا؟

”کیوں تم نے جواب نہیں دیا؟“ انا نے پھر پوچھا۔

”نہیں انا بی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس دعا کریں کہ میں کوئی راستہ نکال لوں۔ منزل کے قریب ہوں یقین کریں گے کل رات ہی بانو کو میں آزاد کرا لیتی لیکن عین وقت پر گڑ بڑ ہوگئی۔ اللہ نے چاہا تو کل بانو یہاں ہوگی۔“

”تمہارے منہ میں گلی شکر۔ مگر چھوٹے نواب کی بھی تو فکر کھائے جا رہی ہے۔ وہ آخر کہاں رک گئے ہیں؟“

”کسی ضروری کام میں پھنس گئے ہوں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”اے ہے کیسے فکر نہ کروں۔ اب اس گھر کی پوری ذمہ داری مجھی پر آ پڑی ہے۔“

”اس سے کس کو انکار ہے مگر یہ بھی تو سوچیں کہ فکر کرنے سے کیا حاصل ہے۔ جتنا خوف کھائیں گی اتنا ہی خون جلے گا۔ ویسے بھی اس گھر میں اب رہا کون۔ بڑے نواب صاحب کے وقت میں اس گھر میں کتنے لوگ تھے مگر اب کون ہے؟ سب بھاگ لیے۔“

میں کوئی جواب دیتا کہ دلہن بچے کو گود میں اٹھائے باہر آ گئی۔ اب تک میں نے اسے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ قریب والے دن وہ سر کی وجہ سے کمرے کی بو بونی ہوئی تھی۔ دور دور رہی۔ واردات کے بعد میں جتنی بار آیا وہ سامنے نہیں آئی۔ آج نظر آئی بھی تو دور سے۔ لیکن جب وہ نزدیک آئی تو میں حیران رہ گیا۔ عام طور سے ہماری صنف میں عورتوں کے لیے کوئی کشش نہیں ہوتی مگر عجیب بات تھی کہ میں دیگر زخموں کے مقابلے

میں کچھ کچھ الگ تھا۔ عورتوں میں کشش محسوس کرتا تھا۔ کچھ کچھ اس لیے کہ تربیت کا اثر بھی تو ہوتا ہے۔ اس وجہ سے دلہن کو قریب سے دیکھ کر میں رنگ رہ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ تو پریوں کے دیس کی ہے۔ اس کی جلد کی رنگت اور ملاحظہ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا اس کے سامنے تو چاند کی چاندنی بھی پھٹکی اور گلاب کا حسن مانند ہے۔ اسی پری وں کو وینس کے مجھے کو دیکھ کر میں مہربان رہ گیا تھا کہ اس کے پنکھڑی ایسے لب و لہو ہے۔ ”ابھی آپ کہہ رہی تھیں کہ وہ کسی کام میں پھنسے ہوں گے کیا آپ کو کام کی نوعیت کا پتا ہے؟“

”مجھ سے تو اب تک ملاقات سرسری ہوئی مگر... اس لیے آپ کو زیادہ پتا ہوگا۔“ میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

میری بات کی گہرائی پر وہ کچھ شرمائی۔ اس نے سر جھکا کر کہا ”مجھے لگتا ہے کہ وہ اسی فرنگی کے سلسلے میں گئے ہیں یعنی الجھن اتنی جلدی سلجھنے والی نہیں۔“

”اس سفر کے بارے میں کوئی ایسی بات بتاؤ جو کام آسکے؟“

ہم باتیں کر رہے تھے کہ آگن میں کھلنے والا باہر کا دروازہ کھلا اور ایک ساتھ دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں کھلے ہوئے چاقو تھے۔ انہوں نے اندر آتے ہی کہا۔ ”خبردار کوئی اپنی جگہ سے ہلے گا نہیں ورنہ آنتیں باہر آ جائیں گی۔“

”اے ہے بھیا! ایسی بھی کیا جلدی ہے پہلے یہ تو بتاؤ تم لوگ لینے کیا آئے ہو؟“ میں نے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلا کر کہا۔

”ابے اوجھکے تو چپ رہے گا ورنہ تیری آنتیں پہلے باہر کروں گا۔“ ان میں سے ایک نے غرا کر کہا۔

وہ دو ہرے بدن کا قد آور جوان تھا۔ اس نے لمبی لمبی سی موٹھیں رکھی ہوئی تھیں جب کہ دوسرا درمیانے قد کا تھا لیکن اس کی رنگت ایسی سیاہ تھی کہ شب و بجور بھی شرمایا جائے۔ اس نے کرتے کا گریبان بھی کھول رکھا تھا جیسے وہ شہر کا سب سے بڑا شہداء سب سے بڑا بد معاش ہو۔

”دیکھو بھائی یہاں کوئی مار کٹائی والا تو ہے نہیں۔ دو عورتیں ہیں اور ایک میں ہوں پھر یہ چاقو کا کیا کام؟“ میں نے ان کی طرف ایک قدم بڑھا کر کہا۔

”ہمیں بھی انہی عورتوں سے کام ہے۔ یہ چھوٹے نواب کی بیوی ہے ناں!“ اس نے دلہن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”مگر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے حکم ملا ہے میں پیسے دینے والوں سے یہ نہیں پوچھتا کہ کیوں کسی کی ہڈی پستلی تڑوا رہے ہو۔ جس کام کے پیسے ملتے ہیں ہم اسے ہر حال میں پورا کرتے ہیں۔“ کالے والے نے کہا۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ تو پہلے ہی ڈر سے مری جا رہی ہے۔ اب تم اسے اور نہ ڈراؤ۔“ میں نے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ ”اسے لے جا کر تمہیں کیا ملے گا۔“

”پورے تین سو روپے ملیں گے اور کیا۔“

”تو بھیا تم بڑی بی بی سے چار سو روپے لے لو۔“

”نہیں ہم سو روپے میں بے ایمانی نہیں کرتے ہیں۔“ اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اچھل کر اس کے چاقو والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ اس اچانک حملے میں اس کے ہاتھ سے چاقو نکل کر دور جاگرا۔ دوسرا شخص سنبھلتا کہ میں نے اسے چھاپ لیا۔ میں دیوانوں کی طرح اس پر گھونے برسا رہا تھا۔ لیکن یہ وقفہ طویل ثابت نہ ہوا اور میں اسے چھوڑ کر الگ ہو گیا۔

وہ اٹھتا کہ میں نے کپڑے دھونے والے گدھر سے دوسرے والے کی مرمت شروع کر دی۔ اس موقع پر دلہن نے بھی کمال پھرتی دکھائی اور بچے کو انا بوا کو دے کر وہیں پڑے ایک ڈنڈے کو اٹھا لائی پھر لمبے والے کی پٹائی شروع کر دی۔

دونوں کے چاقو دھرے رہ گئے تھے۔ دراصل مقابل اگر جنونی ہو جائے تو مقابلہ زیادہ مشکل ہو جاتا ہے اور یہاں یہی ہوا تھا۔ میں اور دلہن دونوں ہی جنونی ہو گئے تھے اسی لیے ہمارے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے۔ وہ دونوں کچھ ہی دیر میں لمبے لمبے لیٹ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ دونوں کی دو چار ہڈی ضرور ٹوٹی ہوگی۔ ناک منہ سر سے خون گر رہا تھا۔

دونوں کو بے ہوش کرنے کے بعد میں نے انابی کی طرف فتح مندی سے دیکھا۔ پھر دلہن پر نظر ڈالی دھان پان سی دلہن بیگم ڈنڈا تھا سے ہانپ رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر کھلے دروازے سے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

باہر جا کر پتا چلا۔ چوکیدار دروازے کے نزدیک لمبا لمبا چت پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کے کمرے میں پہنچا دیا پھر لوٹ کر اندر والے ہال کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

”چوکیدار کہاں مر گیا تھا؟“ انا بوا نے پوچھا۔

”اسے بیہوش کر دیا گیا تھا۔ اسے اس کے کمرے میں لٹا آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اے جی دلہن! تم نے بھی تو کمال کر دیا۔ اس طرح اس کی پٹائی کی کہ بے چارہ کئی دن تک بستر سے اٹھ نہیں پائے گا۔“ انا بوا دلہن سے بولیں۔

”اس کی وجہ میں بتاؤ؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”ہاں بولو!“ انابی نے پوچھا۔ دلہن بیگم کی نظریں بھی مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

میں نے دلہن بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دراصل یہ چھوٹے نواب صاحب کا غصہ تار رہی تھیں۔“

میری بات پر وہ شرما کر رہ گئی۔

”اب ان کا کیا کیا جائے؟“ دلہن نے پوچھا۔

”فی الحال تو ان کو تہ خانے میں بند کر دیتے ہیں۔ بعد میں دو چار سوال کر کے انہیں پھینک آؤں گا۔“

میں نے اکیلے ہی ان دونوں کو باری باری نیچے گھسیٹ کر پہنچایا پھر اوپر آ کر انابی کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں دلہن نے بادام کا شربت بنا

لیا تھا۔ میں گھونٹ گھونٹ شربت بھی پی رہا تھا اور باتیں بھی کر رہا تھا۔ ہماری باتوں کا محور چھوٹے نواب تھے۔

ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم تینوں چونک گئے۔ انابی نے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔ ”کون؟“

”میں ہوں انابی!“ باہر سے آواز آئی۔ اس آواز نے جادو کی طرح کام دکھایا۔ دلہن بیگم کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ ایسے دوڑی جیسے کسی بہت عزیز ہستی کی آواز ہو۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ باہر چھوٹے نواب ہیں۔ دلہن بیگم نے دروازہ کھولا تو اس کی تصدیق ہو گئی۔ وہ چھوٹے نواب تھے۔ انہیں میں نے تقریب والے دن دیکھا تھا پھر آج دیکھ رہا تھا۔ اندر آتے ہی وہ انابی سے پلٹ گئے۔ ”انابی یہ سب کیا ہو گیا۔ دو دن کے لیے تو میں باہر گیا تھا اور یہاں اتنی بڑی واردات ہو گئی۔ اور یہ باہر کا دروازہ کیوں پاٹو پاٹ کھلا ہے۔“

”یہاں قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ کاتب تقدیر نے قسمت میں جو لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ تم گھر میں بتا کر نہیں گئے ورنہ کسی کو بھیج کر خبر کر دیتی۔ تمہارا کوئی اتنا پتا بھی نہیں تھا اس لیے انتظار بھی نہیں کیا اور دفن دیا گیا۔ دروازہ کیوں کھلا تھا یہ بھی جان لو گے ابھی آرام سے دم تو لے لو۔“ انابی نے بھرائے گلے سے کہا۔

”انابی قسم خدا کی میں ویکٹر اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ چھوٹے نواب نے منٹھیاں بھیج کر کہا۔

”یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو چھوٹے نواب نے پلٹ کر مجھے دیکھا پھر بولے۔

”آپ کو میں نے پہچانا نہیں؟“

”اس وقت پورے پٹنہ میں یہی ہماری ہمدردی ہے اس نے جان پر کھیل کر پتا لگالیا ہے کہ بانو کہاں ہے مگر بیٹا یہ ساری باتیں تمہیں کیسے پتا لگیں۔“

”میں اسٹیشن سے نکل رہا تھا کہ بھائی حامد سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ہی بتایا ہے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تمہیں پتا ہے ناں مجھے وہاں لے چلو۔“

”ابھی آپ آئے ہیں آرام کریں ہمیں اپنے طور پر کام کرنے دیں۔ آج ہی رات میں جو کرنا ہے وہ کروں گی اور اللہ نے چاہا تو کل بانو یہاں ہوگی۔“

”نہیں میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ چھوٹے نواب کے لہجے میں چٹان ایسی سخت تھی۔

”آپ نے ضد پکڑ لی ہے۔ تو مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا ہوگا۔“ میں نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا کہ الفانسو بھی میرے ساتھ ہے کیونکہ ابھی پتا نہیں تھا کہ وہ خود چھوٹے نواب کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔

”تمہارے ساتھ کتنے لوگ ہیں اور کیا سب کے سب تمہارے ایسے ہیں؟“ اس نے میرے زخموں والے بھیس کی وجہ سے پوچھا۔

”نہیں مرد بھی ہیں مگر تعداد ابھی نہیں بتاؤں گی۔ پہلے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں گی۔“

”تو جلد سے جلد ان سے رابطہ کرو۔ مجھے بتاؤ میں صبر نہیں کر سکتا۔ میں مہنا ز بانو کا سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے میں ابھی جا کر بات کر آتی ہوں۔ انشاء اللہ کل میرے دوست مان جائیں گے۔ تہ خانے میں جو بندے پڑے ہیں ان کو باہر بھیج دیا جاسکتے ہیں تو پھینکوا دیں ورنہ یہ کام بھی میں کر لوں گی مگر رات میں۔“ میں نے زخموں کے انداز میں کہا۔ اتنا کہہ کر میں وہاں سے نکل آیا۔ میرے ذہن سے ایک بوجھ تو کم ہوا۔ چھوٹے نواب کے آجانے سے دل و دماغ پر چھائی یہ فکر دور ہو گئی تھی کہ وہ ویکٹر کی قید میں نہیں ہے۔ اب ہم مکمل یکسوئی کے ساتھ ویکٹر سے لکرا سکتے تھے۔

میں انہی سوچوں میں غوطہ زن آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے مرکزی سڑک کو پار کر لیا اور اس گلی میں داخل ہو گیا جس میں ہم رہتے تھے۔ میرے گھر کے سامنے موٹر کار کھڑی تھی۔ اس دور میں یہ کوئی عام سواری تو تھی نہیں، گنتی کے لوگوں کے پاس ہوتی تھی اس لیے فوراً نظروں میں آ جاتی تھی۔ ہمارا پیشہ کچھ ایسا تھا کہ ہر قسم کے لوگ ہمارے ہاں آتے رہتے تھے۔ اس لیے لوگوں نے توجہ نہیں دی تھی ورنہ تو محلے والے تجسس میں مبتلا ہو جاتے۔ خیر! میں نے موٹر کار کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ کار الفانسو کی تھی۔ گویا وہ میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے قدم تیز کر دیئے اور گھر میں داخل ہو گیا۔

الفانسو پلنگ پر بیٹھا تھا۔ سامنے کچھی چٹائی پر نور بیگم اور حسن آرا بیٹھے تھے۔ وہ تینوں ہنس کر باتیں کر رہے تھے میرے داخل ہوتے ہی گفتگو کا سلسلہ رک گیا اور حسن آرا نے کہا۔ ”بابو صاحب کب سے منتظر بیٹھے ہیں۔“

”مجھے نواب صاحب کے ہاں کچھ زیادہ دیر ہو گئی۔ چھوٹے نواب لوٹ آئے ہیں ناں۔“ میں بولا۔

”ہاں مجھے معلوم ہے دراصل ایک آدمی کو اس گھر پر نظر رکھنے کے لیے بٹھا دیا ہے۔“ الفانسو نے جواب میں کہا۔

”پھر بھی وہاں اتنی بڑی بات ہو گئی۔ دو بندے اندر گھس آئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں اندر تھا ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔“

”مجھے فوراً پتا چل گیا تھا۔ میں بھی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا مگر جب یہ معلوم ہوا کہ تم اندر ہو تو میں باہر رک گیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ تم

معا ملے کو سنبھال لو گے۔ پھر بھی میں باہر منتظر تھا مگر جب دیکھا کہ تم باہر آئے اور چوکیدار کو گھسیٹ کر کمرے میں لے گئے تو میں سمجھ گیا کہ تم نے میدان مار لیا اسی لیے میں باہر سے ہی لوٹ آیا۔ اپنے آدمیوں کو بھی بھیج دیا۔“ الفانسو نے ہنس کر کہا۔ ”آخر تم میرے معاون ہو کھیل نہیں۔“

”گویا تمہارا بھی پورا گینگ ہے؟“

”مجھے تم لوگوں کی مدد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ جب تک یہاں والے اپنے آپ کو مضبوط نہیں کر لیتے میں اپنی مدد آپ کے تحت کام کر رہا

ہوں۔ ضرورت پڑنے پر مقامی غنڈوں کو کرائے پر لے لیتا ہوں لیکن وہ ایک فقیر ہے جو چھوٹے نواب کے گھر کے سامنے بیٹھا ہے۔ اسے ہر روز میں

ایک روپیہ دیتا ہوں اور وہ مجھے وہاں کی خبر دیتا ہے۔ اسے سمجھا دیا ہے کہ کوئی بڑا خطرہ ہو تو وہ میرے ٹھکانے پر آجائے ورنہ صبح شام دو پہر میں خود رک

کر خبر معلوم کر لیتا ہوں۔ اسی نے خبر دی تھی۔“

”تو پھر اب کیا پروگرام ہے؟“

”اس بار ہم اس سرنگ سے نہیں سیدھے سیدھے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوں گے کیونکہ اب تک اس نے جان لیا ہوگا کہ سرنگ

غیر محفوظ ہے۔ جیتے مارے جا چکے ہیں۔ اسی لیے اس نے اس راہ کو بند کر دیا ہوگا۔“

”لیکن آپ نے تو بتایا تھا کہ مرکزی دروازے پر کئی نشاٹچی بندوق لیے بیٹھے ہیں؟“

”یوں بھی ہم شیر کے منہ سے شکار چھیننے والے ہیں، خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے ہم بھی تیار ہیں کب چلنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آج ہی رات میں صرف یہ دینے آیا تھا۔“ کہہ کر اس نے ایک بنڈل بڑھایا۔

”اس میں کیا ہے؟“

”اس میں پتلون بوشرٹ ہے۔ ضرورت پڑ سکتی ہے اس لیے انتظام کر لیا۔“

وہ واپس چلا گیا اور ہم تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ نور بیگم نے کہا۔ ”میں سب سے آگے رہوں گی اور تم دونوں میرے پیچھے تاکہ گولیاں چلیں

تو میں جواب دوں۔“

”ہاں تم تو فولادی ہوناں تم پر گولیاں کب اثر کرتی ہیں۔ ارے پاگل اس تھل تھل بدن سے تو تم بھاگ بھی نہیں سکو گی۔ پھر ابھی زخم بھی صحتج

طور پر بھرے نہیں ہیں۔ آگے میں رہوں گی تاکہ آڑ لے لے کر گولیاں چلاؤں۔ تم سے زیادہ پھرتی میرے اندر ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا یہ ہم سے نہیں ہوگا؟ میں دنیا دیکھ چکی ہوں اب تمہیں دیکھنا ہے۔“

”اماں ہم مرنے یا خودکشی کرنے نہیں جارہے ہیں۔ ہم تو وہاں صرف مارنے جارہے ہیں اس لیے ایسی باتیں تو نہ کریں۔“ میں نے نور

بیگم کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”یہ صحیح کہہ رہی ہے۔ شنو مار پیٹ بھی اچھا کر لیتی ہے اس لیے اسے ہی آگے رہنا چاہیے۔ ہم اس کی رہبری میں آگے بڑھیں گے۔“

حسن آرانے سمجھایا۔ اس کی بات میں دم تھا اس لیے نور بیگم خاموش ہو گیا۔

”ایسا کرتے ہیں ان باتوں کو شام کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ شام میں سوچیں گے فی الحال کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ

لوگ بھی مان گئے۔ یوں بھی انسانی جسم کو آرام دینا ضروری ہے۔ میں اور نور بیگم بستر پر لیٹ گئے جب کہ حسن آرا چٹائی پر چادر بچھا کر سونے کی کوشش

کرنے لگا۔

”مختار نظر نہیں آرہا ہے، وہ کہاں گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ عجیب پاگل ہے۔ بار بار ایک ہی سوال کرتا ہے۔ اب کس کو کاٹنا ہے۔“ نور بیگم ہنس کر بولا۔

☆.....☆

شام نے رات کی بانہوں میں دم توڑ دیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ چوراہوں پر لائٹیں روشن تھیں جن کی زرد روشنی اندھیرے سے

لڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ الفسٹن اور دیگر علاقے کی سڑکوں پر ہی الیکٹرک بلب لگے تھے ورنہ زیادہ تر علاقے ابھی تک پرانے دور میں تھے۔

وہی شام ہوتے ہی سڑک کنارے لگے کھمبوں پر لٹکتے لائٹیں میں مشعلچی کا آکر تیل ڈالنا اور اسے روشن کر دینا۔ اسی لائٹیں کی روشنی رات بھر اندھیرے سے لڑتی رہتی۔ اس وقت بھی لائٹیں کی مثیلی روشنی اندھیرے سے لڑ رہی تھی۔ اسی روشنی میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میں نے سڑک کے اس حصے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا جدھر الفانسو کی گاڑی کھڑی ملتی۔ اس نے صبح ہی بتا دیا تھا کہ اپنے ساتھ وہ کچھ غنڈوں کو بھی لائے گا اور وہ انہیں ہماری شخصیت سے لاعلم رکھنا چاہتا ہے اسی لیے اس نے ہمیں پینٹ بوشرٹ میں آنے کے لیے کہا تھا۔

ہم تینوں اس جگہ جا کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ الفانسو کی کار پہنچ گئی۔ اس کی کار میں کوئی نہیں تھا۔ مگر کچھ ہی دیر میں آٹھ دس گھڑسوار پہنچ گئے۔ وہ سب لائٹیں کی زورور روشنی میں نہایت بد ہیئت لگ رہے تھے۔ یقیناً وہ سب شہدے تھے۔ غنڈے تھے لیکن مجھے ان سے کیا لینا دینا تھا اس لیے ادھر سے منہ موڑ کر کار میں بیٹھ گیا۔ ہم تینوں کے کار میں بیٹھے ہی الفانسو نے کار اسٹارٹ کر دی۔

اب ہمارا رخ اس حویلی کی طرف تھا جس میں بانو کو قید کیا گیا تھا۔ ہم نہایت حیزی سے ادھر بڑھ رہے تھے۔ پختہ سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپوں سے بھونچال آیا ہوا تھا۔ گلی کی گونج دور تک سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً دو ایک آدمیوں نے اپنے گھروں سے جھانکا بھی ہوگا۔ ہم اسی رفتار سے چلتے ہوئے بالآخر اس حویلی تک پہنچ گئے۔

حویلی کا دروازہ بند تھا۔

الفانسو نے مرکزی دروازے سے کچھ پہلے اپنی موٹر روک لی۔ گھڑسوار بھی رک گئے تھے اور اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر کر گھوڑوں کی پیٹھ پیچھے چھپ رہے تھے۔ شاید یہ اشارہ تھا کہ بس تمہیں یہیں ٹھہرنا۔ پھر وہ لوگ بھی ہمارے قریب آ گئے۔

الفانسو نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ کسی بندر کی طرح نہایت حیزی سے دیوار کے قریب کھڑے پیڑ پر چڑھتا چلا گیا پھر وہ پیڑ پر سے حویلی کے اندر اتر گیا۔ کچھ دیر تک اندر خاموشی چھائی رہی پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے برابر میں ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ اس کیبن کے دروازے پر ایک آدمی آڑا تر چھا پڑا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ چوکیدار ہے اور اسے اندر آنے والے نے بے ہوش کیا ہوگا۔ میں نے ادھر سے نظریں ہٹا لیں اور سب کے ساتھ اندر کی طرف بڑھنے لگے۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اب تک کسی نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ حویلی پر ہنوز سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا سب دم سادھے بیٹھے ہیں۔ ہم برآمدے پر چڑھے پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

وہ ہال نما کمرہ بھی خالی پڑا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک ہم نے کئی کمرے دیکھ ڈالے مگر کسی میں کوئی نظر نہیں آیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری عمارت خالی پڑی ہو۔ اس خدشے کا اظہار الفانسو نے بھی کیا۔ تبھی میری نظر ٹیبل پر تہ کیے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی اور میں نے اسے اٹھالیا۔ کھولا تو اندر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ کاغذ الفانسو کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بزدل یہاں سے بھاگ گیا۔“

پھر قدرے اونچی آواز میں بولا۔ ”اس نے لکھا ہے۔ تم لوگوں کو خاصی مایوسی ہوئی ہوگی۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ کوشش کرو شاید مجھ سے میرا شکار

چھین لو۔ میں لڑکی کو ایک محفوظ مقام پر منتقل کر رہا ہوں۔ جب تم لوگ انتہائی خفیہ راستہ ڈھونڈ سکتے ہو تو کوشش کرو شاید میں مل جاؤں۔“

”اچھا بچو! میں تمہیں ڈھونڈ ہی لوں گا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”فی الحال تو واپس چلیں۔ اب جو کچھ بھی ہوگا صبح ہی ہوگا۔“

ہم لوگ وہاں سے بے نیل و مرام اپنے ڈیرے پر لوٹ آئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ چھوٹے نواب سے کیسے سامنا کروں گی۔ بڑے دعوے تھے۔ تمام دعوے دھرے رہ گئے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مہناز بانو لڑکی ذات ہے۔ پتا نہیں کس حال میں ہوگی۔

نواب زادی ہے۔ یہ مصائب تو اس پر گراں گزر رہے ہوں گے۔ اسے کیسے رہا کراؤں؟

مجھے خاموش دیکھ کر الفانسو نے کہا۔ ”فکر نہ کرو آج نہیں تو کل میں اسے ڈھونڈ ہی لوں گا۔ اب مجھے بھی ضد چڑھ گئی ہے۔ اسے ہر حال میں شکست دوں گا۔ بانو کو بازیاب کرا کر رہوں گا۔“

”چھوٹے نواب بھی میرے ساتھ آنے کو تیار تھے بڑی مشکل سے انہیں رد کا تھا۔ میں نے بڑے دعوے کیے تھے۔ لگتا ہے قسمت مجھے ان کے سامنے بے عزت کرانے پر تلی ہوئی ہے۔“

”جنگ میں فتح کس کا مقدر ہے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔“ الفانسو نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ”یوں بھی یہ جنگ تو کلی طور پر میرے اور اس کے درمیان ہے۔ باقی سب تو اضافی ہیں۔ خواہ تم ہو یا چھوٹے نواب۔ اس لیے یہ بات دل پر نہ لو۔ وہ مجھ سے زیادہ بھاگ نہیں سکتا۔ میں بہت جلد اسے ڈھونڈ لوں گا۔“

وہاں سے ہم مایوسی میں لپٹے ہوئے لوٹ آئے۔ وہ ہمیں گھر پہنچا کر اپنے آدمیوں کے ساتھ چلا گیا۔

☆--☆

اک قطرہ خون

ایک قطرہ خون، مصنفہ عصمت چغتائی صاحبہ کی تحریر ہے جس میں انہوں نے مشہور واقعہ کربلا اور نواسر رسول سیدنا امام حسینؑ کی

شہادت کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ایک ایسی تحریر جسے پڑھ کر آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں گی اور دل بے اختیار خدا کے حضور سر

بمجدو ہو جائے گا۔ **عصمت چغتائی صاحبہ** کی یہ کتاب آپ کتاب گھر کے سیکشن **اسلامی تاریخی ناول**

میں پڑھ سکتے ہیں۔

اس وقت الفانسو ہمارے ہی کمرے میں بیٹھا تھا اور ہم سب سر جوڑے اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ مہناز بانو کو کیسے رہا کرایا جائے اور آزاد ہند فوج کو افرادی قوت کہاں سے فراہم کی جائے۔ اس لیے کہ کرٹل بشیر کا پیغام چا پانی ریڈیو سے نشر ہو رہا تھا کہ تم ہمیں خون دو ہم تمہیں آزادی دیں گے۔

”شنو! غور کرو اس وقت دونوں مسئلے اہم ہیں۔ مہناز کو بھی رہا کرنا ہے اور افرادی قوت بھی جمع کرنا ہے۔“ الفانسو بولا۔ ”میری حکومت اتنا پیسہ اسی امید پر خرچ کر رہی ہے کہ انگریز یہاں سے بوریا بستر گول کر لیں۔ اگر مہناز کا مسئلہ درمیان میں نہ آ جاتا تو اب تک میں بہت بڑی قوت جمع کر چکا ہوتا۔“

”آزادی بھی ضروری ہے مگر یہ سب بڑے لوگوں کا خواب ہے۔ ان کا کام ہے۔ ہم ٹھہرے غریب لوگ۔ ابھی بھی محنت کرتے ہیں بعد میں بھی محنت کرنا ہوگا۔ اس لیے میری نظر میں سب سے اہم مسئلہ مہناز کا ہے۔“ میں نے دل کی بات کہہ دی۔

”مگر یہ بھی تو سوچو آزادی کی جنگ میں یہاں کی کمانڈر نواب صاحب کے پاس تھی۔ یہ خواب انہی کا تھا۔“ الفانسو نے کہا۔

”مگر ہمیں آزادی چاہیے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات چاہیے اس لیے افرادی قوت جمع کرنا ضروری ہے۔“ حسن آرا بے اختیار بول اٹھا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

صرف حسن آرا کے کہنے پر میں نے سوچا۔ یہ تو میرے ابا کا خواب تھا۔ اسے پورا کرنا مجھ پر بھی فرض ہے۔ مجھے اس خواب کو تعبیر دینا چاہیے۔ پھر ایک دم سے سوچا ہاں میں اس خواب کو تعبیر دوں گا۔ ہمیں محب وطن افراد کی تلاش شروع کر دینا چاہیے۔

الفانسو نے ایک دو اپنے خاص آدمیوں سے ملاقات کرائی تھی جو ابا کے جاننے والے تھے۔ انہیں میں ایک شیر بہادر بھی تھا۔ کہنے کو وہ نیپالی ہندو تھا مگر مسلم نوابوں کے ہاں ملازمت کرنے کی وجہ سے مسلمانوں سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ اندر ہی اندر محب وطن افراد کو تلاش کر رہا تھا۔ اس وقت جب ہم سر جوڑے بیٹھے غور و فکر کر رہے تھے اسی وقت وہ آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ اس نے ان صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ خان صاحب ہیں۔“

ہم سب نے ان صاحب سے مصافحہ کیا۔

”ان کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ آپ ان کی پتاسن لیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو ان سے کام بھی لیا جاسکتا ہے۔“ شیر بہادر نے کہا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان کے ساتھ ہوا کیا ہے تم کیوں نہیں بتا دیتے۔“ حسن آرا نے آنکھیں ترچھی کر کے کہا۔

”خان صاحب اپنی پتا خود بتائیں گے پھر فیصلہ کرنا آپ سب کا کام ہے۔ میرا خیال یہی ہے کہ یہ آپ کے لیے کام کریں۔ آگے آپ کی مرضی ویسے ان پر جو گزری ہے وہ سن لیں۔“ شیر بہادر نے کہا۔

”ان کے دل میں وطن کو آزاد کرانے کی لٹک ہے یہی کافی ہے۔“ الفانسو نے جواباً کہا۔

”بس جناب قسمت کی خرابی۔ وطن کی محبت میں ہی میں نے محکمہ پولیس میں نوکری ڈھونڈی تھی۔“ خان صاحب نے کہنا شروع کیا ”میں نے محکمہ پولیس میں پورے بارہ سال گزارے ہیں۔ ہندی میں بارہ سال کو ایک یگ کہتے ہیں۔ ہندی ہی کی یہ کہاوت مشہور ہے کہ ایک یگ کے بعد ”گھو رے“ کے بھی دن بدلتے ہیں مگر میں تو ایسا گھو را تھا جو اپنے اندر دبی چنگاری کے باعث صرف تپش ہی دے رہا تھا، جلنا ہی جس کا مقدر تھا۔“ وہ کسی داستان گو کی طرح بول رہے تھے اور ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ ”بلکہ میری قسمت تو وقت کے ساتھ مزید سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے تو قسمت نے وہ دن بھی دکھائے تھے کہ میرے انہی ہاتھوں نے جو ان بیٹے کالا شا اٹھایا تھا۔ اس بیٹے کا لاشہ جسے میں نے خود قتل کیا تھا۔ میرا وہ بیٹا بھی میری طرح بیچ وقتہ نمازی تھا حافظ قرآن تھا۔ جب وہ وجد میں تلاوت کرتا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر شے پر سکوت چھا گیا ہو۔ میں خود بھی اپنے تمام کام چھوڑ کر اس کی قرأت سے محفوظ ہونے لگتا تھا۔ آج اتنے دن بعد میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کاش میرا بیٹا نرا جاہل ہوتا۔ اسے اچھائی برائی کی تمیز نہ ہوتی تو میں کبھی اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتا مگر میری اولاد تو علم کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی۔

میری بیٹی صبا کہتی تھی۔ ”ابا جانی، ہمارا گھر پوری بستی میں سب سے نمایاں ہے۔ سب سے معزز ہے، سردار حسن کے گھرانے سے بھی معزز کہ علم ہماری میراث ہے۔ ہر کوئی ہم سے جھک کر ملتا ہے۔ میرا بھائی علم کی ہی بدولت عام لڑکوں سے جدا ہے۔ باجی سیکینہ کہتی ہیں فرشتوں کی صفت میرے بھائی میں ہے۔“

میں خود بھی اپنے بیٹے پر فخر کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے زوار شاہ نے میری کسی بات پر کہا تھا۔ ”نور محمد! ہمیں تم پر فخر ہے کہ تم نے اپنے بچوں کو مثالی تربیت دی ہے۔“

میری نظروں میں آج بھی ارشد کی شکل رقصاں ہے۔ نہ صرف ارشد کی بلکہ راشد اور صبا کی بھی۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے صبا میرے قریب کھڑی ہو اور مجھ سے کہہ رہی ہو۔ ”آج آپ کی رات کی ڈیوٹی ہے نا ابا جانی! صبح جلدی آجائے گا۔“

”کیوں بھائی آج ایسی کون سی بات ہے جو اتنی محبت سے مجھے جلدی آنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔“ میں نے شفقت بھرے ہاتھ سے اس کے سر پر تھپکی دے کر کہا تھا۔

”اس پاگل لڑکی سے تو خدا سمجھے! اتنی بڑی گھوڑی ہو گئی ہے عقل نام کو نہیں۔ دن بھر گڑیا گڈے کے کھیل میں مشغول رہتی ہے۔ آج اپنے گڈے کی شادی صنوبر کے گڑیا سے کر رہی ہے۔ آپ سے مٹھائی منگوانا چاہتی ہو گی“ میری بیگم رضیہ بولی تھی۔

”صبا کی اماں! تم تو خواہ مخواہ میری بیٹی کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔“ میں رضیہ سے اور پھر صبا سے مخاطب ہوا۔ ”تو فکر نہ کر میں شام میں لوٹتا ہوا مٹھائی کا ڈبہ لیتا آؤں گا۔“ اور میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ چلتے چلتے راشد کے کمرے میں نظر ڈالی۔ وہ ایک رسالے کے مطالعے میں مشغول تھا۔ میں نے دروازے میں رک کر شفقت بھرے لہجے میں پوچھا ”کیا پڑھ رہا ہے میرا بیٹا!“

”ابو یہ بے ہند نیوز لیٹر ہے۔“ راشد نے رسالہ بند کر کے کہا۔

”کیا! بے ہند نیوز لیٹر اور میرے گھر!“ میں نے غصے میں کہا ”یہ ایک محب وطن سپاہی کا گھر ہے یہاں غداروں کی کوئی چیز نہیں رہنا چاہیے۔“

”محب وطن ہند!“ راشد نے نفرت سے ناک سکوڑی۔ ”آپ لاکھ کوشش کر لیں یہ غاصب انگریز ہمارے حقوق کو غصب کرنے والے کسی بھی قیمت پر ہمیں قبول نہیں کریں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے ہر دور میں ہمیں دھوکا دیا ہے۔ ہمارے منہ سے نوالے چھینے ہیں۔ نواب سراج الدولہ ٹیپو سلطان بہادر شاہ ظفر ان سب کو دھوکے اور خداریوں کی مدد سے شہید کیا ہے۔ ہم اب جاگ اٹھے ہیں۔ ہمیں کوئی بھی دبا نہیں سکتا۔ اپنا حق ہم چھین کر رہیں گے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی غلطی کا بوجھ بہت ڈھولیا۔ بہت مذاکرات کر لیے۔ گاندھی اور قائد اعظم کی زبان یہ لوگ سمجھنے والے نہیں ہیں اس لیے اب ہم ہندو سے بات کریں گے۔“

”ابے گدھے! یہ تو کیا بک رہا ہے خبردار جو پھر ایسی بات کی۔ زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ ہم محبت وطن ہیں خداریوں کو نہیں۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ اس پر آٹھ سو سال تک ہم نے حکومت بھی کی ہے۔ انگریز بھی اس بات کو مانتے ہیں۔ اسی لیے تو مسلمانوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ انگریز بہادر کے دور میں ہمیں کس چیز کی کمی ہے؟ اپنی سوچ کو بدل لو ورنہ میں تمہیں خود گولی مار دوں گا۔“ کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

ڈیوٹی کا وقت ہو چلا تھا میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ نیا تھانے دار ابھی ابھی انگلینڈ سے آیا تھا۔ بہت سخت تھا۔ تھوڑی سی کوتاہی برداشت نہیں کرتا تھا۔ سارے ماتحت اس کی اس سختی سے نالاں تھے۔ اسی کے خوف نے مجھے جلدی جلدی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ابھی چوک تک پہنچا بھی نہ تھا کہ سامنے سے کیشو لال آتا نظر آیا۔

کیشو لال پولیس کا بہت پرانا مخبر تھا۔ اس کی بازار میں مٹھائی کی دکان تھی وہ دکان پر کم بیٹھتا اور لوگوں کی ٹوہ میں زیادہ رہتا۔ آج کل تو اس کی چاندی تھی۔ آئے دن جلسے جلوس اور ہڑتالیں ہوتی رہتی تھیں۔ حکومت کو ایسی خبروں کی پیشگی اطلاع چاہیے اور یہ اطلاعات کیشو لال جمع کر لاتا تھا۔ اسی لیے ہر افسر کو حکم تھا کہ کیشو لال کا خاص خیال رکھا جائے۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچا میں نے پوچھا ”کچھ پریشان نظر آرہے ہو خیر تو ہو؟“

”تھوڑی دیر پہلے میری دکان پر کسی نے بم پھینکا‘ خاصا نقصان ہوا ہے۔ لگتا ہے مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔“

”تم فکر نہ کرو میں بڑے صاحب سے کہہ کر کسی کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔“

”میری دکان تباہ ہو گئی ہے۔ مجھے پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہوگا۔“ کیشو کی آواز بھرا گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”تم فکر نہ کرو میں معاوضہ دلانے کی پوری کوشش کروں گا پھر آج کل میں تمہیں بہت بڑا کمیشن بھی ملے گا۔ تم نے جو خداریوں کو پکڑ دیا تھا اس کا انعام تو تمہیں ملے گا ہی میں مزید رقم دلوانے کی بھی کوشش کروں گا۔ تم صرف ان خداریوں کی بوسو گنتے رہو۔ کہیں بھی کوئی میٹنگ جلسہ یا پوسٹر بازی کا پلان بنے تو ہمیں فوراً بتاؤ۔“ یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

جس وقت میں تھانے میں داخل ہوا تھا نے وارڈنیل سنڈری آچکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی گھڑی پر نظر ڈالی پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ ”اتنی دیر! کہاں مر گئے تھے۔“

”صاحب جی! ہمارا ایک مخبر ہے کیشو لال اس کی دکان پر خداریوں نے دستی بم پھینکے ہیں۔ میں اسی کے بارے میں معلومات جمع کر رہا تھا۔“ میں نے گھکھکیانے کے انداز میں کہا۔

”میں نے سنا ہے تمہارا بیٹا بھی غداران وطن کی جماعت میں شامل ہے۔ غداروں کے جرم میں ملوث ہے؟“

”نہیں صاحب جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا ہوا تو میں اسے خود گولی مار دوں گا۔“

”یہ تو وقت بتائے گا۔“ کہہ کر اس نے فائل کھول لی اور اسے پڑھنے لگا۔

میں ایس آئی مہندر کے ساتھ راولپنڈی پر جانے کے لیے نکل گیا۔ مہندر بلیا ضلع سے آیا تھا۔ اسے یہاں آنے پر خوشی نہیں تھی۔ گھر سے اتنی دور پوسٹنگ کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ جب سے آزادی کی تحریک نے زور پکڑا تھا مقامی افسران کو ریٹائر کر کے باہر کے لوگوں کو علاقے میں بھرا جا رہا تھا۔ باہر سے آنے والے کھلے دل سے نہ آتے۔ گھروں سے اتنی دور پھینک دیے جانے کا غصہ وہ ملزموں پر اتارتے۔ آئے دن تھانوں میں ملزم مرتے رہتے تھے خود مہندر کے ہاتھوں سے کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔ حکومت ہر تحریک کو دبانا چاہتی تھی اسی وجہ سے ابھی تک کسی نے اس سے جواب طلب نہیں کیا تھا۔ اس کے ساتھ راولپنڈی پر جاتے ہوئے مجھے بھی خوف آتا تھا۔ ایک میں ہی کیا، تقریباً سارے مسلمان سپاہی ڈرتے تھے کیوں کہ مہندر ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ انگریزوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے دور کرنے کے لیے ایک نئی جماعت بنائی ہے۔ اس کا نام آرائیں ایس رکھا ہے۔ یہ بھی اس جماعت میں شامل ہے۔ آرائیں ایس والے سخت متعصب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ ٹالاں تھا۔ نفرت کرتا تھا۔

”میاں جی ذرا تیز چلو۔“ مہندر نے آگے بڑھتے بڑھتے رک کر مجھے ڈانٹا۔

میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ ابھی ہم چوک تک پہنچے ہی تھے کہ کیٹھو لال نظر آ گیا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی اشارہ کیا۔ ہم کیبن کی آڑ میں چلے آئے۔ وہ بھی ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی ہم سے بات کرنا اسے نہ دیکھ لے۔

کیبن کی آڑ میں آ کر اس نے کہا۔ ”صاحب جی! شیش محل میں آج میٹنگ ہے۔ علاقے کے سرکردہ غداران وطن جمع ہو رہے ہیں۔“

”کس وقت؟“ مہندر نے پوچھا۔

”آج رات آٹھ بجے میٹنگ ہے۔“ کیٹھو لال نے کہا اور کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”وقت کم ہے چلو تھانے سے مزید نفری لے لیں۔“ مہندر نے کہا اور مڑ گیا۔

ہم تھانے پہنچے تو ڈیٹل سنڈری اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ کوارٹر میں جانے کے بعد وہ بہت کم باہر نکلتا تھا۔ اسے بلانے کی کبھی کسی نے کوشش بھی نہیں کی تھی مگر معاملہ اہم تھا۔ مہندر نے مجھے اس کے کوارٹر میں بھیج دیا۔ میں سہتا ہوا اس کے دروازے پر پہنچا اور ڈرتے ڈرتے دستک دی۔

”کون ہے؟“ ڈیٹل سنڈری کی گرجدار آواز سنائی دی۔

”میں ہوں صاحب جی!“

”کیا بات ہے؟ اس وقت میں مصروف ہوں۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

اس کی مصروفیت کا حال اس کی آواز بتا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کر رہا ہے اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں لوٹ جاتا لیکن معاملہ اہم تھا

بغیر اس کی اجازت لیے پولیس چھاپہ مارنے نہیں جاسکتی تھی اس لیے میں نے دوبارہ دستک دے کر کہا ”صاحب جی معاملہ بہت اہم ہے۔ مہندر جی نے فوراً بلایا ہے۔“

”کیا پاگل ہو گئے ہو۔“ اس نے دروازہ کھول کر پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

دروازہ کھلتے ہی کمرے کا منظر نظروں کے سامنے آ گیا۔ ٹیبل پر ایک بوتل رکھی تھی جو آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ بوتل کے قریب ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا جس میں شراب لبالب بھری ہوئی تھی۔ شراب اس کے مذہب میں جائز ہے۔ اس لیے مجھے حیرت نہ ہوئی۔ حیرت کی بات تو وہ دیسی لڑکی تھی جو قالین پر سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے چہرے پر رنج دالم کی پرچھائیاں تھیں۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ کافی دیر سے رو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پیٹھ موڑ لی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایک مظلوم لڑکی ہے اور اس کا کوئی عزیز کسی بڑے کیس میں گرفتار ہوا ہے۔ وہ اسے چھوڑ دینے کی سفارش لے کر آئی ہوگی۔ ڈنیل سنڈری کو رشوت دے رہی ہوگی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن اس لڑکی کا لباس قیمتی تھا جو اس بات کی عکاسی کر رہا تھا کہ وہ کسی بڑے گھر کی ہے۔ بڑے گھر کے لوگ اس طرح رشوت نہیں دیتے اسی لیے مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ لیکن یہ دقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی مہندر کا پیغام سننا شروع کر دیا۔

اس کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی۔ وہ اس وقت کہیں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس بات سے بھی ڈرتا تھا کہ سی آئی ڈی والوں تک یہ بات نہ پہنچ جائے۔

جب سے ہند کے حالات خراب ہوئے تھے سی آئی ڈی کا نیٹ ورک کافی مضبوط ہو گیا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کا نوٹس لے رہے تھے اور لندن خبر کر رہے تھے۔ اس بارے میں ان کو خبر مل جاتی تو وہ فوراً لندن خبر کر دیتے اور وہاں سے وائسرائے کو ڈانٹ پڑتی۔ اس کا غصہ آئی جی پر اترا تا آئی جی اپنا غصہ ایس پی پر اتارتا اور ایس پی اس کی خبر لے لیتا۔ اسی ڈر سے وہ فوراً ہی تیار ہو کر آ گیا۔ لڑکی اندر بیٹھی رہ گئی۔

ڈنیل سنڈری نے ایس آئی سٹیشن کمار یاد اور مہندر کے علاوہ ٹرک بھر کر سپاہیوں کو ساتھ لیا اور چھاپہ مارنے نکل پڑا۔ میں مہندر اور سریش کے ساتھ جیپ میں سوار تھا۔ یہ ایک نئی جیپ تھی ابھی کچھ ہی دن پہلے ہمارے تھانے کو دو نئی جیپیں دی گئی تھیں۔ یہ جیپ انہی میں سے ایک تھی۔ پہلے والی کھنار اسی بیڈ فورڈ جیپ سے یہ آرام دہ جیپیں بدرجہ بہتر تھیں۔ مجھے تو کار جیسی آرام دہ لگتی تھیں۔ میں اس جیپ میں آرام سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ شیش محل نزدیک آتا جا رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہاں جم کر مقابلہ ہوگا اس لیے میں نے چلنے سے پہلے بندوق کو چیک کر لیا تھا۔ آرڈنس فیکٹری کی یہ بندوقیں کبھی دھوکا نہیں دیتیں۔ پھر بھی میں ہر ہم سے پہلے چیک کر لیا کرتا تھا اور اب اسے گود میں رکھے بیٹھا تھا۔

شیش محل سے کچھ پہلے ہی چوک کے نزدیک ایک گلی میں ڈرائیور نے جیپ موڑ لی اور اسے ایک مکان کی آڑ میں کھڑا کر دیا۔ ”بولتے بولتے وہ سانس لینے کے لیے رکا۔“

”پھر کیا ہوا؟ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پوچھ بیٹھا۔“

نور محمد نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور سلسلہ کلام جوڑا ”جیپ کے رکتے ہی ہم سب نیچے اترے ٹرک بھی کسی گلی میں یا کسی مکان کی آڑ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ سینڈری نے تین پارٹیاں بنائیں ایک کا سربراہ مہندر تھا اور دوسرے کا شیش۔ تیسری پارٹی کو اس نے اپنی کمان میں رکھا تھا۔ اس نے باقی پارٹیوں کو دائیں اور بائیں سے بڑھنے کا حکم دیا اور خود چھ سپاہیوں کے ساتھ شیش محل کی جانب بڑھا۔ میں بھی بندوق سنبھالے اس کے قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھ رہا تھا۔ شیش محل نامی دو منزلہ عمارت کو چاروں جانب سے نرغے میں لے کر سینڈری نے زوردار آواز میں کہا ”اندر جتنے بھی مرد ہیں باہر نکل آئیں ہم نے پوری عمارت کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔“

جواب میں خاموشی چھائی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر ایک بھی ذی روح نہیں ہے۔ سینڈری نے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے اور آگے بڑھا۔ تجمی شیش محل کے درود یوار جاگ پڑے۔ اندر سے کسی نے گولی چلائی تھی۔ ہم سب نے زمین پر لیٹ کر پوزیشن سنبھالی اور جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ ہم زمین پر لیٹے لیٹے سینے کے بل آگے بڑھ رہے تھے کہ میرے برابر میں پوزیشن لیے بیٹھا ایک سپاہی چیخ پڑا۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی موت نے ہمارے سینوں میں آتش فشاں دھکا دیا اور ہم نے گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ ادھر سے بھی پر زور انداز میں جواب مل رہا تھا۔

کئی گھنٹے بعد جب ہمیں اندازہ ہو گیا کی اندر والوں کا ایمونیشن ختم ہو گیا ہے تو ہم نے دفاعی فائر کرتے ہوئے پیش قدمی شروع کر دی اور شیش محل میں داخل ہو گئے۔ شیش محل کی خوب صورت عمارت گولیوں کے نشان سے داغدار ہو گئی تھی۔ اندر کا عالم بھی دگرگوں تھا۔ جا بجا اکھڑا ہوا پلاسٹر بکھرا ہوا تھا۔ مختلف کھڑکیوں کے پاس لاشیں پڑی تھیں۔ کئی نوجوان زندہ گرفتار ہوئے تھے۔ ان میں کچھ زخمی بھی تھے۔ ان زخمیوں میں میرا بڑا بیٹا بھی تھا۔ راشد کو ان غداروں کے درمیان دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔ تھانے دار تو پہلے ہی مجھے مسلمان ہونے کی وجہ سے لٹا رہتا تھا۔ اب تو اسے بہانہ بھی مل گیا۔ وہ مجھے بھی غدار سمجھے گا۔ میں تو محبت وطن ہوں اسی لیے غدار کہلانے سے خوفزدہ تھا۔

ان تمام قیدیوں کو تفتیش کے لیے تھانے لایا گیا۔

میں جانتا تھا کہ اب ان پر کیا گزرے گی۔ اسی لیے تھانے سے نکل آیا تھا اور سامنے والی بھٹیاری کی دکان پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ دکان پر خاصی رونق تھی۔ لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ کئی لوگوں نے مجھے بھی اپنی گفتگو میں شریک کرنا چاہا لیکن میں نے ان کی باتوں میں مطلق دلچسپی نہ لی۔ میرے لاڈلے پر بھی ظلم ہو رہا ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا کیس ہوتا تو میں راشد کو بچانے کی کوشش کرتا مگر وہ تو اس جگہ سے گرفتار ہوا تھا جہاں دیش کے غدار جمع تھے جن کی گولیوں سے ایک سپاہی مارا گیا تھا اور کئی زخمی ہوئے تھے۔

ان کے آٹھ بندے مرے تھے لیکن وہ غدار تھے حکومت سے ٹکرانے والے اس لیے ان کی موت کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔

مجھے وہاں بیٹھے کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ مگر ذہن پر چھائی دھند اب تک صاف نہیں ہوئی تھی۔ دل میں اب تک طوفان مچ رہا تھا۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا سر جھکائے بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی مجھے تلاش کرتا ہوا پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”تمہیں بڑے صاحب بلار ہے ہیں۔“

سینڈری مجھے کیوں بلارہا ہے میں سمجھ گیا۔ وہ مجھے بے عزت کرنا چاہتا ہے۔ مسلمان غدار ہوتے ہیں یہ بتانا چاہتا ہے لیکن جائے بغیر

چارہ بھی نہ تھا اس لیے میں دھیرے دھیرے تھانے کی جانب چل پڑا۔

ڈنیل سنڈری نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”کیوں میاں جی کہاں تھے؟ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔“
”کیوں کوئی خاص کام ہے کیا؟“ میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ان قیدیوں میں سے ایک کو ابھی مجسٹریٹ کے پاس لے کر جانا ہے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی جیب ہے اس لیے تمہیں پیدل ہی جانا پڑے گا۔“ سینڈری نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”کس قیدی کو؟“ میں نے پوچھا۔

”محرر بابو سے مل لو۔ وہ چالان بنا کر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

میں محرر کے پاس پہنچا۔ اس نے چالان کاٹ کر میرے حوالے کیا۔ چالان میں لکھا نام دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ قیدی میرا بیٹا راشد تھا۔

”راستے میں کھلا میدان بھی ہے۔ سنان علاقہ دیکھ کر قیدی کے ساتھی اسے چھڑانے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں اس لیے پوری طرح ہوشیار رہنا۔“ محرر نے مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں کو مروڑا۔

میں ان کمینوں کی کیننگی کو سمجھ چکا تھا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ میں ایک معمولی سپاہی تھا۔ افسر کے حکم کو ٹھکرا نہیں سکتا تھا اس لیے حوالات کی جانب بڑھا۔ اندر کا نقشہ دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ اتنی سی دیر میں ان جلادوں نے قیدیوں کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ تمام قیدی پڑے کراہ رہے تھے۔ ان میں میرا بیٹا بھی تھا۔ اس کے چہرے پر جا بجا ورم تھا۔ نچلے ہونٹ سے اب بھی خون رس رہا تھا جسے وہ بار بار پونچھ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ شاید بال پکڑ کر جھٹکے دیے گئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پکارا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور لپکتا ہوا سلاخوں والے دروازے تک آیا۔ ”ابو آپ؟“

”چلو“ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

تمام قیدیوں کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے راشد کو رہا کر لیا ہے مگر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔

لیکن راشد خاموش نہ رہ سکا اس نے کہا ”میں اکیلا رہا ہونا نہیں چاہتا۔“

”تمہیں گھر نہیں کورٹ لے جانے آیا ہوں۔“

وہاں کھڑے سنتری نے تالا کھولا اور میں راشد کو لے کر باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی تھی اور کمر میں رسا بندھا تھا جس کا سرا میرے ہاتھ میں تھا۔ ہم دھیرے دھیرے تھانے کی حدود سے باہر نکل آئے۔

”ابو..... ابو جی!“ راشد نے پکارا۔

”ہوں!“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”آپ کے دوست بھارگو اور جتندر نے مجھے بہت مارا۔ وہ آپ کو بھی سبق سکھانے کی بات کر رہے تھے۔ ایف آئی آر میں سپاہی کا قاتل مجھے قرار دیا گیا ہے۔ وہ لوگ مجھے مار دیں گے اب!“

میرا گلا بھرا آیا۔ میں جواب دینا چاہتا بھی تو آواز ساتھ نہ دیتی۔ میں خاموش رہا۔

”ابو مجھے فرار ہو جانے کا موقع دے دیں ورنہ میں مارا جاؤں گا اب!“

میں جانتا تھا سینڈری نے اسی لیے مجھے راشد کو ساتھ بھیجا ہے تاکہ میں اسے فرار کرادوں اور وہ مجھے پھانس لے۔ مجھے خدا قرار دے کر

گولی سے اڑا دیا جائے۔ میری بیٹی صبا اور چھوٹے بیٹے ارشد کو جیل میں سزا دیا جائے۔ میری بیوی کو ایذا کمیں دے دے کر ہلاک کر دیا جائے۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ مجھے لحوہ بھر میں فیصلہ کرنا تھا۔ بعض فیصلے بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ بھی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ تھا۔ ایک جانب جوان بیٹا تھا اور دوسری جانب پورا گھرانہ۔ بیوی بچوں کی موت کا انحصار میرے فیصلے پر تھا۔

میدان آچکا تھا۔ ہر طرف ویرانہ تھا اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا اور دل پر پتھر رکھ کر اس کی کمر کی رسی چھوڑ دی اور پھر حکم دیا۔ ”راشد بھاگو“

”لیکن ابو آپ کی نوکری ختم ہو جائے گی آپ کو جیل ہو جائے گی؟“

”بھاگو!“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے یقین تھا سینڈری نے میرے تعاقب میں کسی نہ کسی کو بھیجا ہوگا۔ پھر اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ آزادی تحریک کے جوان بھی گھات میں بیٹھے ہوں گے اور کسی بھی لحوہ ہلا بول سکتے ہیں۔ ان کے چھڑانے سے پہلے ہی میں اسے آزاد کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ ”بھاگو!“

جیسے ہی وہ بھاگا میں نے شانے سے بندوق اتاری شست باندھی اور فائر کر دیا۔ زوردار دھماکہ ہوا اور میرے بیٹے کی پیٹھ میں سوراخ ہو گیا۔ سرخ سرخ خون اچھل کر باہر نکلنے لگا۔ اس کی قمیض لال ہوتی چلی گئی۔ وہ لڑکھڑایا تھا اور گرنے سے پہلے دونوں ہاتھوں کو سہارے کے لیے آگے بڑھا دیا تھا پھر بھی سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے پھر فائر کیا اس بار چیخ نہ نکلی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ اس کے سر کا اوپری حصہ اڑ گیا ہے اور بھیجا قمیض پر پھیل رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ وہ اونٹن سے منہ گرا ہوا تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں حیرت اور استعجاب تھا جیسے وہ پوچھ رہا ہو ”ابو میرا قصور تو بتا دیں؟“

”بیٹے تمہارا یہ قصور ہے کہ تم نے ایک مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولی ہے۔ اور ان مظالم کے خلاف احتجاج کرنا چاہا جو ہم پر رواں ہیں۔ بیٹے! میں نے تمہاری جان لے کر تمہارے بھائی، بہن اور ماں کو غنی جان دی ہے۔ تم اگر زندہ رہتے تو ایذا کمیں سہتے۔ جیل میں تم پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے۔ تمہیں ایذا سے بچانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ میرے بیٹے! اگر میں تمہیں ایذا سے بچانے کے لیے فرار کر دیتا تو تمہارے اس بوڑھے باپ کو

تمہارے بھائی اور ماں، بہن کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔“

میں کافی دیر تک اس کا سراپے زانو پر رکھے بیٹھا رہا۔ میری آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھیں۔ دل کا بوجھ آنکھوں کے

راستے بہہ گیا تو میں اٹھا۔ لاش کو کندھے پر سنبھالا اور تھانے کی جانب چل پڑا۔

بوڑھے باپ کے لیے سب سے مشکل گھڑی وہ ہے جب اس کے سامنے جوان بیٹے کا لاشہ ہو۔ یہاں تو لاشہ میرے کندھے پر تھا۔ جیتے جاگتے بیٹے کو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلایا تھا۔ میرے دل کی کیفیت کیا تھی اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں میری کمر جھک گئی تھی اور آنکھوں تلے اندھیرا تھا۔“

”کیا تم نے اپنے بیٹے کو گولی مار دی تھی اور لاش بھی اٹھا کر لے آئے تھے؟“ حسن آرا گویا اچھل پڑا تھا۔

”جی ہاں میں نے اس عمر میں اس سخت مرحلے کو بھی طے کیا۔ جب کہ اس کی سزا کتنی سخت ملی وہ بھی سنیں۔“ کہہ کر اس نے آنکھیں پونچھیں پھر بولا۔ ”جس وقت میں لاش اٹھائے تھانے میں داخل ہوا تو وہاں ایک زلزلہ سا آگیا۔ شیش اور مہندر دوڑتے ہوئے آئے۔“

”یہ..... یہ کیا ہوا؟“ سینڈری نے پوچھا۔

”سریہ فرار ہو رہا تھا میں نے اسے گولی مار دی۔“ میں نے جواب دیا اس وقت خود مجھے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

”تم نے اسے گولی مار دی! اپنے بیٹے کو قتل کر دیا؟“ سینڈری نے کہا ”میں سمجھ گیا۔ تم جرم کو چھپانا چاہتے ہو۔ اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے ہی تم نے اسے قتل کیا ہے۔ تم پر مقدمہ چلے گا۔“

میں جواب میں کچھ کہتا کہ اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ مجھے لاک اپ میں بند کر دے۔

میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار ٹھہرا۔ مجھے اسی حوالات میں بند کر دیا گیا جس میں آج تک میں دوسروں کو بند کرتا آیا تھا۔

دو دن تک تفتیش کے نام پر میری پٹائی ہوتی رہی۔ وہی لوگ جو کل میرے ساتھی تھے۔ آج مجھ پر تشدد کر رہے تھے۔ مجھے زود کو بکریا جا رہا تھا مگر میں نے اف نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

تیسرے دن مجھے جیپ میں بٹھا کر عدالت لے جایا جانے لگا۔ میرے ساتھی شیش اور مہندر کے علاوہ اور لوگ بھی تھے۔ سینڈری نے مجھے پھانسنے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ مجھ پر الزامات کا طومار باندھا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا ”نور محمد ولد جان محمد کا ٹیبل ۵۰ خفیہ طور پر غداران وطن کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ مسلمان ہے اس وجہ سے مجھے پہلے ہی اس پر شک تھا۔ ہم نے اس کے بارے میں جانکاری حاصل کی تو پتا چلا کہ وہ غدار پارٹی کا ممبر ہے۔ لیکن اس کے بارے میں ابھی تک پکا ثبوت نہیں تھا۔ اسے ساتھ لے کر ہم غداران وطن کو گرفتار کرنے پہنچے۔ کسی طرح اس نے ان غداران وطن کو خبر بھیج دی اور ان لوگوں نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔ ہم نے بھرپور مقابلہ کیا۔ ان کے آٹھ ممبر مارے گئے ہمارا ایک سپاہی سودیش پرکاش کا ٹیبل نمبر ۳۵۶ بھی مارا گیا۔ کئی زخمی ہوئے۔ ہم نے سات غداران وطن کو گرفتار کیا جس میں راشد ولد نور محمد بھی تھا۔ اپنے بیٹے کو تھانے لاتے ہوئے اس نے خود گولی مار دی تاکہ اس کا راز چھپا رہے۔ ایسے غدار کو پھانسی دے دینا چاہئے۔“

ڈیٹل سنڈری سے مجھے یہی توقع تھی۔ وہ تو کب سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کا پکا دشمن تھا۔ صلیبی جنگ کو وہ بھولا نہیں تھا۔ اسی لیے اسے مسلمانوں سے نفرت تھی۔

اسے موقع کی تلاش تھی اور قسمت نے اسے موقع دے دیا تھا۔ خود کو اپنے گھر اور بیوی بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے خود کو جیل میں دھکیل دیا تھا۔ مجھے جیل لے جاتے ہوئے وہ سپاہی جنہیں میں دوست سمجھتا تھا، میرا مذاق اڑا رہے تھے تبھی کیلاش نے وہ بات کہی جسے سن کر میں سکتے میں رہ گیا۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا تھا۔

”اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو سنیل سے پوچھ لو یہ بھی اس دن ساتھ تھا۔“ کیلاش نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”ہاں یار! صاحب نے مجھے بھی موقع دیا تھا بڑا مزہ آیا تھا۔ کرا مارا مال ہوتا ہی چوکھا ہے۔“ کیلاش نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

اس کے انداز نے میری قوت برداشت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اس کیلئے کولات ماری وہ اچھل کر جیب سے نیچے گرا۔

میں نے جھٹکڑی کو پوری قوت سے کیلاش کے سر پر دے مارا اور اپنے سر سے تیسرے سپاہی کو ٹکڑا کر ماری۔

انسان جب اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے تو حقیقت اس کے آگے زندگی کھودیتی ہے۔ میں بھی موت سے بے پرواہ ہو گیا تھا۔ غصے

نے میرے جسم میں برق بھردی تھی۔ میں پاگل ہوا اٹھا تھا اور باز کی طرح جھپٹ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے چاروں سپاہیوں کو بے دم کر دیا۔

ڈرائیور نے گھبرا کر بریک لگا دیا تھا کہ میں نے یادو کی بندوق اٹھائی اور ڈرائیور پر فائر کر دیا۔

گولی نزدیک سے چلی تھی اس کا سر کئی حصوں میں بٹ گیا۔ پھر میں نے پھرتی سے بندوق گھمائی اور کیلاش کے سر میں گولی مار دی۔ سنیل

نے بھاگنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اس پر بھی فائر کر دیا۔ یادو میرے پیروں میں پڑا کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے بھی نہ بخشا اور اس کے ساتھیوں

کے پاس اسے بھیج دیا۔ ان پانچوں کی لاشوں کو وہیں چھوڑ کر میں جیب سے اتر اور ایک جانب بھاگتا چلا گیا۔

میری حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ دہنی ہاتھ میں اب تک جھٹکڑی جھول رہی تھی جس کے رے کو میں نے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا

تھا اور سر پٹ بھاگا جا رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میرے پیرشل ہو گئے۔ میں جانتا تھا اتنی دیر میں شہر بھر کے تھانوں میں زلزلہ آ گیا ہوگا۔ یہ واردات کسی

جنگل بیابان میں نہیں بھری پری سڑک پر ہوئی تھی۔ سینکڑوں آدمیوں نے دیکھا تھا۔ اب تک پولیس کا خصوصی دستہ حرکت میں آچکا ہوگا۔

ابھی میں بڑی سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ ایک موٹر کار نے راستہ روک لیا۔ وہ کار اتنی تیزی سے سامنے آئی تھی کہ میں سنبھل نہ سکا اور اس کی

باڈی سے ٹکرا گیا۔ میں اٹھ ہی رہا تھا کہ کار کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان نے مجھے کار میں گھسیٹ لیا پھر کار اسٹارٹ ہوئی اور بھاگنے لگی۔

کار میں کل دو آدمی تھے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دوسرا پیچلی سیٹ پر جس نے مجھے اندر کھینچا تھا۔ میں نے اس نوجوان کا جائزہ لیا

نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”کوئی خاص چوٹ تو نہیں لگی۔“ نوجوان نے پوچھا پھر اس نے اپنی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ

میں طنچہ تھا۔ میں گھبرا اٹھا لیکن اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ختم نہ ہوئی اس نے اپنا پایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور میری جھٹکڑی والے ہاتھ کو کھانسی سے اوپر

پکڑ کر کھڑکی کے قریب لے گیا اور سیٹنی کچھ ہٹا کے فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ جھٹکڑی کھل گئی۔ میرا ہاتھ آزاد ہو گیا۔

”آپ کون ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”خدا کی فوجدار سمجھ لیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کی بہادری میں نے دیکھی ہے پھر میں آپ کو پہچانتا بھی ہوں اسی لیے مدد کے لیے پہنچ گیا۔“

میں نے جواب نہیں دیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر پوچھا۔

”اب آپ کہاں جاؤ گے؟“

”اپنے گھر!“ میں نے جواب دیا۔

”کس گھر! جہاں آپ رہتے تھے؟ اب وہ گھر راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے۔ آپ کے چھوٹے بیٹے کو سینڈری نے گولی مار دی اور اخبار میں بیان دے دیا کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ آپ کی بیوی معصوم صبا کو بچانے کی کوشش میں جنت سدھاہر گئیں۔ سینڈری اور مہندر جب معصوم صبا کو کھینچ کر لے جا رہے تھے تو انہیں روکنے کے لیے آپ کی بیوی جیپ کے سامنے آگئی تھی۔ مہندر نے ان پر جیپ چڑھا دی وہ اسی وقت مر گئیں۔“

”اب..... اب صبا کہاں ہے؟“

”وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اس پر بار بار غشی کا دورہ پڑ رہا ہے اس لیے ابھی آپ اس سے نہ ملیں تو اچھا ہے۔ علاج مکمل ہوتے ہی ہم آپ کو اس کے پاس لے چلیں گے۔“

”میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میری آواز میں گھگھیاہٹ شامل تھی۔

”صبر کریں اللہ صابرین کے ہمراہ ہے۔“ اس نوجوان نے کہا۔

ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ میرے ہمدرد ہیں لیکن کون ہیں سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ابھی میں اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ کاررک گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک بڑی سی کوٹھی تھی۔ پاس ہی گنگا کا پانی لہریں لے رہا تھا لہروں پر بجزے ڈول رہے تھے۔ مجھے یہ منظر بہت بھلا لگتا تھا مگر آج اس منظر نے بھی اپنی خوبصورتی کھودی تھی۔ میرے اندر ایک آگ سی بھڑک رہی تھی۔ یہ آگ تبھی بجھ سکتی تھی جب اس پر سینڈری، مہندر اور اس کے دیگر ساتھیوں کے لہو کا چھڑکاؤ ہوتا۔

”آئیے! اترے!“ نوجوان نے کہا تو میں نیچے اتر آیا۔

وہ مرکزی دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے میں بھی آگے بڑھتا چلا گیا۔ گیٹ کے بعد روش کو پار کیا اور برآمدے میں پہنچ گیا پھر چق اٹھا کر ہم اندر داخل ہوئے۔

وہ ایک ہال نما کمراتھا۔ اس کمرے کو پار کر کے ہم گیارے میں آئے۔ اس گیارے کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نوجوان نے کہا۔ ”آپ آرام کریں اب کل ملاقات ہوگی۔“

میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے، میں ایک بستر اور کئی کرسیاں رکھی تھیں۔ میں بستر پر دراز ہو گیا۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا

تھا۔ میں سوچے جا رہا تھا کہ ان درندوں سے کیسے مقابلہ کروں، کیسے انہیں جہنم رسید کروں۔

اس دوران میں میں نے صبا کو ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ واقعی وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ ڈاکٹر اسے میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دیتے۔ اس کی حالت کے پیش نظر میں نے بھی اس سے ملاقات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”اب وہ کہاں ہے؟“ حسن آرانے آنسو پونچھتے ہوئے ہو چھا۔

”وہ لوگ اشفاق گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کاکوری ٹرین لوٹ کیس والے اشفاق۔ جنہوں نے ٹرین لوٹ کراٹریزوں کی کمر توڑ دی ہے۔ انہی کے پاس وہ ہے۔ وہیں میری ملاقات شیر بہادر سے ہوئی اور یہ مجھے یہاں لے آئے۔“ نور محمد خان اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا تھا۔

”خان صاحب! آپ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھنے نہ دیں، اسے روشن رکھیں۔ یہ انگریز یہاں صرف لوٹنے اور عزتوں سے کھیلنے آئے ہیں۔“ الفانسو نے کہا۔

”مجھے بھی آپ سے ہمدردی ہے۔ آپ کے ساتھ جو ہوا یہ برصغیر کے ہر علاقے میں ہو رہا ہے۔ انگریزوں کو مسلمانوں سے خاص پر خاش ہے۔ کیوں کہ مسلمان سے انھوں نے حکومت چھینی ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ مسلمان ہی ان سے حکومت چھین سکتے ہیں۔ جتنی بھی تحریکیں اس وقت چل رہی ہیں سب مسلمانوں کے دم سے چل رہی ہیں۔ یہ ہندو تو صرف نام کو تحریک چلا رہے ہیں۔ چندر شیکھر آزاد کے کئی ساتھی مسلمان ہیں جن کے بل پر وہ تحریک چلا رہا ہے۔ اسی طرح کئی دیگر تحریک ہیں جن میں مسلمان کا اہم کردار ہے۔ یہ ہندو تو صرف اپنے نام کے لیے شامل ہو رہے ہیں۔ ایک دو جو واقعی سرفروش ہیں اور محبت وطن ہیں ان کا نام بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ باقی سب تو مسلم دشمنی بھار ہے ہیں۔“ میں نے کسی منجھے ہوئے مقرر کی طرح پوری تقریر کر ڈالی۔ ”آپ کے رہنے کا مسئلہ ہم حل کر دیں گے۔ آپ کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا اس لیے آپ جیسے لوگوں کی ہمیں ضرورت بھی ہے۔“

”شکریہ مگر میں بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ چھپ کر بیٹھنا نہیں چاہتا۔“ نور محمد خان نے کہا۔

”بہت جلد آپ کو موقع مل جائے گا۔ اس لیے کہ ہم بھی وہی چاہتے ہیں۔ وہی کر رہے ہیں جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے ان سے کہا۔

”مگر تم تو.....“ نور محمد کہتے کہتے رک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کہنا چاہتا ہے۔

”نور محمد صاحب۔ ہم اس بھیس میں زیادہ آسانی سے دشمنوں کا شکار کر سکتے ہیں۔ کسی کو ہم پر شک بھی نہیں ہوتا اور ہم اپنا کام کر جاتے ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں ایسا تو ہوتا ہوگا۔ اگر آپ لوگ واقعی سنجیدہ ہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ میں اپنا انتقام لینا چاہتا ہوں۔ اپنے ملک کو ان غاصبوں سے آزاد کرانا اب میرا مشن ہے تاکہ پھر کوئی نور محمد کسی کی سازش کسی کے انتقام کا نشانہ نہ بنے۔“

”اب فی الحال آرام کریں۔ ہم نے اپنے گروپ میں آپ کو شامل کر لیا ہے جیسے ہی کسی مشن پر جائیں گے آپ کو بھی ساتھ لے لیں گے۔“ میں نے دلاسا دیا۔

وہ مطمئن ہو گئے تو میں نے شیر بہادر سے کہا۔ ”آپ ان کو اپنے یہاں ٹھہرائیں۔ دو چار دن میں میں ان کے لیے کوئی انتظام کر دوں گی۔“

”نی الحال تو میں انہی بچوں کے ساتھ ہوں جو خود بھی انگریزوں کے خلاف کارروائی کر رہے ہیں۔“ نور محمد بولے۔

”وہ لوگ بھی ہمارے ہی ساتھ ہیں۔ ہمیں جب کوئی بڑی کارروائی کرنی ہوگی تو دیکھیں گے وہ بھی ہمارے ساتھ نظر آئیں گے۔“

”الفانسو نے ہنستے ہوئے کہا۔

نور محمد شیر بہادر کے ساتھ چلے گئے تو میں نے الفانسو سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے یہ آدمی کام کا ہے؟“

”اس کی کہانی مجھے پہلے سے پتا ہے۔ میں خود مشورے دیتا کہ اسے شامل کر لو۔ جو اندر سے سلگ رہا ہو ایسا آدمی بہت کام آتا ہے۔“

”اب کیا کرنا ہے کام بتاؤ۔“ حسن آرائے سوال کیا۔

”جلدی بتا دو ابھی تک مجھے تو کام دیا ہی نہیں ہے۔ کس کو کاٹنا ہے جلدی بتا دو۔“ مختار کی بات پر حسن آرائے ہاتھ سے اکھڑ گئی۔ اس نے چیخ کر کہا:

”تیرا ستیاناس۔ تجھے کاٹنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام سوچتا ہی نہیں۔“

”مجھے ایک یہی کام آتا ہے اسی لیے میں نے پوچھ لیا۔ اب اگر کسی کو کٹوانا نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ اب تم کہو گی پھر بھی میں نہیں کاٹوں گا۔“

”مختار نے روٹھنے کے انداز میں کہا۔

”فکر نہ کرو ہم تم سے بہت لوگوں کو کٹوائیں گے مگر ابھی وقت نہیں آیا ہے۔“ الفانسو ہنس کر بولا۔

”ایسا کرتے ہیں کل پھر عزیز کے بتائے ہوئے مقام کو چیک کرتے ہیں۔“ میں نے تجویز دی۔

”ہاں یہ سہی ہے۔“ الفانسو بولا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔ کل اسی وقت آؤں گا۔“

اس کے جاتے ہی ہم سب لیٹ گئے۔

☆☆☆

ہم سو رہے تھے۔ عادیانہ دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ اُس نہ بڑھے۔ ہوا آتی رہے۔ آج کی طرح اُس دور میں بجلی کے بچکے تو ہوتے نہیں تھے کہ بٹن دبایا اور گھر گھر شروع۔ کراہوا سے بھر گیا۔ اُس دور میں تو بس دتی، بمبئی، کلکتہ ہی میں ایسے بچکے تھے۔ باقی شہروں، قصبوں میں ہاتھ کے پنکھوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا یا پھر امیر امراء چھت گیر لگاتے تھے یعنی دو ڈھائی گز کا موٹا کپڑا جس کے نچلے حصے میں ڈنڈا اسی دیا جاتا تھا۔ اوپر کا حصہ دو کڑی کے سہارے چھت سے منسلک رہتا تھا اور نچلے حصے کے درمیان میں ڈنڈے سے ایک رستی بندھی ہوتی تھی۔ اتنی لمبی رستی کہ دروازے کے باہر بیٹھا نوکرا سے ڈھیل دے کر کھینچتا رہے اور اندر لیٹے بیٹھے لوگ ہوا کا لطف لیتے رہیں۔ گرمی سے نجات کے لیے میں بھی تاڑ کے پتوں سے بنے بچکے کو جھلٹے جھلٹے سو گیا تھا۔ نیند ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایسا لگا جیسے پسلی پہ کسی نے مگدردے مارا ہو۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا تھا۔ اٹھتے ہی ایک نئی آفتاد آ پڑی تھی۔ گال پر زوردار طمانچہ پڑا تھا۔ کان تک جھنجھٹا اٹھتے تھے۔ اس آواز سے کونے میں سویا ہوا حسن آرا بھی اٹھ گیا تھا۔ اُس نے وہیں سے آواز لگائی تھی۔ ”اے.....! تجھ پر خدا کی مار.....! کیوں ناحق مارے جا رہا ہے؟“

”ابھی تجھے بھی تیرا حصہ ملے گا۔“ مجھے مارنے والے نے کہا۔

”مگر ہوا کیا ہے؟ کچھ منہ سے بھی تو پھوٹ؟ کیا یہ تیری اماں کا خصم ہے جو تو ایسا سلوک کر رہا ہے؟“

”اے.....! گالی بکی تو چٹاؤ پیٹ میں گھسیڑ دیب۔“ اُس نے حسن آرا کو ڈانٹا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”اوے.....! تو بڑا رستم زماں

بت رہا ہے۔ اپنی اوقات میں رہو بیچوڑے کی اولاد.....“

میں نے غصیلی نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ تو بے کی طرح سیاہ رنگت والا تھا۔ اُس کے پیچھے دو اور تھے۔ تینوں کے سر منڈھے ہوئے تھے۔

موٹی گردنیں اور گھٹے ہوئے جسم دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کسی اکھاڑے کے بندے ہیں۔ مجھے مارنے والے کے کان میں چاندی کی ڈیریا تھی

اور ہاتھ میں چاندی کا کڑا۔ وہ سفید براق کرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔ تینتیس چونتیس کی عمر ہوگی۔ اُس کی آنکھوں میں شرارے گوند رہے تھے۔

باقی دونوں عمر میں اُس سے کم تھے۔

”اے.....! ایسے غر کر کیا دیکھتا ہے؟“ اُس نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”ایسے دیکھے گا تو ہم آنکھیں پھوڑ دیت ہیں، بیچوڑا کہیں کا۔ جانت

نہیں ہے ہمارا نام کیسر سنگھ ہے۔ پورے پنڈے میں ہمرا جوڑ نہیں ہے۔ سبھے بچو! ہم بہت اُلٹی کھوپڑی کے ہیں۔ سیدھوں کے ساتھ سیدھے اور ٹیڑھوں

کے ساتھ ٹیڑھے۔“

”تم کیسر ہو یا صندل، ہمیں اس سے کیا۔ ہمارا قصور ہمیں بتا دو کہ ہمیں کیوں مار رہے ہو؟“ میں نے سبھے ہوئے لہجے کی اداکاری کی۔

”ہم دیر سے ہاتھ اٹھاتے ہیں مگر جب اٹھ جاتے ہیں تو پھر زکت نہیں، پھر اپنے بس میں کچھ نہیں رہت، سبھے!“

ہم میں سے کوئی نہ بولا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر اُس نے کہا۔ ”کچھ سنا تم نے؟ ہم کا بول رہے ہیں؟ تم آگ سے کھیل رہے۔ ہم پر پورے

پنڈے کے لوگ بھروسہ کرتے ہیں اسی لیے ہم کو بلاتے ہیں۔ اپنے ویکٹر صاحب ہیں ناں، اُن سے ٹکرانے کی بھول مت کریو۔“

”اچھا تو آپ کو ویکٹر نے بھیجا ہے؟“ میں نے کہا۔

”اور کیا وہ لوگ بڑے جت والے ہیں۔ تم نے اُن کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی، اُن کے آدمی کو جان سے مار دیا۔“

”ارے اُس نے ہم پر حملہ کیا، ہم نے جواب دیا، بات ختم.....!“ حسن آرا بولا۔

میری حیثیت تماشائی کی سی تھی۔ میں خاموش کھڑا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ کیسر سنگھ میری طرف سے بے پروا ہو کر حسن آرا کی طرف

بڑھا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور ساڑھی کے آنچل کو کمر میں لپیٹ رہا تھا۔ کیسر سنگھ اُس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اُس نے حسن آرا کو منگنا

مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ حسن آرا نے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ بیچوڑوں کے جسم میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کیسر کو اس کی

توقع نہ تھی۔ اُس کی گرفت ایسی تھی کہ کیسر اچھلنے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔ حسن آرا نے ذرا بھی توقف نہ کیا اور اُلٹے ہاتھ

سے طمانچہ رسید کر دیا۔ اُس نے طمانچے پر اتکنا نہیں کیا۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اُس نے کیسر کی پنڈلی کے عین درمیان میں پوری قوت سے ٹھوکر رسید

کر دی۔ کیسر سنگھ توازن برقرار قائم نہ رکھ سکا اور ڈگمگاتا ہوا فرش پر لڑھک گیا۔

کیسر کی کچے جتنی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ آنکھوں میں حیرت و استعجاب تھا۔ اُس نے کمر میں اڑ سے ہوئے چاقو کو کھینچا۔ گراری دار چاقو کھلنے کی کرکراہٹ سے کمر اگوں اٹھا۔ پنڈلی کی تکلیف سے اُس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ ہونٹ کے گوشے سے خون کی لالی جھلک آئی تھی۔ اُس نے شعلہ بار لگا ہوں سے حسن آرا کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”بہوت تیجی دکھائی ہے بھیا! بڑی تیجی ہے۔ مجا آگوا۔ کوئی اور وکھت ہوتا تو ہم پر نام کرتے۔ پرکا کریں ہم بھی مجبور ہیں۔ یہ چٹو آب تو پورے کا پورا دستے تک ٹمرے پیٹ میں گھسیڑیں گے۔“ کہہ کر اُس نے چاقو کو سیدھا کر لیا تھا۔ ٹمنچے کی طرح سیدھا نشانہ لینے کے انداز میں تاکہ حسن آرا سیدھے حملہ نہ کر دے پھر اُس نے چاقو کی نوک حسن آرا کے پیٹ پر رکھ دی۔ اگر حسن آرا ذرا بھی مزاحمت کرتا تو چاقو کا پھل اُس کے پیٹ میں اتر جاتا۔ وہ اپنے دفاع کے لیے صرف پیچھے ہٹ سکتا تھا مگر پیچھے ذرا سی بھی جگہ نہ تھی۔ پیچھے دیوار تھی۔

ہر جانب خاموشی تھی۔ ہم سب آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔ حسن آرا بغور کیسر سنگھ کو دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیسر سنگھ کی توجہ منتشر ہونے کا منتظر ہے۔ اُس نے معاً اپنا ایک ہاتھ اس اہتمام سے بلند کیا کہ بہ آسانی ایک قدم دائیں ہٹ گیا۔ اُس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر کیسر سنگھ کی نگاہ جاتی تھی۔ حسن آرا کے ہٹنے سے وہ قدم بھر کے فاصلے پر ہو گیا۔ پھر سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو بلکہ نظر کا دھوکا ہو۔ اُس نے چاقو والے ہاتھ پر گرفت کی اور ساتھ ہی ساتھ زور کا طمانچہ مارا۔ اُس نے طمانچے کی شدت کے لیے ہاتھ ڈھیلا رکھا ہوگا۔ کیسر سنگھ لڑکھڑا گیا۔ حسن آرا نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اُس نے دوسرے ہاتھ سے عجیب انداز میں کیسر کے چہرے پر وار کیا۔ کچھ اس طرح کہ کیسر کا منہ ڈھب گیا۔ اُس کی انگلیاں کیسر کی ناک، آنکھوں اور گالوں میں کھب گئیں۔ وہ ڈر کر اٹھ گیا۔ حسن آرا نے اچھل کر اُس کی ناف کے نیچے گھٹنٹا مارا۔ اُس وار نے اُسے دُہرا کر دیا۔ اُس کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔ دفعتاً اُس کے ساتھی حسن آرا کی طرف دوڑے مگر میں نے انہیں موقع نہیں دیا اور پیچھے سے اُن دونوں کے بال پکڑ کر گھسیٹ لیے اور نہایت پھرتی سے دونوں کے سر آپس میں ٹکرا دیے۔ ساتھ ہی ساتھ ہاتھ پیر سے ضربیں بھی لگائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں زمین پر لمبے لمبے ہو گئے۔

حسن آرا کا شکار بھی نیچے گر پڑا تھا۔ اُس نے اپنے شکار پر گس کر کبک ماری پھر جھک کر چاقو اٹھا لیا۔ اتنے میں مختار بھی آ گیا کہ وہ تو کب سے ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے آتے ہی نعرہ لگایا۔ ”اب تو میں کاٹوں گا بئی کاٹوں گا۔“ ہم اسے روکتے کہ اس نے حسن آرا کے شکار کے ہاتھ پر منہ مارا۔ بتیس دانت بٹھا دئے۔ اس کے دانت کاٹنے ہی اس کا شکار یوں تڑپنے لگا جیسے جانکنی کے عالم میں ہو۔ اس کے منہ سے جھاگ بھی نکلنے لگا تھا۔

وہ لوگ جو ہمارا شکار کرنے آئے تھے اب اس طرح پڑے تھے جیسے مرے ہوئے کینچوے ہوں۔ میں نے حسن آرا کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔ ساڑھی کے پلو کو اُس نے کمر میں اڑس لیا تھا اور اب وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ ”دیکھا، اسے کہتے ہیں بہادری.....“ وہ بولا۔

”فی الحال تو یہ سوچو کہ ان سے نجات کا طریقہ کیا ہوگا اور یہ جسے مختار نے کاٹا ہے اس کا کیا ہوگا؟“

”بہت آسان طریقہ ہے۔ انہیں پانی کے چھینٹے مار کر ہوش میں لاؤ۔ جب یہ ہوش میں آ جائیں تو ان سے کہو کہ اپنے ساتھی کو کندھے پر لا کر سیدھے سیدھے نکل جائیں۔“

میں نے پانی کا کنوڑا اٹھایا اور اُن کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ یہ اُسی کا اثر تھا کہ ایک کے بعد ایک دونوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پانی کے چھینٹے دینے سے پہلے احتیاطاً دونوں کے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ اگر ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو وہ یقیناً حملہ کر دیتے۔ اُن کے تہور یہی کہہ رہے تھے۔ وہ خونخوار نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”شکلہ یو.....!“ اُس نے جواب دیا۔

”ہاں تم تو شکل ہی سے دیولگ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ اُس کے چہرے پر غصے کی جھلک ابھرائی مگر وہ بولا کچھ نہیں، صرف اُس کے چہرے کے تغیر کو دیکھتا رہا، پھر دوبارہ جملہ کسا۔ ”بڑے رعب سے آئے تھے اور بھجروں سے پٹ گئے۔ جب یہ بات لوگوں کو پتا چلے گی تو لوگ کتنا نہیں گئے۔“

میرے اس جملے پر دونوں کے چہرے کی رنگت بدل گئی مگر کسی نے کچھ جواب نہیں دیا تو میں نے پھر کہا۔ ”اب تک جتنے بھی لوگ تم سے دبتے تھے وہ سب مذاق اڑائیں گے، جملے کہیں گے، ان حالات میں تم کیا کرو گے؟ شہر چھوڑ دو گے؟“

”میں کیا کروں گا؟ اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دھوکے سے مار لینا بہادری نہیں ہے۔“ شکلہ یو نے جواب دیا۔

”دھوکے سے یا سامنے سے، کسی بھی طرح تمہیں گرا تو لیا۔ دیکھنے والے ہر حال میں یہی کہیں گے کہ یہ بھجروں سے پٹ گیا ہے۔“

حسن آرا بولا۔

”اس مسئلے کا ایک حل ہے۔“ کہہ کر میں نے اُن کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ سب ہمد تن گوش تھے، سننا چاہتے تھے، اس لیے میں نے سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھایا اور ایک قدم آگے آ کر بولا۔ ”تم نے ہماری قوت دیکھ لی، اب تم سب جس حالت میں ہو، اگر ہم چاہیں تو ابھی تماشا بنا دیں۔ یہاں سے دھکا دیتے ہوئے باہر لے جائیں اور سڑک پر تمہیں لات مار مار کر ناچیں تو دیکھنے والے کتنا لطف لیں گے۔ پورے پٹنے میں تم لوگ اسی طرح بدنام ہو جاؤ گے کہ لوگ دیکھ دیکھ کر ہنسیں گے، آوازیں کہیں گے کہ یہی ہیں وہ لوگ جو بھجروں سے پٹ کر آئے ہیں اس لیے میرا مشورہ ہے.....“ کہہ کر میں نے اُن لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ وہ سب بغور میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”سنو! اگر تم لوگ اپنی عزت بچانا چاہتے ہو، اپنی دھاک قائم رکھنا چاہتے ہو تو نہایت خاموشی کے ساتھ ایک ایک کر کے نکلتے چلے جاؤ۔ بولو، راضی ہو؟“

سب نے ایک ساتھ گردن ہلائی، گویا وہ مار سے زیادہ اپنی بے عزتی سے خوف زدہ تھے۔ میں نے پہلے دُبلے پٹلے شخص کے ہاتھ جو کچھ دیر قبل احتیاطاً باندھ دیئے تھے پھر سے کھولے۔ ہاتھ کھول کر کہا۔ ”سوچ لو، اگر ذرا بھی بد معاشی دکھائی تو پھر تماشا بن جاؤ گے۔“

”نہیں، ہم خاموشی سے جا رہے ہیں اور پھر کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔“ شکلہ یو سنگھ منمنایا۔

”ہاں، یہی عقل مند ہی ہے اپنے اس بے ہوش ساتھی کو اٹھاؤ اور نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ نہیں پہلے ایک بات کا جواب دو۔“

دونوں کی نظریں مجھ پر تنگ گئیں۔ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ۔ ویکٹر کے پاس ایک لڑکی قید ہے مہناز بانو۔ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“
 ”نہیں، ویکٹر صاحب ہم سے کبھی کبھی کام لیتے ہیں۔ ہم کبھی ان کے پاس نہیں جاتے وہی ہمارے اکھاڑے پر آتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے جاؤ۔“

اجازت ملتے ہی اپنے ساتھی کو اٹھا کر وہ دونوں باہر نکلتے چلے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ واقعی ادھر نہیں آئیں گے۔ اُن کے جانے کے بعد نور بیگم نے کہا۔ ”میری شیرنیو.....! اب دروازہ بند کرو اور آ کر سو جاؤ۔ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔ میں تو چلی سونے کو۔ یوں بھی جب وہ مختار کے شکار کو زندہ نہیں پائیں گے تو دوبارہ آ سکتے ہیں۔“

حسن آرانے دروازے کی گنڈی لگائی۔ شاید ایسا پہلی بار ہوا تھا کیونکہ اس سے پہلے ہم نے کبھی دروازے کو بند نہیں کیا تھا۔
 نور بیگم کا مشورہ صحیح تھا کیونکہ اس بار دشمن آتے تو وہ ہوشیار کرنے کی بجائے سیدھے سیدھے ہمارے سینوں میں چا تو اتارتے اسی لیے دروازہ بند کرنے پر اطمینان کا احساس ہوا، ہم تینوں اپنی اپنی جگہ پر دوبارہ لیٹ گئے۔

غیند کس کا انتظار کرتی ہے، بس اُسے قبضہ جمانے کے لیے آنکھیں چاہئیں۔ ہماری آنکھیں بھی بند ہوتی چلی گئیں۔
 ہم بے خبر سو رہے تھے۔ یکا یک آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ دھوپ چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔
 دن کافی چڑھ آیا تھا، تبھی زوردار دستک سنائی دی۔ اب میں سمجھا کہ میری آنکھ کیوں کھلی تھی۔ کوئی باہر سے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کون؟“

”دروازہ کھولیں! میں نواب صاحب کے ہاں سے آیا ہوں۔“ باہر سے آواز آئی۔
 نواب صاحب کا نام سنتے ہی میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ باہر ایک مدقوق سا شخص کھڑا تھا۔ اُس نے پوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہن رکھی تھی۔ سر پر دوپٹی ترچھی ٹوپی تھی۔ پتلی پتلی مونچھیں تھیں جن کا اُس دور میں فیشن تھا۔ میں نے اُسے اندر آنے کے لیے کہا تو وہ بولا۔ ”نہیں، بہت جلدی ہے۔ آگاہانے آپ کو بلایا ہے۔“

”خیریت؟“ میں نے پوچھا۔

”بس چلے! خیریت ہی تو نہیں ہے۔“

”آخر ہوا کیا ہے؟“

”وہیں چل کر پوچھ لیجئے گا۔“

”چلو، میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔“ حسن آرا بولا۔

ہم تینوں نواب صاحب کی حویلی کی طرف چل پڑے۔ آگاہ کی ذات اُس حویلی کے لیے شجر سایہ دار تھی۔ جب بھی کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ مجھے ہی آواز دیتی تھیں۔ اس بار بھی کوئی ایسی ویسی بات ہی ہوئی ہے جیسی انہوں نے مجھے بلایا ہے۔ وہ بات کیا ہوگی، میں اسی پر غور کر رہا تھا اور راستہ طے ہوتا جا رہا تھا۔

اُس وقت ہم گنگا ندی کے کنارے کنارے آگے بڑھ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ ہمیں سنسان راستے سے لے کر چل رہا تھا؟ ابھی ہم نے آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ جھاڑیوں سے آواز آئی۔ ”خبردار! آگے مت بڑھنا! میرے ہاتھ میں ٹمنچہ ہے۔ گولی دل کے پار نکل جائے گی۔“

بولنے والا نہ جانے کس سمت میں تھا وہاں چاروں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ وہ انہی جھاڑیوں میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر کہا۔ ”اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لو اور سیدھ میں چلتے رہو۔“

بولنے والا جھاڑیوں میں سے نکل کر اچانک سامنے آ گیا۔ وہ درمیانے قد کا اور گھٹے ہوئے مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اُس نے صدری اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ منہ دوسری طرف کرنے کا حکم دیا پھر اُس نے محتاط انداز میں میری تلاشی لی اور کمر میں اڑسا ہوا خنجر برآمد کر لیا چونکہ میری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی تھی اُس لیے حسن آرا کی تلاشی کے دوران وہ قدرے غیر محتاط ہو گیا۔ یہی حرکت اُس کے لیے نقصان کا باعث بنی۔ حسن آرا پھرتی سے گھوما اور اُس کی دائیں کلائی پر زوردار ٹھوک ماری۔ اُس کے ہاتھ سے ٹمنچہ چھوٹ کر دور جا گرا اور وہ پلٹ کر حسن آرا سے پلٹ گیا۔ طاقت میں وہ کسی بھی طور سے حسن آرا سے کمزور نہ تھا۔ اُس نے ذرا سی دیر میں حسن آرا کو رگید دیا پھر حسن آرا اُس کی طرح اچھل کود بھی نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ وہ ساڑھی میں ملبوس تھا۔ اس دوران میں اچانک ہی حسن آرا کی گردن اُس کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ جنونی انداز میں اُسے دبائے لگا۔ حسن آرا کی آنکھیں اُبلنے لگی تھیں اور حلق سے گھٹی گھٹی سی کراہ نکلتی لگی تھی۔ اُس کی کراہ نے مجھے ہوش کی دنیا میں کھینچ لیا اور میں نے جھپٹ کر اُس کا ٹمنچہ اٹھا لیا اور اُس کی کٹیٹی پر رکھ کر غرایا۔ ”ہاتھ اوپر اٹھاتے ہو یا میں گولی چلاؤں؟“

آدمی عقل مند تھا اُس نے فوراً ہی حسن آرا کی گردن چھوڑ دی اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے۔ حسن آرا نے گردن مسلتے ہوئے دو چار گہری گہری سانسیں لیں پھر حملہ آور کے تھوڑے پراتنی زور کا گھونسا مارا کہ وہ تیوراً کر زمین پر گر پڑا۔ حسن آرا نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ تباہ توڑ کئی ٹھوکریں بھی رسید کر دیں۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

حسن آرا نے آخری ٹھوک ماری پھر مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود جھاڑیوں میں گھس گیا۔ دوسری طرف کا جائزہ لے کر لوٹا تو بولا۔ ”میں نے اطمینان کر لیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ارے وہ نوکر کہاں گیا جو ہمیں لے کر آیا تھا؟ اس دھینگا مٹی میں ہم اُسے تو بھول ہی گئے تھے۔ اُسے عائب پا کر میں سمجھ گیا کہ وہ ہمیں دانستہ اس سنسان جگہ پر لے کر آیا ہوگا۔ گویا وہ بھی ویکٹر کا آدمی تھا۔ روپیہ بڑی بری چیز ہے۔ اچھے اچھے ایمان والوں کے ایمان کو خراب کر دیتا ہے۔ یقیناً ویکٹر نے اُسے رقم دی ہوگی کہ وہ مجھے لے کر سنسان جگہ پر پہنچے جہاں یہ بے ہوش شخص تاک میں بیٹھا ہوگا۔ یہ ضرور نامی گرامی غنڈا ہوگا تبھی تو اکیلا موجود تھا۔“

اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار فضول تھا اس لیے میں نے حسن آرا سے کہا۔ ”میں ذرا نواب صاحب کی حویلی تک ہواؤں۔“

”نہیں پہلے اس سے پوچھنا چاہیے کہ اسے کس نے ہمارے پیچھے لگایا ہے؟“

”یہ تو کھلی حقیقت ہے کہ پٹنہ میں ہمارا ایک ہی دشمن ہے ویکٹر۔ اُس کے علاوہ اور کون ہمیں قتل کرانا چاہے گا۔“

”کبھی کبھی اندازے غلط بھی ہوتے ہیں۔ یہ کیوں بھول رہی ہو کہ شہر بھر میں افواہ پھیل گئی ہے کہ ہمارے پاس بہت دولت آگئی ہے۔ کوئی

دولت کے چکر میں بھی ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔“

”اگر تمہارا اندازہ صحیح ہے تو یہ پولیس کا مخبر بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں گھیر کر خود ہی حقیقت اُگلوانا چاہتا ہوتا کہ پولیس افسران کو خوش کر سکے۔“

”اسی لیے تو میں حقیقت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن اس کھلی جگہ پر ہم کتنی دیر تک لوگوں کی نظروں سے بچے رہیں گے؟ گز میں نہانے یا حوائج ضروریہ کے لیے کوئی بھی آ سکتا ہے۔“

”وہ ادھر جو کھنڈر نما مندر نظر آ رہا ہے چلو اُس میں اسے لے چلتے ہیں۔ وہاں آرام سے اس سے پوچھنا چھ کر لیں گے۔“

”تو پھر دیر کیسی چلو اُسے گھسیٹ کر لے چلتے ہیں۔“

ہم نے پہلے اُس کے ہاتھ پیٹھ پر باندھے پھر اُسے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا۔ کم بجت بہت وزنی تھا۔ کئی جگہ ٹخا تب جا کر ہم کھنڈر نما مندر تک پہنچے۔ وہ مندر پوری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ نام کی دو تین دیواریں کھڑی تھیں۔ ایک دیوار کے پیچھے لے جا کر اُسے لٹا دیا پھر حسن آرا کی طرف دیکھا۔ وہ باہر جا رہا تھا۔

”اب تم خود کہاں چل دیں؟“ میں نے پوچھا۔

”پانی لانے تاکہ اس کے چہرے پر چھینٹے مار سکوں۔“ کہہ کر حسن آرا گنگاندی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں اسی کا بلاؤز تھا جو پانی میں بھیگا ہوا تھا۔ اُس نے بلاؤز کو بے ہوش شخص کے چہرے پر ٹھوڑ دیا۔ پانی کے چھینٹے گرتے ہی اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“

”جہنم کے دروازے پر۔ اب پوری طرح تیار ہو جاؤ۔ بس کچھ ہی دیر کی بات ہے پھر میں خود تمہیں جہنم میں دھکا دے دوں گی۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً شروع ہو جاؤ۔ ہمیں بتاؤ کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

وہ حقارت سے ہنس کر بولا۔ ”تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو بڑے بڑے سورما میرا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں۔ میں تم زنجوں سے ڈر جاؤں گا۔ اگر ہمت ہے تو مجھ سے کچھ بھی اُگلاؤ کتنی بھی کوشش کر لو تمہیں مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔“

”زیادہ طرزم خاں نہ ہو۔ جو پوچھا جا رہا ہے صرف اُس کا جواب دو ورنہ میرا بھی جواب نہیں ہے۔ میں مُردے سے بھی بہت کچھ پوچھ لیتی ہوں اور وہ فر فر بولنے لگتے ہیں۔“

”تم مجھ سے بھی اُگلاؤ۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”میں شرافت کے دائرے میں رہ کر پوچھ رہی ہوں۔ صحیح بتاؤ کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

اس بار اُس نے کچھ بھی نہ کہا بس خاموش نگاہوں سے ہمیں دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اُس کی مسکراہٹ پر حسن آرا تلملا گیا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے لاتوں گھونسوں کی بارش کر دی۔ وہ شخص ہٹ رہا تھا مگر اُس کے چہرے کی مسکراہٹ کم نہیں ہو رہی تھی۔ اُس کی داہنی آنکھ سو ج گئی تھی۔ ہونٹ پھٹ چکے تھے مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ باقی تھی اور وہ کینہ تو زنجیروں سے باری باری ہمیں گھور رہا تھا پھر اچانک اُس نے زمین پر تھوک دیا جیسے ہمارے چہروں پر تھوکا ہو پھر تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ ”میری بوٹی بوٹی کر دو پھر بھی میری زبان نہیں کھلوا سکتے۔“

حسن آرا بھر کر آگے بڑھا تھا کہ میں نے اُسے روک دیا پھر اُس کے پیچھے پہنچ کر میں نے اُس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور اپنی پنڈلی پر بندھے منجر کو کھینچ لیا۔ یہ منجر الفانسو نے دیا تھا۔ یہ دو دھاری منجرا تاتا تیز تھا کہ اس سے بہ آسانی بال تراشے جاسکتے تھے۔ اس منجر کو ہنری کاٹنے والی چھری کی طرح پکڑا اور اُس کی انگلی پر چیرا لگا دیا۔ درد سے اُس کی چیخیں نکل گئیں مگر وہ منہ سے کچھ نہ پھوٹا۔ اُس کی بلند ممتی دیکھ کر میں بھی حیران تھا اُس لیے زخم کے درد کا اندازہ لگانے کے لیے پیچھے سے آگے آ گیا پھر اُس منجر کو اُس کے کان پر رکھ کر بولا۔ ”اب بھی زبان نہیں کھولو گے؟“

”نہیں.....!“ اُس نے صاف جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تو یہ لو۔“ کہہ کر میں نے اُس کے کان پر منجر چلا دیا۔ اس بار اُس نے چیخ نہیں ماری۔ کمال ضبط سے اُس نے چیخ کو روک لیا تھا۔

”میں اسی طرح تمہارے ایک ایک عضو کو اُس وقت تک کاٹتی رہوں گی جب تک تم زبان نہیں کھول لیتے۔“

”..... تو..... تم بھی سن لو..... میں..... آہ.....“ اُس کی چیخ دور تک گونجی ہوئی کیونکہ اس بار دوسرا کان بھی کٹ چکا تھا۔

”اب باری ہے ناک کی پھر داہنے ہاتھ کی۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

میرا یہ حربہ کامیاب ٹھہرا اور ٹولالنگٹرا بن کر جینے کی اذیت سے بچنے کے لیے اُس نے زبان کھول دی۔ وہ بولا۔ ”میں..... میں پولیس کے لیے کام کرتا ہوں۔ شہر کے غنڈوں میں اونچا مقام ہے۔ چوک میں میری دھاک ہے۔“

”ہمارے پیچھے تمہیں کس نے لگایا ہے؟ ویکٹر نے؟“

”نہیں تمہارے شکار کی سپاری شہر کو توال نے دی ہے۔ اُن کا حکم ہے کہ تم تینوں بھجروں کو ختم کر دوں۔“

”کو توال سے ہماری کیا دشمنی ہے؟“

”کو توال دولت کا دیوانہ ہے۔ جہاں سے اُسے ملے وہ اُس کا ہے اسی لیے اُس نے کسی سے تمہارے قتل کا سودا کیا ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بتاتا رہا اور ہم ہمت تن گوش رہے پھر اُس نے بتایا۔ ”اگر تم لوگ مجھ سے بچ بھی گئے تو وہ کسی دوسرے طریقے سے تم لوگوں کو مروادے گا۔“

”ٹھیک ہے ہم بھی دیکھیں گے۔ فی الحال تم مر جاؤ۔“ کہہ کر میں نے چاقو دتے تک اُس کے پیٹ میں اُتار دیا پھر جھٹکے سے باہر کھینچا اور اُس کے کپڑوں سے اُسے صاف کر لیا۔ وہ مایہ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں اب میں پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

انتہائی شقی القلب بن چکا تھا۔ شاید یہ حالات کا اثر تھا کہ میں اب ناچنے گانے والا نہیں رہا تھا بلکہ مار دھاڑ کرنے والا بن گیا تھا اسی لیے تو اُسے تڑپتا چھوڑ کر حسن آرا کا ہاتھ پکڑے کھنڈر سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ اس قدر زخمی تھا کہ اُس کا بچنا مشکل تھا۔ اب اگر وہ مر بھی جاتا تو ہمیں فکر نہ تھی اُس لیے کہ اُس سے جو کچھ پوچھنا تھا ہم نے پوچھ لیا تھا۔ اُس نے بتا دیا تھا کہ اب ہمارے پیچھے پولیس بھی لگ چکی ہے اور پولیس کا بڑا افسر شہر کو توال ہر گوپال سنگھ نے ہمیں ٹھکانے لگانے کی سازش تیار کی ہے۔ وہ ویکٹر کا یا رخار ہے۔

اب پولیس بھی ہماری دشمن ہو چکی ہے۔ اس اطلاع نے ہمیں گھبرا دیا تھا اسی لیے ہم فوراً ہی چل پڑے تھے تاکہ نور بیگم اور الفانسو کو بتایا جاسکے۔

☆☆☆

”ارے چھوڑو ان باتوں میں کوئی دم نہیں۔ پولیس تو پہلے ہی ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ ویکٹر پولیس سے بھی بڑی چیز ہے۔“ الفانسو نے ہنس کر کہا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”میرے پانچ آدمی ایک اہم کام کے لیے نکل رہے ہیں۔ تم نے بھی سن لیا ہوگا۔ جاپانی بڑی تیزی سے برما کی طرف بڑھتے آرہے ہیں۔ رائل انڈین فورس ان کا راستہ روکنے کے لیے کلکتہ کے راستے برما جا رہی ہے۔ پٹنہ سے ہو کر انہیں گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ انہیں الجھایا جائے۔“

”مگر کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”اے لو! ارے ان کو روکنا ہے تو روکنا ہے۔ فرنگی صاحب بول رہے ہیں تو ان کے ذہن میں کچھ تو ہوگا۔“ حسن آرا نے کہا۔

میں نے سوالیہ انداز میں الفانسو کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس نے صفدر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”صفدر صاحب کو تمام باتیں سمجھا دی ہیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ جائیں گے جنہیں معرکہ کرنا ہے۔ اگر چاہو تو تم لوگ بھی ساتھ جاسکتے ہو۔“

”اے لویہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ ہم تو ہر حال میں جائیں گے اور لڑائی بھڑائی بھی کریں گے۔ اب تو اس میں مزہ آنے لگا ہے۔“ حسن آرا بولا۔

”اور میں بھی جاؤں گا اور دل بھر کر سب کو کاٹوں گا..... یہ ایسے ایسے۔“ مختار جو نہ جانے کب آ کر کھڑا ہو گیا تھا بولنے کے ساتھ اشارہ بھی کرنے لگا کہ وہ کیسے کاٹے گا۔ صفدر اس کی بات پر ہونٹوں کی طرح منہ کھولے تکتے لگا تھا۔

”ہاں اس بار تمہیں دل بھر کر کاٹنے کا موقع ملے گا۔ ہاں بھی اس بار مختار بھی ساتھ جائے گا۔“ میں نے اعلان کر دیا۔

اسی وقت میں نے پارٹی ترتیب دے دی۔ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ صفدر، حسن آرا، مختار، نور محمد اور نور بانو معرکہ آرائی کرنے جائیں گے۔“

”نہیں نور محمد کے لیے ایک اور کام آگیا ہے جسے وہ کرنے میں زیادہ خوشی محسوس کریں گے۔“ الفانسو نے نور محمد کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کون سا کام۔“ میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

”جی میں نے انہیں ایک خاص کام سے بلایا ہے۔“ الفانسو نے نور محمد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میری اطلاع ہے کہ ان کے دو مجرم آج دلی سے آ رہے ہیں۔ سینڈری اور مہندر۔ وہ دونوں چھ بجے والی ریل سے آرہے ہیں، کل یہاں پہنچیں گے۔“ پھر وہ نور محمد سے بولا۔ ”آپ ابھی مغل سرائے پہنچ جائیں۔ وہاں سے اسی ریل پر آنا ہے۔ رات میں آپ ان دونوں سے نمٹ سکتے ہیں۔ کامیابی یا ناکامی کی اطلاع کل ہمیں دے دیں گے۔“

”ضرور۔“ نور محمد نے کہا۔ ”مجھے ایک تیز دھار والا چاقو لے دیں کیوں کہ طمنچہ وغیرہ سے کام لینا میری دانست میں بہتر نہیں ہے۔ گولی کی آواز سے پوری ریل گونج اٹھے گی۔“

الفانسو نے انہیں چاقو دے دیا۔ وقت طے کرنے کے بعد ہم نے انہیں رخصت کیا اور اٹھ گئے اس وعدے کے ساتھ کہ پرسوں صبح سب لوگ تیار رہیں گے۔ صفدر اپنے ساتھ دو مزید لوگوں کو لائے گا جو اس کی طرح وطن پرست ہیں۔ میں بھی الفانسو کے جاتے ہی کمرے میں سونے چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ تو گیا مگر آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ ذہن میں بس ایک ہی سوال تھا کہ پتا نہیں مہناز بانو کس حال میں ہوگی۔ ویکٹر نے اس کے

ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے آنکھیں بوجھل ہو گئیں اور میں نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

اس دن صبح ہی صبح الفانسو پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ صفدر بھی تھا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ تیاری مکمل ہے۔ آج رات ہی رائل انڈین آرمی کے کنوائے کو روکنا ہے۔ اگر ہم نے یہ کام کر لیا تو سمجھو پوری دنیا میں ہمارا نام ہو جائے گا۔ دنیا والے جان لیں گے کہ مقامی لوگ انگریزوں کو پسند نہیں کر رہے ہیں۔

”مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ آزادی کے لیے جو لڑ رہے ہیں یہ ان کا مسئلہ ہے۔ ہمیں تو بس مہناز بانو سے مطلب ہے اس کی رہائی کے لیے کیا کر رہے ہو؟“ میری دماغی روایک بار پھر بہک گئی اور میں نے دو ٹوک بات کی۔

”اس مسئلہ سے منٹ کر کل ہی ہم ویکٹر کے نئے ٹھکانے پر ہلا بولیں گے، کل سمجھ لو وہ آزاد ہوگی۔“ الفانسو نے صفدر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں! ابھی ہم اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔“ صفدر نے تائید کی۔

”صفدر مطمئن ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے ان کو ساتھ چلنے کا اشارہ دے دیا۔

کافی دیر تک ہم حملہ کیسے کیا جائے گا، اس پر بحث کرتے رہیں۔ کیوں کہ اس بار پولیس نہیں فوج سے مقابلہ تھا۔ فوج جس کا کام ہی

لڑنا مرنے ہے۔ بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ تین ٹکڑیاں بنیں گی۔ ایک کی کمانڈ صفدر کرے گا۔ صفدر کے ساتھ نور بیگم جائے گا۔ دوسرے کی الفانسو اور

الفانسو کے ساتھ حسن آرا اور مختار جائیں گے جبکہ تیسرے گروپ کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ میرے ساتھ وہاں کے مقامی لڑاکا بھی رہیں گے جو لڑائی

میں مہارت رکھتے ہیں۔ دانا پور سے پہلے مجھے گھات لگانا تھا اور مجھے اس علاقے کی پولیس کو الجھانا تھا تا کہ جب فوج کے ساتھ معرکہ ہو تو وہ کسی قسم کی

مدد نہ دے سکیں۔ وہاں کوئی انوار شاہ تھا۔ اس نے اچھے خاصے سرفروشوں کو جمع کر رکھا ہے جو ٹرینڈ بھی ہیں۔ ان کی وجہ سے میرا کام آسان ہو جائے

گا۔ اس سے پہلے بھی انوار شاہ دو بار چھپر اشہر کا تھانہ لوٹ چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کے پاس جدید اسلحہ بھی ہے۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ رائل

انڈین فورس کو اسی کے علاقے میں روکا جائے۔

ہم دوپہر کے وقت انوار شاہ کے علاقے میں جانے کے لیے نکل پڑے۔ ہم نے سواری کے لیے تیز رفتار گھوڑے حاصل کر لیے تھے۔

شام کے وقت ہم منزل پر پہنچے۔ مگر ابھی آرام سے بیٹھے بھی نہیں تھے کہ گاؤں سے باہر گولیاں چلنے لگیں۔ گولیوں کی آواز سنتے ہی شاہ جی

کے آدمی مورچہ سنبھالنے دوڑ پڑے۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ پولیس والے کہاں سے ٹپک پڑے۔“

”یہ لوگ پورب میں کمپ لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں آگے کی طرف جانا تھا۔ ہمارے مخبر کے بقول انہیں حکم ملا ہے کہ شہادت پورہ اور اس

گاؤں کی حفاظت لیں۔ ان کے مطابق انہیں دو میں سے کسی ایک میں آزاد ہند فوج کے کمانڈر چھپے ہوئے ہیں۔“

یہ اطلاع میرے لئے خاصی اہم تھی۔ سرفروش کی جماعت تو اسی گاؤں کی تھی۔ ان کے لئے زیادہ خطرہ نہیں تھا جبکہ میرے لئے خطرہ ہی

خطرہ تھا کیونکہ میں یہاں کے لئے اجنبی تھا۔ گاؤں والے کہہ سکتے تھے کہ یہ شخص اس گاؤں کا نہیں ہے اور مجھے گرفتار کر لیا جاتا۔ گرفتاری کا مطلب تھا

موت۔ اب تو مجھے ہر حال میں ان درندوں کو بھگانا تھا۔

”شاید پولیس والے پہنچ گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”شاید نہیں۔ یقیناً باہر مقابلہ ہو رہا ہے۔“

میں نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور گھر سے باہر نکل آیا۔ جلد بازی میں میں غلطی کر بیٹھا۔ گاؤں کی گلیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کون دشمن ہے اور کون دوست اس کی پہچان ناممکن تھی پھر مجھے اس علاقے کے تمام مجاہدین پہچانتے بھی نہیں تھے۔ کوئی بھی دشمن سمجھ کر گولی مار سکتا تھا۔ دو گلیاں پار کر چکا تھا۔ اب لوٹنا بھی آسان نہیں تھا۔ میں اندازے سے اسی گلی میں پہنچنا چاہتا تھا جہاں پر کل صبح غاصبوں سے گاؤں والوں نے دودھ ہاتھ کیے تھے۔

ابھی میں پہلی گلی کے کھڑے تھا کہ دور گلی کے آخری سرے پر تین چار انسانی ہیولے سے نظر آئے۔ میں فوراً ہی لیٹ گیا۔ کھڑے ہو کر ان کی پاس جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ پتا نہیں وہ کون تھے؟ پولیس والے بھی ہو سکتے تھے۔ میں سینے کے بل دھیرے دھیرے کرانگ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کافی آگے جانے کے بعد میں نے بغور دیکھا وہ پولیس نہیں تھے۔ یقیناً دوست ہیں یہ سوچ کر میں نے دھیرے سے آواز دی۔ ”انوار شاہ!“ گلی کے موڑ پر مورچہ لگا کر بیٹھے لڑکوں میں سے کسی نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کون!“

میں نے اپنا نام بتایا اور مزید آگے کھسک گیا۔ ان کے نزدیک جلدی پہنچنا آسان نہ تھا۔ سینے میں کنکریاں چھ رہی تھیں لیکن میں نے توجہ نہ دی اور آگے کی جانب سرکتا رہا تبھی ان میں سے ایک میرے قریب آ گیا۔ اندھیرے میں بھی میں نے پہچان لیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی پولیس والی بندوق۔ میں نے لپٹائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا پھر نسبتاً نیچی آواز میں بولا۔ ”انوار شاہ یا بلال نہیں ہے کیا؟“

”شاہ جی مشرقی سمت کے مورچے پر ہیں۔ چاروں طرف سے گاؤں کو گھیرا گیا ہے۔ جدھر سے پولیس والے آگے بڑھتے ہیں ہمارے ساتھی فائر کر کے اشارہ دے دیتے ہیں۔ مشرقی جانب سے پولیس نے تین بار کوشش کی ہے اسی لئے شاہ جی ادھر گئے ہیں۔“

”اور بلال!“

”بلال آخری مکان کی چھت پر ہے۔ کوئی خاص کام ہے کیا؟“

”مجھے اسلحہ چاہئے۔“

”ان کا نشانہ زیادہ اچھا ہوگا بندوق اٹھالاؤ۔“ کھڑے کھڑے نوجوان نے کہا تھا۔

محمد کلام نامی اس نوجوان نے اپنا ہتھیار مجھے دے دیا اور خود سامنے والے مکان میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد باہر نکلا اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اتنی دیر میں میں گلی کے کھڑے تک پہنچ گیا تھا۔

”بھائی جان ادھر اس منڈیر کے پیچھے پولیس والے مورچہ لگائے بیٹھے ہیں۔“ ایک نوجوان نے کہا۔

اندھیرے کی وجہ سے میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا مگر ہیولے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مضبوط بدن کا جوان ہے۔ اس کے لہجے سے عزم و ہمت جھلک رہی تھی۔

میں اسے دیکھ رہا تھا کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ کلام لڑکھڑا گیا۔ اسے گولی لگی تھی مگر ادھر دیکھنے کا موقع نہیں تھا۔ آٹھ دس سپاہی منڈیر کے عقب سے چھلانگ لگا کر نکلے تھے اور گلی کی جانب دوڑے تھے۔ ابھی تک گلی سے ایک بھی فائر نہیں ہوا تھا۔ ان پر گولیاں چھتوں پر بیٹھے نوجوان چلا رہے تھے۔ اسی لئے انہوں نے گلی کو خالی سمجھا تھا۔ سپاہیوں میں سے دو منڈیر کے پاس ہی لڑھک گئے۔ انہیں چھت پر بیٹھے کسی نوجوان کی گولیوں نے موت کا پیغام دیا تھا۔ ان کے گرنے کے بعد بھی سپاہی رکے نہیں آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔ تبھی میں نے گولی چلائی۔ مزید تین فوجی الٹ گئے۔ میرے برابر میں کھڑے شاہد نامی نوجوان نے بھی فائر کھول دیا۔ آگے بڑھنے والے سپاہیوں نے خود کو زمین پر گرالیا اور ریگلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ انہیں کرائنگ کرتے دیکھ کر میں نے دوسرا فائر اس انداز میں کیا کہ ان کے آگے زمین میں گولیاں پھوست ہو جائیں۔ میری تقلید میں برابر والے نوجوان نے بھی اسی طرح گولیاں چلائیں۔ کئی چیخیں ابھریں اور آگے بڑھتے ہوئے سارے سپاہی رک گئے۔ انہیں رکے دیکھ میرا جوش سوا ہو گیا اور میں نے تواتر سے بندوق چلانا شروع کر دیا۔ بارود ختم ہونے والا تھا۔ میں جوش کے عالم میں یہ بھول گیا تھا کہ بارود ختم ہوتے ہی بندوق صرف ڈنڈے کا کام دے گی۔ یوں بھی وہ بندوق انتہائی پرانے اسٹائل کی تھی۔ اسے توڑے دار کہا جاتا تھا۔ اس کی ٹلی میں بارود بھر کر فائر کیا جاتا تھا۔ مگر میں جوش میں نہایت تیزی سے یہ کام انجام دیئے جا رہا تھا جس کی وجہ سے بندوق کی نال تپ گئی تھی۔

اس جانب سے بڑھنے والے سپاہیوں کی پیش قدمی بھی رک گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ زیادہ تر جہنم واصل ہو چکے ہیں کیونکہ اب فائرنگ بند ہو چکی تھی۔

”بھائی جان کیا خیال ہے آگے بڑھ کے دیکھا جائے؟“ برابر کھڑے نوجوان نے پوچھا۔

”ارادہ تو نیک ہے۔ تم لوگ کور فائرنگ دو میں آگے جاتا ہوں۔“ کور فائرنگ اصطلاحاً اسے کہتے ہیں جو بغیر نشانہ کے اور اندھا دھند کی جاتی ہے تاکہ دشمن دیکر رہیں اور پیش قدمی آسانی سے ہو جائے۔

”ٹھہرے! میں اوپر جا کر جائزہ لیتا ہوں۔“ دوسرے نوجوان نے کہا اور برابر والے مکان میں داخل ہو گیا۔ اس مکان کی چھت پر پہلے ہی کچھ نوجوان مورچہ بنائے پولیس والوں کی ٹانگ میں تھے۔ میں اسی چھت کی جانب دیکھ رہا تھا کہ وہ نوجوان واپس آ گیا۔ اس نے جوشیلے لہجے میں بتایا کہ شاید ہی کوئی انگریزوں کا کتا زندہ ہو۔ جتنے بھی تھے سب جہنم واصل ہو چکے ہیں۔“

”پھر بھی دیکھ لینا بہتر ہے۔ ایسا کرو اب ادھر چلو۔ ادھر سے زیادہ فائرنگ کی آوازیں آرہی ہیں۔“ یہ کہہ کے میں نے فائرنگ کرنے کا اشارہ دیا اور کرائنگ کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سات آٹھ انگریز کے غلام مرے پڑے تھے۔ ان سب کو چیک کرنے کے بعد مزید آگے بڑھا۔ منڈیر کے پاس بھی تین لاشیں تھیں پھر منڈیر کے عقب میں پہنچ گیا۔ راستے میں میں نے ایک مردہ سپاہی کی گن اٹھالی تھی۔ یوں بھی میری بندوق کی نال گرم اور بارود کی تھیلی تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ منڈیر کی دوسری جانب کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر اشارہ دیا۔ گلی میں موجود نوجوانوں میں سے پانچ جوان دوڑ کر میرے پاس آگے باقی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ ان سب کی ٹریننگ خالصے موثر انداز میں ہوئی تھی۔ وہ جنگی اصولوں پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ یوں بھی مورچے کو خالی چھوڑنا عقلمندی نہیں تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ شاہ جی کے ساتھیوں کی گولیاں اپنا خراج وصول کر رہی تھیں پھر بھی مجھے امید نہ تھی کہ یہ مٹھی بھر سرفروش پولیس والوں کو بھگا دیں گے۔ تبھی ایک چھوٹا سا بچہ جس کی عمر بمشکل بارہ تیرہ سال ہوگی، گلی سے دوڑتا ہوا نکلا۔ اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر پولیس والوں نے گولی چلائی۔ لڑکا گرا۔ گرتے گرتے بھی اس نے ہاتھ میں پکڑے پیٹرول بم کو ٹرک پر اچھال دیا۔ ٹرک میں آگ لگ گئی۔ ٹرک کے پیچھے کھڑے پولیس والے ٹرک سے دور ہٹ گئے۔ ہم اسی انتظار میں تھے پیچھے ہٹنے والوں کو نشانہ بنانے لگے۔ اس ننھے فرشتے نے بساط پلٹ دی تھی۔ جیتی ہوئی بازی وہ لوگ ہار گئے تھے۔ انہیں پیچھے ہٹتے دیکھ کر سرفروشوں نے نعرہ بلند کیا۔ گلیوں میں کھڑے نوجوان انہیں دوڑا رہے تھے۔ جس کا بھی پاؤں میدان سے اکھڑ جائے وہ مقابل کے لئے ترنوالہ بن جاتا ہے۔ پولیس والے بھی اب ترنوالہ بن رہے تھے۔

”دوستو! ہم عقب سے غاصبوں کو گھیریں گے۔ مجھے راستہ بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا اسی لئے مرے ہوئے سپاہیوں کے ہتھیار اٹھا لئے تھے۔“ ایک نوجوان نے کہا۔

ہم سب لمبا چمکر کاٹ کے پکی سڑک پر پہنچے۔ سڑک پر قطار سے تین ٹرک کھڑے تھے۔ یقیناً اچھی خاصی تعداد میں پولیس والے آئے ہوئے تھے۔

”کاش میرے پاس ہتھ گولا ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس ہے۔“ اسی نوجوان نے جواب دیا۔

”بچے والے ٹرک پر مارو۔“ میں نے حکم دیا۔

”تین ہیں۔ ایک آپ لے لیں۔“ کہہ کر اس نے ایک گولا میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے گولا لے لیا اور اسے اچھالنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے روکا۔ ”ٹھہریے ایک ساتھ حملہ کریں گے۔“ پھر اس نے تیسرا گولا اپنے ایک ساتھی کو دیا۔ ”بھائی جان اگلے ٹرک پر حملہ کریں گے اور تم سپاہیوں پر مارنا۔“

ہم سب دبے قدموں آگے بڑھنے لگے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ہم سیدھے بھی کھڑے نہیں ہو سکتے تھے مبادا وہ ہمیں دیکھ لیں۔

کچھ دور آگے جاتے ہی اس نوجوان نے اشارہ کیا۔ میں نے دل ہی دل میں سورۃ فتح کی جتنی آیتیں یاد تھیں انہیں پڑھتے ہوئے ہتھ گولا پہلے ٹرک پر اچھال دیا۔ ٹھیک اسی وقت نوجوان نے بھی گولا پھینکا تھا۔ سماعت شکن دھماکوں کے ساتھ آگ کا گولا سا بھرا اور دو ٹرک جلنے لگے۔ ان ٹرکوں میں بھی اسلحہ لدا ہوا تھا۔ کیونکہ دھماکوں کا ایک سلسلہ سا چل پڑا تھا۔ ہم سب سر زمین سے ٹکائے پیٹ کے بل لیٹے تھے۔ گاؤں سے زوردار نعرہ نکبیر سنائی دیا اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ بڑھ گئی۔ شاید پولیس والے بھاگ رہے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو ڈھک رکھا تھا کہ کوئی ٹکڑا کر میرے سر میں نہ لگ جائے۔ اسی حالت میں گردن اونچی کر کے میں نے گاؤں کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ سڑک سے اٹھتے ہوئے شعلوں میں دور دور تک روشنی پھیلا دی تھی اور روشنی میں بھاگتے ہوئے سپاہی نظر آ گئے۔ احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر میں اٹھ بیٹھا اور گن سے ان فوجیوں پر گولیاں برسانے لگا تبھی داہنے جانب سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔

”ہم سرینڈر کر رہے ہیں۔ فارمت کرنا۔“ کسی سپاہی نے چیخ کر کہا۔

میں نے اللہ تعالیٰ کا معجزہ دیکھا۔ وہی غاصب سپاہی جو کچھ دیر پہلے تک طاقت کے نشے میں چور ہم پر گولیاں برسا رہے تھے اب ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے تھے۔

”قتل الموزی قبل الایذار۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے وطن پر قبضہ کرنے میں انگریزوں کو مدد دے رکھا ہے۔ ہمارے بیٹوں کو بلا قصور شہید اور ہماری بیٹیوں کو بے آبرو کر رہے ہیں۔ انہیں معاف نہیں کیا جاسکتا۔“ بڑبڑاتے ہوئے میں نے ان پر ایک کے بعد ایک کئی گولیاں چلا دیں۔ ہاتھ اٹھائے کھڑے سپاہی خاک اور خون میں لوٹنے لگے۔

”بھائی جان ایہ آپ نے کیا کیا۔ جب وہ شکست تسلیم کر چکے تھے تو ان پر گولیاں کیوں چلا دیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”یہ دنیا کی ریت ہے پیارے کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ یہی سلوک یہ لوگ ہمارے بیٹوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے تارچر سیلوں میں جا کر دیکھو بے قصوروں کے ساتھ یہ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ معصوم نوجوانوں کو گھروں سے پکڑ کر لے جاتے ہیں اور انہیں راستے میں اتار کر کہتے ہیں کہ بھاگو۔ جب وہ بھاگنے لگتے ہیں تو ان پر گولیاں برسا دیتے ہیں۔ اس انسانی شکار کا مقصد صرف یہ ہے کہ افسران بالا کو بتائیں کہ ہم نے اتنے آزاد ہند کے فوجی مارے۔ دہشت گرد کہہ کر معصوم نوجوانوں کو شہید کرنے والوں کو معاف نہیں کر سکتا۔“

اتنی دیر میں انوار شاہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہنچ گیا۔ وہ بھی میرے اس اقدام سے رنجیدہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم مسلمان نہتے دشمن پر وار نہیں کرتے۔

میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا کہ ہائے رے مسلمانوں کی انسانیت! اسی انسانیت نے تو پوری دنیا میں مسلمانوں کو شیطانی ٹھکنے میں جکڑ رکھا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بڑھا دو۔ اب تو جوابی طمانچے کا زمانہ آ گیا ہے۔ اسی بھولے پن کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا اور اب ہندو بیٹوں سے سودا کر رہے ہیں۔

”پتا نہیں شہادت پورہ والوں پر کیا گزری۔ میرے منجر کے مطابق دو ٹرک وہاں بھی گئے ہیں۔ وہاں تو لڑنے والے بھی نہیں ہیں۔“ انوار شاہ نے کہا۔

”چلے چل کر دیکھ آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بلال! تم جیب لے آؤ ہم شہادت پورہ جاؤ گے۔“ انوار شاہ نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں جیبیں آ گئیں۔ ہم شہادت پورہ کی جانب چل پڑے۔

مشرق افق پر سرخی پھیل چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سورج نکلنے والا تھا۔ دور کے مناظر بھی اب نسبتاً صاف نظر آرہے تھے۔ ابھی ہم شہادت پورہ سے کچھ دور تھے کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ شہادت پورہ کے بارے میں انوار شاہ کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ گاؤں پر دھوئیں کے مرغولے چکرارہے تھے۔ ان لوگوں نے اس گاؤں پر بھرپور انداز میں غصہ اتارا تھا۔ پتا نہیں کتنے معصوموں کو شہید کر ڈالا ہوگا۔ کتنے بے گناہوں کو گرفتار کر کے

لے گئے ہوں گے۔ راستے میں ہمیں کوئی ٹرک ملا نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ لوگ کسی اور راستے سے لوٹے ہیں۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی میرا دل رو پڑا۔ گلیوں میں بے گور و کفن کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں جوانوں کی تعداد کم اور ضعیفوں کی زیادہ تھیں۔ میں نے ایک کھلے ہوئے دروازے سے اندر جھانکا۔ صحن میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ درمیانی عمر کی اس عورت کے کپڑے شکن آلود اور گردوغبار میں اٹے ہوئے تھے۔ بال بکھرائے وہ سوگواری کے عالم میں بیٹھی تھی۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ چونک کر مڑی اور دوڑتی ہوئی آکر انوار شاہ سے لپٹ گئی۔ ”بیٹا! ہم لٹ گئے۔ تم صحیح کہتے تھے غاصبوں کی نظروں میں ہماری زندگی کی کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ شیم کو وہ لوگ لے گئے ہیں۔ اب میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی۔“ وہ عین کے انداز میں بول رہی تھی۔

”صبر سے کام لیجئے۔“ انوار شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ہمیں دیکھ کر پاس کے گھروں سے لوگ نکل نکل کر آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ اس بھیڑ میں ایک باریش شخص بھی کھڑا تھا۔ اس کے بالوں میں اس طرح سفیدی اتر آئی تھی کہ برف کے گالوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی سفید داڑھی پر جا بجا خون کے چھینٹے تھے کپڑے بھی خون آلود تھے۔ اس شخص کو دیکھتے ہی انوار شاہ نے سلام کیا پھر بولا۔ ”مولوی صاحب! آپ مجھے گرفتار شدگان کی فہرست بنادیں۔ یقیناً کچھ لڑکیاں بھی غائب ہوئی ہوں گی ان کے بارے میں بھی لکھ دیں۔“

”انوار شاہ فہرست تو تمہیں مل جائے گی مگر تمہیں بھی بتانا ہوگا کہ اس گاؤں کو تم نے لاوارث کیوں چھوڑ دیا تھا؟“

”نہیں مولوی صاحب! ہم خود گھرے ہوئے تھے۔ ہم نے پورے پچاس غاصبوں کو ختم کیا ہے۔“

”اللہ تمہیں مزید توفیق دے۔ یہاں تو قیامت آئی ہوئی تھی۔ رات کے دو بجے غاصبوں نے ہمیں گھیر لیا۔ تلاشی کے نام پر ظلم و جبر کا نیا باب کھل گیا۔ تمہیں تو علم ہے گاؤں کے زیادہ تر لڑکے شہر میں مزدوری کرتے ہیں۔ یہاں تو صرف ہمارے جیسے بوڑھے یا عورتیں بچے ہیں۔ پولیس والوں کی دہشت سے عورتوں نے دروازے کھولنے سے انکار کر دیا۔ ظالموں کو انکار کب گوارہ ہے۔ انہوں نے دروازے توڑنا شروع کر دیے۔ مجھے موقع مل گیا تھا میں اپنے حجرے سے نکل کر مسجد میں آ گیا اور سپاہیوں سے رحم کی بھیک مانگنے لگا مگر ان بے رحموں سے نرمی کی توقع کہاں۔ وہ جوتوں سمیت مسجد میں گھس آئے اور مجھے کندوں سے مارتے ہوئے میدان میں لے گئے۔ دو چار لڑکوں نے مقابلہ بھی کیا۔ کچھ بوڑھوں نے بھی ہمت دکھائی مگر ان ٹرینڈ سپاہیوں کے آگے کیسے ٹھہر سکتے تھے۔ ایک ہی لمحوں میں انہوں نے مدافعت کی کوشش ناکام بنا دی۔ تیس بتیس افراد کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ کئی لڑکیاں بھی غائب ہیں۔“ مولوی صاحب نے کہا۔

”اسی وجہ سے میں کہتا تھا کہ گھر گھر تیاری کریں۔ ہم عالم جہاد میں ہیں۔ اسلام اور کفر کی اس جنگ میں ہر مسلمان کو کھل کر حصہ لینا چاہئے مگر آپ کے اقبال صاحب نے ہمیں اس گاؤں میں آنے سے ہمیشہ روکا۔ اگر آج ہم یہاں بھی اپنا دفتر کھول لیتے تو دو چار لڑکے موجود رہتے۔ اس طرح تو گاؤں نہ لیتا۔“ انوار شاہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک بوڑھی عورت دھاڑیں مار کر روتی ہوئی آ گئی۔ اس نے انوار شاہ کے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ”بیٹا! تم صحیح کہتے تھے کاش ہم تمہاری باتیں مان لیتے۔ میرا تو گھر تباہ ہو گیا۔ میں لٹ گئی۔“

”کیا ہوا ماں!“ انوار شاہ نے پوچھا۔

”بیٹا جب وہ لوگ دروازہ توڑ کر اندر گئے تو مقصود سوراہا تھا۔ صبح اٹھ کر اسے کیلے جانا پڑا تھا۔ اب اس گاؤں میں گوشت کی ایک اور دکان کھل گئی ہے اس لئے وہ اچھے سے اچھا گوشت لانے کی کوشش کرتا تھا۔ ابھی اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ دروازے پر ضربیں پڑنے لگیں۔ میں نے اسے دوچھتی میں چھپا دیا۔ ظالموں کا ٹولا اندر گھسا۔ اس نے کونے کونے کی تلاشی لی اسی تلاشی کو دوران میں صنوبران کے ہاتھ لگ گئی۔ میری معصوم بیٹی کو وہ لوگ کھینچ کر لے جانے لگے۔ بھائی کی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا اور وہ چھرا لے کر کود پڑا ایک فوجی کو ختم کرنے کے بعد وہ دوسرے کی جانب لپکا تبھی دوسرے نے فائر کرنے کے لئے بندوق سیدھی کر لی۔ اس نے فائر کیا مگر صنوبر نے اس کی ٹانگ گھسیٹ لی۔ اس کے گرتے ہی نشانہ خطا ہو گیا۔ اور میرے غیرت دار بیٹے نے اسے بھی ختم کر دیا۔ بندوق چل چکی تھی۔ گولی کی آواز پر باہر کھڑے ظالم گھس آئے۔ انہوں نے آتے ہی میرے کڑیل جوان پر گولیاں برسادیں۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ بہن سے یہ منظر دیکھنا نہ گیا اس نے بھائی کا چھرا لیا اور ان کی طرف لپکی۔ انہوں نے اسے بھی ختم کر دیا۔ میری کل کائنات ختم ہو گئی۔“ بڑی بی بیچکیوں سے رونے لگیں۔

”شاہ جی ادھر سبحان نان بائی کو دیکھیں۔ اس پر سکتہ چھا گیا ہے۔“ ایک شخص نے آکر بتایا۔

ہم سب نان بائی کے گھر کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ بھی عام گھروں جیسا ہی چوبی مکان تھا۔ تختوں کو جوڑ کر بنائے گئے اس گھر کے باہری حصے میں اس نے دکان کھول رکھی تھی۔ ہم اس کی دکان پر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ وہ سر پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں افق پر لگی تھیں اور سامنے ایک جوان لڑکی کی لاش رکھی تھی۔ سر پر باندھنے والا کپڑا کھل کر گلے میں پڑا تھا۔ چہرے پر کرب کے آثار نمودار تھے۔

”رات جب فوجیوں نے ظلم کا باب کھولا۔“ ساتھ آنے والے نے بتانا شروع کیا۔ ”اس وقت یہ لوگ بھی سوراہے تھے۔ فوجیوں نے دروازہ توڑنا شروع کیا تو اس بے چارے نے اپنی بیٹی کو تنور میں چھپا دیا۔ تنور ٹھنڈا تھا اور کافی عرصے سے بیکار تھا۔ اس نے سوچا تھا اس تنور کی جانب کسی کا دھیان نہیں جائے گا پھر بھی مزید احتیاط کے طور پر اس نے تنور کے منہ پر میدے کی بوریاں رکھ دیں۔ فوجی اندر آئے۔ چپہ چپہ کی تلاشی لی۔ اس گھر سے انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ وہ غریب تھا اس لئے زیورات نہ تھے۔ بیوی خوبصورت تو تھی مگر عمر واصل چکی تھی اس لیے وہ گالیاں بکتے واپس ہو گئے۔ سبحان خوش تھا کہ اس کی عزت بچ گئی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے بوریاں ہٹائیں۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس نے سمجھا کہ بیٹی کو نیند آ گئی ہے مگر باہر نکالتے ہی حقیقت سامنے آ گئی۔ وہ دم گھٹنے سے مر چکی تھی۔

ایسے خونچکان مناظر دیکھ کر جذبات خود ہی بے قابو ہو جاتے ہیں۔ میں بھی بلک بلک کر رو پڑا تھا۔ کاش مجھے پہلے ہی ان غاصبوں کا اصلی روپ نظر آ جاتا۔ لیکن مجھ پر تو صدیوں کی غلامی کا اثر تھا۔ تبھی تو میں ان کمین فطرت لوگوں کی غلامی کو فخر سمجھتا تھا۔ ناچ گانے میں زندگی گزار رہا تھا۔ میری نیس کھینچنے لگی تھیں۔ مٹھیاں آپ ہی آپ بھینچ گئی تھیں۔ مجھ سے اس معصوم کی لاش دیکھی نہیں جا رہی تھی جسے خود باپ نے عزت کی حفاظت کی خاطر موت کی نیند سلا دیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”آئیے بھائی جان!“ انوار شاہ نے کہا تو میرے خیالات کی روٹوٹ گئی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

لاشیں جمع کی جارہی تھیں۔ مشترکہ نماز جنازہ کے بعد انہیں گنج شہیداں میں دفنایا جانے والا تھا۔

بلال نے کہا۔ ”چلے ہمیں جلد ہی اپنے گاؤں پہنچنا ہے کیونکہ شام تک پولیس والے یہاں کا بدلہ لینے ہمارے گاؤں پر چڑھ دوڑیں گے۔ ہمیں غاصبوں کو راستے میں ہی روکنا ہوگا۔“

میں نے بندوق احمد کو دے دی اور بلال کے ساتھ اسی حویلی میں پہنچا جہاں میرے ساتھ معرکہ آرا نوجوان زخمی حالت میں پڑا تھا۔ اسے اب تک ہوش نہیں آیا تھا حالانکہ گولی اس کے شانے میں لگی تھی لیکن خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا شاید اس لئے اب تک بے ہوش تھا۔

اس کی بیٹیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے وہاں کھڑے ایک نوجوان سے پوچھا۔ ”گولی نکالی گئی؟“

”جی ہاں اب یہ خطرے سے باہر ہیں۔“

تجھی انوار شاہ اندر آیا۔ اسے دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ”اب میرے لئے کیا حکم ہے؟“

”یہاں سے چار میل آگے باجھن پورہ گاؤں ہے۔ ہم وہاں جا رہے ہیں تاکہ پولیس والوں کو راستے ہی میں روک سکیں۔“

”یقیناً پولیس والے اپنا غصہ اس گاؤں کے مکینوں پر اتاریں گے اس پر غور کیا ہے۔“ میں نے انوار شاہ کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔ یہ گاؤں ہمارا ہیڈ کوارٹر ہے اسے بچانا بے حد ضروری ہے۔ اس عمارت میں ایسے کئی مریض

ہیں جنہیں ہم کہیں اور منتقل نہیں کر سکتے پھر یہیں ہم سرفروشن کو خفیہ ٹریننگ بھی دیتے ہیں تاکہ جیسے ہی نیتاجی آواز دیں ہم ان کو پوری مدد دے سکیں۔“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے باجھن پورہ کے آگے مومن آباد ہے؟“

”جی ہاں! اسی راستے سے پولیس والے یہاں آتے ہیں۔“

”مومن آباد کے بعد اک پل ہے؟“

”جی ہاں۔“

”اگر اس پل کو کسی طرح سے اڑا دیا جائے تو یہ علاقہ محفوظ ہو جائے گا؟“

”اس پل پر کڑا پھرہ رہتا ہے۔ دو سپاہی اس طرف دو دوسری طرف اور دو درمیان میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر آنے والے کی تلاشی

لیتے ہیں۔ اگر کسی پر شک ہو جائے تو فوراً اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ اس پل کو اڑانے کے لئے ہمارے کئی ساتھی جان گنوا چکے ہیں۔“

”آپ کا کہنا ہے کہ شام تک پولیس والے آجائیں گے مگر میرا اندازہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ رات تک وہ لوگ مارے جانے والے

سپاہیوں کا انتظار کریں گے لیکن جب وہ پوائنٹ میں نہیں پہنچیں گے صبح کے وقت افسران کو ان کے غائب ہونے کی خبر دیں گے۔ جب افسران بالآخر

انہیں ڈھونڈنے کا حکم دیں گے تجھی وہ لوگ اپنے کمپ سے نکلیں گے۔ اس طرح وہ کل شام سے پہلے یہاں نہیں آئیں گے پھر ان کے آنے کا مقصد

مقابلہ نہیں گمشدہ ساتھیوں کی تلاش ہوگی۔ ہمیں اچھا خاصہ وقت مل رہا ہے تو کیوں نہ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پل کو اڑا دیا جائے۔“

”میں نے بتایا ناں وہاں کڑا پھرہ رہتا ہے۔“ انوار شاہ کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔

”میں اپنے طور پر کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صرف ضروری سامان فراہم کریں۔“

”سامان کی لسٹ دے دیں آپ کو دوپہر تک مل جائے گا مگر ہم یہاں ٹھہر کر آپ کا انتظار نہیں کریں گے۔ شہادت پورہ تک ساتھ جائیں گے اور پھر ہم وہیں مورچہ لگا کر بیٹھ جائیں گے تاکہ آپ کی ناکامی کا اثر اس گاؤں پر نہ پڑے۔“

”آپ کی مرضی مجھے یہ بتائیں کہ پہرے دار پل سے گزرنے والوں کی کس طرح سے تلاشی لیتے ہیں؟“

”جامہ تلاشی کے ساتھ سامان کو بھی اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ پھلوں کی پیٹیاں تک کھلوا دیتے ہیں۔“

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”مجھے بار برداری کا ایک نچر چاہئے۔ اس نچر پر دستکاری کا اتنا سامان ہونا چاہئے کہ وہ لوگ مجھے دکاندار سمجھیں اور ہاں بارود بھی چاہئے۔“

”یہ تمام چیزیں ابھی ایک گھنٹے میں مل جائیں گی۔“ انوار شاہ نے کہاں اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔

میں اس کمرے میں اکیلا بیٹھا لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔ تبھی ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ٹرے پکڑ رکھی تھی۔ چائے کی بھینی بھینی خوشبو نے مجھے ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے مجھے انا بوا کی بات یاد آ گئی۔ وہ کہا کرتی تھیں ہر مسئلے کا حل حقیقی جدوجہد اور کارگزاریوں میں مضمر ہے۔ آئندہ زندگی میں اس کا تجربہ بھی ہو جائے گا تب تمہیں احساس ہوگا کہ یہی طریقہ موثر اور کارگر ہے۔ چائے ختم کر کے میں نے کپ کو ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا انوار شاہ کھڑا تھا۔ اس نے ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا۔

”اس تھیلے میں کیا ہے؟“ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کی مطلوبہ اشیاء اور کچھ زنانہ کپڑے۔ باقی سامان شام تک پہنچ جائے گا۔“

”اگر ممکن ہو تو مجھے ایک نقشہ لادیں۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔“

”نقشہ تو یہیں ہے۔“ کہہ کر وہ دیوار گیر الماری کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ الماری کھول کر اس نے انڈیا میپ ہاؤس دہلی کا روڈ میپ نکالا اور اسے کھول کر ٹیبل پر بچھا دیا۔ آٹھ فٹ چوڑے اس میپ نے میری پریشانی حل کر دی تھی۔ اس نقشے میں ایک ایک تفصیل تھی۔ اس پل کی لمبائی چوڑائی بھی درج تھی۔ نقشے کے مطابق وہ پل ڈھائی سو ہاتھ لمبا تھا۔ اسے انگریزوں نے اپنی آسانی کے لئے تعمیر کیا تھا۔ مسٹر ہاورڈنگ نامی انجینئر نے بڑی جانفشانی اور مہارت سے 1889ء میں اسے بنایا تھا۔ درمیان میں صرف دوستوں تھے جو برساتی نالے کے بچوں بچ استاد تھے۔ وہ ستون بھی لوہے کے تھے۔

”دوسپاہی ادھر اور دو ادھر کھڑے رہتے ہیں۔“ انوار شاہ نے نقشے پر انگلی رکھ کر بتایا۔ ”اور دوسپاہی اس جگہ پل کے وسط میں بنے کیبن میں رہتے ہیں۔ دونوں کناروں پر مستعد سپاہیوں کے پاس بڑی سرکس والی لائٹ بھی ہے جسے وہ اندھیرا ہوتے ہی روشن کر دیتے ہیں۔ سرکس کے باہر لائٹ جیسے گھومتی رہتی ہے یہ بھی ویسے ہی مسلسل گردش کرتی رہتی ہے۔ یہاں پر خود رو قد آدم جھاڑیاں ہیں ان جھاڑیوں پر وہ لوگ خصوصی طور

پر نظر رکھتے ہیں۔ ہمارے دوست تھیوں نے تیر کر پہنچنا چاہا تھا لیکن سرچ لائٹ کی روشنی نے انہیں مات دے دی۔ سپاہیوں نے ان بے چاروں کو دیکھ لیا اور اوپر ہی سے گولی چلا کر شہید کر دیا۔

”آپ بے فکر رہیں۔ میرے لئے لندن والوں نے ابھی تک گولیاں نہیں بنائیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

میری باتوں کو ان سنی کر کے وہ بولا۔ ”یہاں پر ایک چٹان ہے جس کی آڑ لے کر سپاہیوں کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے مگر ایک قباحت ہے۔ گولیوں کی آواز سننے ہی پہرے داروں کے علاوہ نزدیک کے بیرک میں آرام کرنے والے سپاہی بھی دوڑ آتے ہیں۔“ انوار شاہ نے کہا۔

”میں نے اس بات کی کبھی پروا نہیں کی ہے کہ میں موت پر جا پڑتا ہوں یا موت مجھ پر۔ دیکھ لیجئے گا میں پل اڑا کر ہی لوٹوں گا۔“

”اگر ایسا ہو گیا تو سمجھ لیجئے یہ علاقہ سب سے محفوظ خطہ بن جائے گا۔“

میرے عزم کی پختگی نے اسے اطمینان دلادیا تھا۔ اب اس کے لہجے میں وہ بات نہ تھی جو صبح میں نے محسوس کی تھی میں نے اسے مزید اطمینان دلانے کے لئے کہا۔ ”میں پولیس والوں کی نس نس سے واقف ہوں۔“

”اللہ آپ کو کامیاب کرے۔“ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ میں اکیلے کمرے میں بیٹھا مہم کی کامیابی میں درپیش رکاوٹوں پر غور کرتا رہا۔ ان پہرے داروں کی جگہ خود کو رکھ کر غور کر رہا تھا کہ اگر میں ان کی جگہ وہاں پر ڈیوٹی دے رہا ہوتا تو کن کن باتوں پر نظر رکھتا۔ کس طرح آنے جانے والوں کی تلاشی لیتا۔

میں خیالوں میں اس طرح سے ڈوب گیا تھا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور سورج مغرب میں جا کر چھپ گیا۔ باہر ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا میں نے کیروسین لیمپ روشن کر لیا۔ لیمپ جلا کر ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ انوار شاہ لوٹ آیا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”خچر مع ساز و سامان باہر موجود ہے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں۔ ہم جیپ پر سفر کریں گے اس لئے کچھ ٹھہر کر نکلیں گے۔“

میں نے انوار شاہ کی پیشانی چومی اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ ایک بڑا سا تھیلہ میرے کندھے پر تھا۔ اسی تھیلے میں بارود تھا۔ زنانہ کپڑوں کے بنڈل میں بڑی احتیاط سے اسے رکھا گیا تھا۔ خچر پر دو بوریاں لدی ہوئی تھیں انہی کے درمیان اسے بھی رکھ دیا۔ ان بوریوں کے بارے میں انوار شاہ نے بتایا تھا کہ ان میں بھی زنانہ ملبوسات ہیں۔ دوسرے علاقوں کی طرح یہاں کی عورتیں بھی شہر کے دکانداروں کے لئے کشیدہ کاری کا کام کرتی ہیں۔ شہر کے دکاندار ان سے آرڈر کا کام لینے آتے رہتے ہیں اس لئے میں مطمئن تھا کہ سپاہیوں کو بڑی آسانی سے باور کرا دوں گا کہ میں آرڈر کا مال لینے آیا تھا اور اب شہر لوٹ رہا ہوں۔

کس سوال کا کیا جواب دوں گا اس بات پر غور کرتا ہوا میں آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے ماچس تولی ہی نہیں ہے۔ ماچس کے بغیر بارود بیکار تھا اس لئے میں بازار کی جانب مڑ گیا۔ صبح ہی میں نے بازار دیکھ لیا تھا۔ وہ بازار فقط چند دکانوں پر مشتمل تھا۔ ایک دکان پر پہنچ کر میں نے ماچس خریدی تھی میری نظر لائین پر پڑی میں نے اسے بھی خرید لیا۔ لائین میں مٹی کا تیل اور فیتا بھی ڈالوا لیا پھر چائے کی ایک دکان پر بیٹھ کر چائے پی۔ اس طرح اس گاؤں سے نکلتے نکلتے سات بج گئے۔

اتنا لمبا فاصلہ پیدل طے کرنا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں کسی سواری کا انتظام کرتا مگر نچر کی وجہ سے ایسا سوچنا بھی حماقت تھی۔ نچر پر پہلے ہی بہت کچھ لدا ہوا تھا اس لئے میں پیدل چلنے پر مجبور تھا۔

سڑک سنسان تھی۔ دن کے وقت تو اس سڑک پر لوگ نظر آ جاتے تھے مگر رات میں قبرستان جیسی خاموشی چھائی رہتی۔ جب سے علاقے میں پولیس کی بد معاشی شروع ہوئی تھی لوگوں نے بلا ضرورت باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔ شام سے پہلے پہلے یہ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جاتے تھے۔ اسی لئے اتنا سناٹا تھا۔ حد نظر تک پھیلی پہاڑیوں کے دامن میں کالے سانپ کی طرح لہراتی سڑک پر میں بے پروا سا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

”ساری دنیا ایک جیسی ہے۔“ میں نے چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ ”ہر جگہ کی پہاڑیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ خواہ وہ مندارمل کی ہوں یا پیر پنتھی کی یا نالندہ کی۔ شاید دنیا کے ہر علاقے میں ایسی ہی پہاڑیاں ہیں۔ ہر جگہ چڑیوں کی چکارا اور ہواؤں کا شور ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہم کسی بھی علاقے کی پہاڑیوں کے دامن میں بیٹھے ہوں وہ یکساں لگتی ہیں۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کس علاقے میں ہیں کیونکہ پہاڑیوں کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ کوئی تہذیب کوئی رسم و رواج نہیں ہوتے۔ پہاڑیاں تو بس پہاڑیاں ہوتی ہیں۔

انسان خود میں ڈوب جائے تو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ مشقت کا خیال بھی دل و دماغ سے محو ہو جاتا ہے۔ میں بھی سب کچھ بھول گیا تھا۔ راستہ کٹنے کا احساس بھی ختم ہو گیا تھا۔ میں نے آدھے سے زیادہ راستہ طے کر لیا تھا۔ منزل اب قریب آچکی تھی رات کا اندھیرا بھی پھیل چکا تھا۔ میں نے رک کر لائین روشن کر لی۔ سڑک بالکل سیدھی تھی۔ پل پر کھڑے سپاہی کئی میل دور سے روشنی دیکھ لیں، میں یہی چاہتا تھا اور اسی لئے لائین خریدی تھی۔

لائین جلا لینے کے بعد میں نے اپنا سفر پھر سے شروع کر دیا۔ ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ عجیب پر اسرار سی خاموشی تھی۔ ہوا بھی گویا ٹھہر سی گئی تھی۔ اس خاموش فضا میں میرے جوتے کی ٹک ٹک کافی دور تک سنائی دے رہی ہوگی۔ پل اب بھی کئی میل دور تھا۔ اس دوران میں نے سوچ لیا تھا کہ بارود کس طرح لگاؤں گا۔

شہاب پورہ اب نزدیک آتا جا رہا تھا۔ اس چھوٹے سے قصبے کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ اتنا لمبا سفر پیدل طے کیا تھا۔ کچھ دیر اس قصبے میں ٹھہر کر سستالینا چاہتا تھا۔ وہاں گرم گرم چائے مل جائے گی، اس خیال نے میری چال میں تیزی بھردی تھی۔

میں تیز تیز چل رہا تھا کہ سڑک کے آخری سرے پر دو روشن نقطے چمک اٹھے۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ کسی ٹرک کی روشنی تھی۔ اس سڑک پر برائے نام گاڑیاں چلتی تھیں۔ دن بھر میں صرف دو بسیں پنڈے سے آتی تھیں۔ جب سے تحریک آزادی نے زور پکڑا تھا اس سڑک پر پولیس ٹرک بھی چلنے لگے تھے۔ رات کے وقت بس کے آنے کی امید کم تھی۔ زیادہ امید پولیس ٹرک کی تھی۔ پولیس والے مجھے دیکھتے ہی رک جائیں گے اور رات میں سفر کا سبب پوچھیں گے۔ میری تلاشی بھی لیں گے اور ڈائنامیٹ برآمد کر لیں گے۔ اس خیال نے مجھے دہلا دیا تھا۔

میں نے نچر کو چھپی دی وہ رک گیا۔ میں نے جلدی سے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر بارود کی تھیلی باہر نکالی اور اسے ایک پتھر کی آڑ میں رکھ دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے خچر کو پھر تھکی دی۔ وہ دوبارہ چلنے لگا۔ اس بار میں نے اپنی چال نہایت ست رکھی تھی تاکہ زیادہ دور نہ جاسکوں۔ پولیس والے پانچ دس منٹ کے لئے رکتے اور پھر چل دیتے۔ ان کے جاتے ہی میں واپس آ کر ڈائنامیٹ اٹھا لیتا۔

میری نگاہیں نقطوں پر جمی ہوئی تھیں جو اب بہت قریب آ چکے تھے۔ ٹرک کا ہیولا بھی نظر آنے لگا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ اس ٹرک میں پولیس والے نہ ہوں۔ میں عجیب محضے میں پھنس گیا تھا۔ خچر چھوڑ کر بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر بھاگتا بھی تو کتنی دور تک بھاگ سکتا تھا؟ پولیس والے اکیلے خچر کو دیکھ کر شبہ میں گرفتار ہو جائیں گے اور پھر رک کر خچر کے مالک کو ڈھونڈنے لگیں گے۔ میرے پاس اسلحہ بھی نہیں تھا کہ میں ان سے مقابلہ کرتا۔

اتنی دیر میں ٹرک بالکل قریب آ گیا۔ اسے نزدیک سے دیکھتے ہی میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ بار برداری کا ٹرک تھا اور اس پر شہتیر لدے ہوئے تھے۔ شاید کسی ٹھیکے دار کا آرڈر جارہا تھا۔ ٹرک کے گزرتے ہی میں نے خچر کو روکا اور دوڑتا ہوا اس پتھر کے پاس پہنچا جس کے پیچھے بارود چھپایا تھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ شش کی تیز آواز گونجی اور اضطراری طور پر میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

میری قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ اگر ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو میں آج اپنی کہانی سنانے سے محروم رہ جاتا۔ پتا نہیں کب ایک سانپ آ کر تھیلی پر بیٹھ گیا تھا۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں جب میں نے غور سے دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس سانپ کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ اس کے بدن پر پڑنے والی ستاروں کی ہلکی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ وہ دریا کے پانی کی طرح چمک رہا تھا۔

مجھے ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر وہ غصے میں پھن اٹھا۔ اس کا پھن زمین سے ایک فٹ اوپر تھا۔ وہ رہ رہ کر پھنکا رہا تھا۔ میں کیا کروں، کس طرح ڈائنامیٹ حاصل کروں میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں سانپ کو پٹارے میں بند یا بین کی دھن پر ناپتے تو کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن آزاد فضا میں پہلی بار دیکھ رہا تھا اور دل اس طرح اچھل رہا تھا کہ سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہر موئے تن سے ٹھنڈا پسینا پھوٹنے لگا تھا۔ ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نظریں ہٹ نہیں رہی تھیں۔

سانپ نے جھومتے جھومتے پھن مارا تو میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ اس قلیل سے وقفے کا فائدہ اٹھا کر میں اچھلا اور داہنا پیر اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس اقدام سے پہلے میں یہ بھول گیا تھا کہ سانپ اپنی دم سے بھی کام لیتا تھا۔ اس نے میرے پیر کو سرعت سے جکڑ لیا تھا۔ اس کی جکڑ اتنی سخت تھی کہ ٹخنے تک کا گوشت پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ ہڈیاں ٹوٹنے لگی تھیں۔ لیکن میں نے پیر کو ہٹنے نہیں دیا۔ پورے بدن کا بوجھ داہنے پیر پر ڈالے رہا۔ یہ بہت تھوڑا سا وقفہ تھا مگر پل صراط سالگ رہا تھا۔ آخر وہ قیامت کا لمحہ گزر ہی گیا۔ سانپ کی جکڑ دھیرے دھیرے کمزور پڑتی گئی اور پھر وہ رسی کے ٹکڑے کی طرح زمین پر گر گیا۔ میں نے کچھ دیر مزید انتظار کیا۔ جب اس کے بدن میں ذرا سی بھی حرکت محسوس نہ ہوئی تو میں نے پیر اٹھا لیا۔ سانپ مڑ چکا تھا۔ اس اطمینان کے بعد میں نے پتھر کی جانب دیکھا۔ بارود آگے بڑھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ میں نے اسی جانب قدم بڑھا دیئے۔ اس پوٹلی کو اٹھایا اور واپسی کے لئے چل پڑا۔ خچر دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور کچھ ہی دیر میں اس تک پہنچ گیا۔

شہاب پورہ نزدیک آچکا تھا۔ میں نے خچر کا رخ اسی جانب موڑ دیا۔ بازار کھلا ہوا تھا مگر رونق نہ تھی۔ دکانوں پر بیٹھے دکاندار ادگھر رہے تھے۔ کبھی اس بازار کی دھوم ہوا کرتی تھی اور یہاں کی رونق دیکھنے دور دور سے لوگ کھینچے چلے آتے تھے۔ اب اسی بازار پر سوگ کا عالم طاری تھا۔ غاصب انگریزوں اور اس کے درندوں نے اس بازار کا ہی نہیں پوری وادی کا سہاگ لوٹ لیا۔ اب تو ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ ایسی عالم میں کون چہلیں کرے۔ کون گھر سے نکلے؟ میں غم ناک نگاہوں سے بازار کا جائزہ لیتا ایک دکان کی جانب بڑھا۔ مجھے دیکھ کر دکاندار کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے سہوار کے نیچے آگ دھکادی۔ بڑا سا ہتھیل کا سہوار گرم ہونے لگا۔ میرے بیٹھے ہی دکاندار نے سہوار کی ٹوٹی کھولی اور پیالے میں گرم گرم چائے بھر کر میرے سامنے لے آیا۔ میں نے چائے کے اس بڑے سے پیالے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور آہستہ آہستہ پھونک پھونک کر چسکیاں لینے لگا۔

”مسافر ہو؟“ دکاندار نے پوچھا۔

”ہاں!“ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ اس باتونی دکاندار کو بولنے کا موقع دوں۔ زیادہ بولنا بھی خطرناک ہوتا ہے۔ باتوں میں کوئی بھی ایسا لفظ نکل سکتا تھا جو میرے لئے پریشانی کا باعث بن جاتا پھر علاقہ بھر میں مخبروں کالی بھیڑوں کی بہتات تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر دکاندار نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ چائے پی کر میں نے پیسے ادا کئے اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ خچر کو کھونٹے سے کھولا اور پھر سے کچی سڑک پر آ گیا۔ اب پل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پل کا ہیولا دکھائی دینے لگا تھا۔ میں آہستہ آہستہ منزل کے قریب پہنچ رہا تھا۔ تبھی مجھے ایک اہم بات یاد آگئی اور میں نے خچر کو روک لیا۔ تھیلے سے بارود نکالا اور اسے پیٹ پر باندھا اس کے اوپر تہ کی ہوئی چادر باندھی، صدری نما بڈی پہنی، پھر قمیض پہن لی۔ پاجامہ اتار کر ہندوانہ دھوتی باندھ لی تھی تاکہ لوگ مجھے ہندو سمجھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے پھر سے سفر شروع کر دیا۔

پل پر موجود پہرے داروں کے پاس لائیں بھی تھیں جن کی روشنی پھینک کر وہ وقفے وقفے سے آس پاس کا جائزہ لے لیتے تھے۔ میرے خچر سے ہندھی لائین کی روشنی نے انہیں پہلے ہی متوجہ کر لیا تھا اور اب سرچ لائٹوں کا رخ سڑک کی سیدھ میں تھا۔ میں اس روشنی میں نہایا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ ایک کڑک دار آواز کی سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

میں ٹھہر گیا اور وہیں سے بولا۔ ”نحو رہم او ما کانت جوشی ہیں۔“

”کہاں سے آرہے ہو؟“

”جی، ہم آرڈر پر مال بنواتے ہیں۔ پیٹ آج کچھ کھراب ہے اسی لئے جلدی گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔“

”آگے بڑھو!“

میں نے خچر کو تھپکی دے کر آگے کھینچا۔ وہ بھی میرے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں خود پر قابو رکھے ہوئے

تھا۔ اگر انہیں ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو وہ تلاشی پر خصوصی توجہ دیتے اور اسی تلاشی سے بچنے کے لئے میں نے ہندوانہ کپڑے پہنے تھے۔ شہاب پورہ میں داخل ہونے سے پہلے کچی مولیاں بھی کھائی تھیں پھر اس پر چائے پی لی تھی۔ اس کا نتیجہ سامنے آنے لگا تھا۔ پیٹ میں گڑ گڑاہٹ شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کراہتی آواز میں کہا۔ ”بابو صاحب جو پوچھنا ہے جلدی پوچھے میرا شریر ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر غیر محسوس انداز میں ڈکار لی۔ بدبو پھیلی تھی کہ میں نے پیٹ پکڑ لیا۔

”اب کیا ہے؟“ سپاہی نے ڈانٹ کر کہا۔

”تجو راجا جت ہے تو جھاڑیوں سے ہواؤں؟“

ڈکار کی بدبو نے میرے کام کو آسان کر دیا تھا۔ سپاہی نے جیسے ہی تلاشی کے لئے میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھا میں نے پھر کراہتی آواز میں کہا۔ ”تجو راجا جت کریں، صبر نہیں ہوتا۔“

زبردستی کی ڈکار نے سپاہی کے چہرے کی رنگت بدل دی تھی۔ اس نے جلدی جلدی کندھوں سے پیر تک تھپتھپایا اور جانے کی اجازت دے دی۔ قسمت اچھی تھی۔ میری اداکاری نے کام کر دکھایا اور اس نے میرے پیٹ پر ہاتھ نہیں مارا۔ میں نے فخر کی لگام کو پل کے راڈ میں باندھا اور تیز تیز قدموں سے ڈھلان پر اترتا چلا گیا۔

”ذرا دور بیٹھنا؟“ ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔

”جو حکم سرکار“ کہہ کر میں جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا، کچھ آگے جاتے ہی جھاڑیاں ختم ہو گئیں۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس گھپ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں سینے کے بل لیٹ گیا اور سانپ کی طرح رینگتا ہوا پل کی جانب بڑھنے لگا۔ تھیلی کو میں نے پہلے ہی کھول کر ہاتھ میں لے لیا تھا ورنہ اس طرح کراٹنگ کرنے میں کافی پریشانی ہوتی۔

وقت بہت کم تھا۔ اس تھوڑے سے وقت میں سارے کام نمٹانے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر پل کے اوپر دیکھا۔ دونوں سپاہی سرچ لائٹ کی روشنی میں تھیلوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اتنے عمدہ کپڑے دیکھ کر ان کے منہ میں پانی آ رہا ہوگا اور وہ کچھ کپڑے رکھ لینے کی سوچ رہے ہوں گے۔ یہ عام سی بات ہو گئی تھی۔ تلاشی میں جو کچھ ملتا، یہ حرام خور سے مال غنیمت سمجھ کر رکھ لیتے تھے۔ گھروں سے قیمتی اشیاء اٹھالے جانے والوں سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ پورے تھیلے رکھ لیتے۔ جب نا انصافی کا بول بالا ہوتا ہے تو یہی کچھ ہونے لگتا ہے۔ محافظ ہی ڈاکو بن جاتے ہیں۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں زیادہ دیر نیچے رک نہیں سکتا تھا۔ اگر رکتا تو وہ خواہ مخواہ شک میں مبتلا ہو جاتے اور سرچ لائٹ کا رخ ڈھلان پر کر دیتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میں رنگے ہاتھوں دھر لیا جاتا۔ میں نے کچھ اور آگے جا کر اوپر نظر ڈالی میرے سینے اوپر پل کی چھت تھی اور چند قدم کے فاصلے پر پہاڑی ندی کا بہتا پانی۔ گویا اب میں اس جگہ کے بالکل نیچے موجود تھا۔ جہاں کچھ دیر پہلے میں کھڑا تھا۔ میں نے بارود کو دوبارہ پیٹ پر باندھا اور اپنی ستون کے پاس پہنچا پھر کسی بندر کی طرح اوپر چڑھتا چلا گیا۔ میرا سر پل کی چھت کی نچلے حصے سے ٹکرانے لگا تھا۔ ہر ستون کے ساتھ بیٹھنے کی جگہ

بنی ہوئی تھی شاید یہ جگہ مرمت کرنے والے مزدوروں کے لئے بنائی گئی تھی۔ میں اسی جگہ پر بیٹھ گیا پھر پیٹ پر بندھے بارود کی تھیلی کو باندھ دیا۔ فٹیلے کو جوڑنے کے بعد میں نے فٹیلے کے بھاری لچھے کو دانتوں سے پکڑ لیا پھر شہتیر کو جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا، دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور آہستہ آہستہ ہاتھوں کے ذریعے لٹکتے ہوئے کھسکنے لگا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ آپ اس قیامت خیز لمحے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے میری کوشش تھی کہ ہلکی سی بھی آواز نہ پیدا ہو۔ دونوں ہاتھوں پر لٹکتے ہوئے جتنی بار بھی میری نگاہ نیچے بہتے ہوئے پانی پر پڑی تھی، میرا دل کانپ اٹھا تھا۔ ڈیڑھ سو فٹ نیچے گرنے والے کی کیا حالت ہوگی آپ بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔ لیکن میں اس طرف سے توجہ ہٹائے اپنے بھاری بدن کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت فٹیلے کے بوجھ سے مجھے پوری ہتھیلی ہلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر میں ذرا سا بھی منہ کھول دیتا تو فٹیلے کا بندل نیچے گر جاتا اور میری محنت اکارت چلی جاتی۔ فٹیلے کو کھولتے ہوئے میں آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ دوسرا ستون آ گیا۔ اس ستون پر بنی جگہ کے نزدیک پہنچ کر میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور کچھ دیر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے میں ڈائنامیٹ کا دوسرا ٹکڑا بھی اس ستون پر چپکا تا رہا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں نے پھر سے فٹیلے کے بندل کو دانتوں میں پکڑا اور ہوا میں معلق ہو گیا۔ میں اسی طرح آگے کی جانب کھسکتا جا رہا تھا۔ اب میں پل کے درمیانی حصے میں پہنچ چکا تھا۔ پورے ڈیڑھ سو فٹ نیچے پر شور آواز میں اچھلتی، اپنا سر چٹکتی ہوئی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی جو میری ہلکی سی چوک کی منتظر تھی۔ موت کسی بھی لمحے مجھے نکل سکتی تھی۔ میں موت سے بے خطر کسی بازگیر کی طرح ہوا میں لٹکتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور پھر وسطی ستون تک پہنچ گیا۔ کل چھ تھیلیاں لٹکا چکا تھا۔ یہ آخری تھیلی تھی۔ ابھی میں اسے فٹ کر رہی رہا تھا کہ پل کے اوپر سے سپاہی چیخا۔ ”ابے اوکھے کی اولاد کہاں مر گیا؟“

میں نے کام کی رفتار مزید تیز کر دی۔ مشینی انداز میں کام کرتے ہوئے میں ایک ہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ لوگ میری تلاش نہ شروع کر دیں۔

آخری ٹکڑے کو شہتیر سے چپکانے کے بعد میں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ہوا میں معلق ہو کر آگے سرکنے کی کوشش نے میری بازوؤں کے پٹھوں میں کھنچاؤ پیدا کر دیا تھا۔ کندھا اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پورا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ تھیلی بھی گیلی ہو رہی تھی۔ کسی بھی لمحے میں پھسل کر موت کے جبرے میں سما سکتا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میری ساری محنت برباد ہو جاتی اسی لئے میری ایک ہی دعا تھی کہ جلد سے جلد کنارے پر پہنچ جاؤں۔

آگے ہی آگے لٹکتے ہوئے بڑھتا رہا بالآخر میں پہلے ستون تک پہنچ گیا اور پھسلتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اب صرف ماچس جلانے کی دیر تھی مگر میں کھلی جگہ میں کھڑے ہو کر ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا اس لئے پھر سینے کے بل لیٹ کر آگے کی جانب ریٹگنے لگا۔ سپاہی نے دوبارہ آواز دی اور پھر سرچ لائٹ کا رخ ڈھلان کی جانب کر دیا۔ اب میرا کام مزید دشوار ہو گیا تھا۔ کسی بھی لمحہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ اس خوف نے میری جسم میں بجلی سی بھری اور میں نہایت تیز رفتاری سے آگے کی جانب سرکنے لگا۔ جھاڑیاں اب بھی دور تھیں۔ کسی بھی لمحے سرچ لائٹ کا روشن دائرہ مجھے اپنے گھیرے میں لے سکتا تھا۔ تبھی میں نے ایک پتھر اٹھا کر جھاڑیوں کے پار پھینکا۔ پتھر گرنے کی آواز پر روشن دائرہ اس جانب مڑ گیا اور میں اٹھ کر دوڑتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔ فٹیلے کا آخری سرا اب بھی میری چٹکی میں تھا۔ میں نے ماچس جلائی اور اس سرے پر لگا دی۔ جس طرح سانپ دوڑتا ہے اسی طرح فٹیلے کی

چنگاری دوڑتی چلی گئی تھی۔ اب مجھے بھی دوڑنا تھا۔

میں پھرتی سے جھاڑیوں سے نکلا اور پل کی مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ شاید میری احتیاط بیکار گئی تھی۔ کسی سپاہی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ ٹھائیں کی ایک تیز آواز ابھری تھی اور گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے مگر میں خود کھڑا نہ ہوا اور دوڑتا ہی رہا۔ ابھی اس گولی کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک زوردار دھماکا ہوا اور پھر ایک سلسلہ سا چل پڑا میں نے دوڑتے ہوئے سر گھما کر دیکھا پل کے پرچے اڑ رہے تھے۔

اس کامیابی نے میرا سینہ پھلا دیا تھا۔ سرفروشنوں کا کام بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت کافی محفوظ ہو گئے تھے۔ اسی سوچ میں غلطاً میں تیز تیز قدموں سے شہاب پورہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انوار شاہ نے بھی دھماکے سن لئے ہوں گے اور اب ادھر ہی آ رہا ہوگا۔ اس کے پاس جیپ ہے میں پیدل سفر کی کوفت سے بچ جاؤں گا۔

ابھی میں نے بہت تھوڑا سا راستہ طے کیا تھا کہ ہیڈ لائٹ کی چمک نظر آئی۔ میں خوش ہو کر وہیں سڑک کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ گاڑی لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ تبھی میرے دماغ میں ایک نئی بات آئی اور میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ گاڑی پولیس والوں کی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ دھماکے کا سبب جاننے کے لئے آ رہے ہوں گے۔ مجھے یوں سنسان رات میں سڑک کے کنارے بیٹھا دیکھ کر وہ شبہ کے تحت گاڑی روک لیں گے۔ اگر کوئی جاننے والا نکل آیا تو غضب ہو جائے گا۔ میں پریشان ہوا اٹھا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور گاڑی نزدیک آتی جا رہی تھی۔ ہولے سے میں نے پہچان لیا تھا وہ جیپ تھی، جیپ پر پولیس والے بھی سفر کرتے ہیں اور عام شہری بھی۔ یہ جیپ کس کی ہوگی، اتنا سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ڈھلان کی جانب دوڑ لگا دی کچھ نیچے اتر کر لیٹ گیا۔ میں لیٹے لیٹے اس جیپ کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ جیپ اب بہت قریب آ چکی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی جیپ قریب سے گزری میں چیخ اٹھا۔ ”انوار شاہ!“

جیپ جھٹکے سے رک گئی۔ اندر بیٹھے لوگوں نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ میں اب کھڑا ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور جیپ سے اتر رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا اوپر پہنچا انوار شاہ نے ہانپیں پھیلا کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

”آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ اب ہم کئی سال کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس پل کے ٹوٹ جانے سے نہ صرف ہمیں بلکہ گاؤں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔“ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے جا کر جیپ میں بیٹھ گیا۔

جیپ نے یوٹرن لیا اور واپس گاؤں کی جانب چل پڑی۔ گاؤں میں پہنچ کر انوار شاہ نے پوچھا۔ ”آپ ہیڈ کوارٹر میں ٹھہریں گے؟“

”پہلے میں کلام سے ملوں گا۔“

”ہمارے خیال سے اسے ہوش آ گیا ہوگا۔ چلے میں بھی ان سے مل لوں گا۔“

ہم اسی عمارت میں پہنچے جس میں کلام کو رکھا گیا تھا۔ دو کمروں کو پار کرنے کے بعد ہم کلام والے کمرے میں پہنچے۔ کمرے میں مٹی کے تیل کا لیپ روشن تھا۔ لیپ کی زرد روشنی میں کلام کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ آہٹ سنتے ہی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی جھلک آئی۔

”کیسے ہو کلام!“ میں نے پوچھا۔

”خدا کا شکر ہے۔“ اس نے پیوں میں جکڑے بائیں کندھے پر دایاں ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ہمارے خیال میں دو تین روز میں یہ بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر ٹگلیل نے بتایا ہے کہ زخم تیزی سے بھر رہے ہیں۔“ انوار شاہ

نے کہا۔

”میں تو لیٹے لیٹے تنگ آ گیا ہوں۔“ کلام بولا۔

”تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ میں میدان جہاد سے لوٹا ہوں۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے پھر کپڑے بھی گندے ہو چکے ہیں میں تو

نہانے چلا۔“ کہہ کر میں باہر جانے کے لئے مڑ گیا۔

نہادھو کر میں تیار ہو گیا۔ یوں بھی اب یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ مجھے جو کام سونپا گیا تھا وہ میں نے کر دکھایا تھا۔ اس لیے میں نے باہر آ کر

شادی سے کہا کہ وہ میرے جانے کا انتظام کرے، مجھے پنشن میں کچھ ضروری کام ہے۔

وہ مجھے روکنا چاہتا تھا مگر میں رکنا نہیں اور اسی وقت ایک موٹر میں بیٹھ کر پنشن چل پڑا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ صفدر اور الفانسو نے کیا کام کیا۔

پنشن پنشن رات ہو گئی تھی۔ میں اپنے گھر میں پہنچ کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ حسن آرافانسو کے ساتھ تھا اور نور بیگم صفدر کے

ساتھ اس لیے گھر خالی پڑا تھا۔ میں سونے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ وہ سب بھی لوٹ آئے۔ ان کی زبانی پتا چلا کہ رائل انڈین فورس کا راستہ تبدیل کر

دیا گیا ہے۔ اب برما کے لیے وہ دستہ جائے گا جو مشرقی بنگال کے شہر ڈھاکہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں تو کامیاب

لوٹا ہوں۔ تم لوگوں کی قسمت میں جنگ نہ تھی۔“

ان سب کے ہونٹوں پر شکست خوردہ ہنسی پھیل گئی۔ ان کی ہنسی میں مجھے طنز نظر آیا جیسے وہ کہہ رہے ہوں، ہم تو صرف تمہیں مہناز کی آزادی

کے خیال سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی میرے اندر ہوک سی اٹھی اور میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا ”میں اب اکیلے اپنی

جنگ لڑوں گا۔ مہناز کو آزاد کرادوں گا۔“

”ارے بھائی تم یکا یک جذباتی کیوں ہو جاتے ہو۔ ہم سب کا مقصد ایک ہے۔ اس کے ساتھ اگر دوسری ذمے داری بھی نبھالیا جائے تو

برائی کیا ہے۔“ الفانسو نے کہا۔

”مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ مہناز کے بارے میں کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہے۔“ میں نے صفدر کی طرف دیکھ کر کہا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

شاید اسے میری بات بری لگی تھی۔ بہن اس کی تھی اور شور میں مچا رہا تھا۔ اس بیچارے کو کیا پتا کہ اصل ذمے داری مجھ پر ہے کہ میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔

”اب میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ان لوگوں نے کسی کو کاٹنے ہی نہیں دیا۔“ مختار نے مسکین صورت بنا کر کہا۔ اس کے انداز پر وہ

سنجیدگی جو سب کے چہروں پر اتر آئی تھی یکا یک مسکراہٹ میں بدل گئی۔

”ٹھیک ہے کل رات ہم ویکٹر کی نئی حویلی پر چڑھائی دیں گے۔ اب غصہ تھوک دو۔“ الفانسو نے کہا تو میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا آیا۔

☆.....☆

ہم سب ایک کے بعد ایک اس حویلی کی دیوار پھاند گئے۔ اطلاع مصدقہ تھی کہ ویکٹر نے اس حویلی میں اپنے آدمیوں کو ٹھہرایا ہے۔ انہی لوگوں سے ٹھننا تھا۔ مہناز کا پتا معلوم کرنا تھا۔ میرے ساتھ حسن آرا تھا۔ مختار اور نور بیگم تھا۔ اس معرکہ کو ہمیں اکیلے سر کرنا تھا۔ الفانسو کا سہارا نہیں لینا تھا۔ اسی لیے ہم خود اسے بتائے بغیر آگئے تھے۔

حویلی کے اندر کودتے ہی مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ گوکہ اب تک کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ مگر میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ گڑبڑ کہاں ہے اس کا ادراک نہیں ہو پایا تھا۔ تبھی ہم نے اندر کی طرف قدم بڑھایا۔ اس گھر کے مکین یا تو بہت لا پرواہ تھے یا انہیں اپنے زور بازو پر بہت بھروسہ تھا۔ چبوترے پر چڑھتے ہی پاؤں پاٹ کھلا دروازہ نظر آیا تھا۔ ہم بلا جھجک اندر داخل ہو گئے۔ مجھے ڈر تھا تو مختار سے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے بول پڑتا ہے۔ اگر وہ بول پڑا تو آواز دور تک گونج جائے گی۔ لیکن وہ خلاف توقع خاموش تھا۔ ہم سب دبے پاؤں اندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ میں گلیارے کو پار کر کے ڈرائنگ روم تک پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ باہر سے کسی خونخوار کتے کی وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ ایک فائر کی آواز گونجی اور پھر اچانک ہی پرسکون فضا گولیوں کے وحشیانہ شور سے لرز اٹھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میرے دشمن شاید تربیت یافتہ کتے کے ساتھ منتظر تھے۔

فائر کی آواز سنتے ہی میں نے نور اور حسن آرا کو باہر کا مورچہ سنبھالنے کا حکم دیا وہ ادھر بھاگے۔ غراتے ہوئے کتے نے مشتعل ہو کر بھونکن شروع کر دیا تھا۔ اُس کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ برآمدے میں یا اُس کے قریب ہی موجود ہے اور اپنی قوتِ شامتہ کی مدد سے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ اُسے کدھر جانا ہے۔ شاید میرے بدن کی بو نے اُس کتے کی مدد کی تھی۔ جوں ہی میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچا تھا کہ ایک قد آور سیاہ کتا میرے اوپر آپڑا۔ کتا اپنے شکار تک پہنچنے کے جوش میں بہت تیزی سے چھلانگ لگا کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ صحت مند جسم اور پتلی کمر کا مالک ہونے کے ساتھ بہت وزنی بھی تھا۔ میں کوشش کے باوجود اُس کی زد سے بچ نہ سکا اور نہ ہی اُس کی جھونک سنبھال سکا۔ غیبت یہ تھا کہ کتا اپنے شکار پر حملہ آور ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور نہ اُس کے پنجے پہلے ہی دار میں میرا بدن اُدھڑ ڈالتے۔ اپنی مڑی ہوئی اگلی ٹانگوں کے ساتھ وہ میری چھاتی پر آیا اور مجھے پشت کے بل گراتا ہوا آگے نکل گیا۔ شاید وہ صرف ڈرانا چاہتا تھا۔

کتے کی پہلی آواز سنتے ہی مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسے میری بو پسند ہایا گیا ہے۔ نیچے گرتے ہوئے میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں اُس وحشی کتے کے پلٹنے سے پہلے اپنے قدموں پر اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو وہ اپنے تیز دانتوں اور ٹکلیے ناخنوں سے مجھے لہو لہان کر دے گا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ نیچے گرنے کے باوجود لوڈ کیا ہوا پستول میری گرفت میں تھا۔ میں نے اپنے قدموں پر اٹھتے ہی پستول تان کر کتے پر فائر کر دیا۔ میرے قیاس کے عین مطابق وہ زک کر مجھ پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ عجلت اور گھبراہٹ کی وجہ سے میرا پہلا نشانہ خطا ہو گیا۔ گولی کتے کے اوپر سے گزر گئی۔ اُسی لمحے مجھے ادراک ہوا کہ میرا صرف ایک وحشی کتا سے مقابلہ نہیں ہے میرے عقب میں ایک دوسرا کتا بھی موجود ہے جس کی غراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

پتا نہیں؛ ویکٹر میرے چیتھڑے اڑوانے کے لیے کتنے کتوں کا دستہ رکھے ہوئے تھا؟ حملہ آور نظر نہیں آئے تھے۔ میں نے پلک جھپکنے میں فیصلہ کیا کہ میرے لیے دوسرا کتا زیادہ خطرناک ہے۔ سیاہ کتا مجھ سے قدرے دور اور فائر سے بچ جانے پر قدرے متردد بھی تھا جبکہ دوسرا ڈرائنگ روم میں گھستے ہی غضب ناک انداز میں دانت نکوس کر مجھ پر بھست لگانے کی پوزیشن لے چکا تھا۔ جوں ہی وہ قالین چھوڑ کر فضا میں اڑتا ہوا میری طرف آیا میں نے گولی چلا دی۔ گولی اُس کے دہانے میں گھس کر شاید اُس کے دماغ میں پیوست ہو گئی تھی۔ اُس کی بھست اُدھوری رہ گئی۔ وہ مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک بڑے لوتھڑے کی طرح قالین پر گر گیا۔

اپنے مشتعل ساتھی کے اس انجام پر سیاہ کتا اپنی جگہ پر پہلو بدل رہا تھا۔ میں نے جوں ہی اُس کا نشانہ لینے کی کوشش کی اُس نے چھلانگ لگانے کی بجائے سیدھے دوڑ لگا دی۔ فاصلہ ہی کتنا تھا میرے سنبھلنے سے پہلے اُس نے بھونک کر میری پنڈلی پر منہ مارا۔ میں نے اضطرابی طور پر اپنا پیر پیچھے کیا مگر میری پتلون کا پانچا اُس کے جڑے میں آ گیا۔ اب دونوں جانب سے زور آزمائی ہونے لگی۔ اُس کی کوشش تھی کہ وہ مجھے کھینچ کر گرا دے اور میں پانچا پھڑانے کی تنگ و دو کر رہا تھا۔ اس زور آزمائی میں مجھے اپنا پلٹہ ہلکا نظر آ رہا تھا۔ کتے کا پتلون کے پانچے سے الجھ جانے کی وجہ سے مجھے وقت مل گیا۔

پستول میرے ہاتھ میں ضرور تھا مگر انگلی میں پھنسا ہوا اور دستہ بھی قابو میں نہیں تھا۔ میں نے نال ہی کی طرف سے پستول کو پکڑ کر پوری قوت سے اُس کے سر پر دے مارا۔ اُس نے پانچا چھوڑ کر میری کلائی پر منہ مارنے کی کوشش کی مگر سر پر شدید چوٹ آنے کی وجہ سے شاید اُس کی بینائی متاثر ہو گئی تھی۔ اُس کی تھوٹھی فضا میں لہرا کر رہ گئی۔

اس ناکامی پر وہ جھٹلا کر میرے ہاتھ پر منہ مارنے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں میں خود پر قابو پا چکا تھا۔ اُس کے سر پر نال لگا کر گولی چلا دی۔ وہ دم توڑتی ہوئی غرا ہٹوں کے ساتھ قالین پر گر کر تر پنے لگا۔

اُن دونوں سے نمٹ کر میں دروازے کے نزدیک آیا مگر بے صبری سے باہر نہیں نکلا۔ نہایت دیرے دیرے کھستے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ میں بول کر حریفوں کو اپنی پوزیشن کا اندازہ لگانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ خود کو زمین پر گرا کر کہنیوں کے بل آگے سرکنے لگا۔ تبھی مجھے ایک آدمی ایک بڑی آرام کرسی کے پیچھے چھپا نظر آ گیا۔ شاید وہ نہتا تھا اسی لیے مقابلے کی بجائے چھپ جانے میں عافیت سمجھ رہا تھا۔ تبھی میرے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی، میں نے پلٹ کر دیکھا، نزدیک آتا ہوا مختار نظر آ گیا، میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا اور اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”جا کاٹ لے۔“

میری آواز کچھ بلند تھی۔ یقیناً اس نے بھی سن لی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی مختار نے پوچھا۔ ”کاٹ لوں؟“

”ہاں کاٹ لو۔“ میں کہا۔

”دوہیں ٹھہرا رہے تھے کاٹوں گا۔“ مختار اس شخص سے بولا۔

وہ اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا یا اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ مختار اس پر جھپٹا۔

”اے خبردار..... میں چاقو مار دوں گا۔“ اس شخص کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو نظر آیا۔ وہ کتوں کی موت دیکھ کر ڈرا ہوا تھا پھر بھی رعب میں کمی نہیں آئی تھی۔

مختار نے چھری کی پروا کیے بغیر اس پر چھلانگ لگائی۔ اور پھر اسی ہاتھ پر منہ مار بیٹھا جس میں چاقو تھا۔ میں ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ عقب میں آہٹ محسوس ہوئی اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ حسن آ رہا تھا۔

”باہر دو آدمی تھے۔ میں نے ان کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ وہ لوگ پتا نہیں کس پر فائر کر رہے تھے۔“ حسن آ رہا تھا۔

”وہ مجھ پر فائر کر رہے تھے۔“ دروازے کے باہر سے جانی پہچانی آواز آئی۔ پتا نہیں کب الفانسو بھی پہنچ گیا تھا۔ اسی سے مقابلہ ہو رہا تھا اور میں یہ سمجھ رہا تھا کہ گولیاں ہم پر چلائی جا رہی ہیں۔

”تم کیسے پہنچے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے تمہارا پروگرام مختار سے معلوم کر لیا تھا مگر تمہیں بتایا نہیں اور حفاظت کے خیال سے پیچھے پیچھے آ گیا۔“ وہ مسکرا کر بولا پھر اس نے مختار کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اب کاٹ لیا نہ..... دل بھر گیا ہے تو آ جاؤ۔“

میں نے مختار کی طرف دیکھا۔ اس کی بانجھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ خون آشام بھیڑیا لگ رہا تھا۔

”میں جانتا تھا کہ تم سراب کے پیچھے دوڑے ہو پھر بھی روکا نہیں کہ تم مجھے غلط سمجھتے۔ یہاں ویکٹر نے صرف کرائے کے ٹور کھے تھے جو ختم ہو چکے ہیں۔ اب واپس چلو۔“

اس نے بے زبان خموشی بتا دیا تھا کہ ہم غلط تھے۔ خجالت مٹانے کے لیے میں خاموشی سے اس کے ساتھ باہر آ گیا۔

دروازے کے باہر کچھ دوری پر الفانسو کی موٹر کھڑی تھی۔ ہم اس میں جا کر بیٹھ گئے۔

”مجھ پر شک نہ کرو۔ ہم بھی ویکٹر سے حساب بے باقی کرنا چاہتے ہیں۔ تمہاری بے یقینی کوئی غلط کام بھی کروا دے سکتی ہے اس لیے آئندہ مجھے بتائے بغیر کہیں نہ جانا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ الفانسو کو الوداعی سلام بھی نہیں کیا۔

☆.....☆

اگلی صبح میری آنکھ دشتک کی آواز سے کھلی تھی۔ میں نے ہی جا کر دروازہ کھولا تھا۔ باہر نور محمد کھڑے تھے۔ حالت بہت خستہ تھی۔ میں نے انہیں اندر بلا لیا اور حسن آرا کو اٹھا کر ناشتہ بنانے کا کہا اور نور محمد کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

ان کے جسم پر جا بجا زخم تھے گوشتے معمولی تھے مگر انہیں فکر نہ تھی۔

”آپ تو زخمی ہیں؟“ میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں، ان زخموں سے رستے ہوئے خون کے قطروں نے دل کے زخم پر مرہم رکھ دیا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ان کی عمر اور

چہرے پر پھیلے تقدس کی وجہ سے میں انہیں عزت دینے لگا تھا۔

”میں کس طرح کامیاب ٹھہرا یہ نہیں سنو گے؟“ وہ مسکرا کر بولے۔

”ضرور جب تک ناشتہ نہیں آ جاتا، آپ اپنی سرگزشت سنا دیں۔“

بولے ”تو سنو مگر درمیان میں ٹوکنا نہیں۔“ کہہ کر وہ اس طرح ڈرامائی انداز میں شروع ہو گئے جیسے وہ سنانے کے لیے بے چین ہیں۔ ریل نے کافی راستہ طے کر لیا تھا۔ میں گھیارے میں کھڑا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ تمام کوپے بند تھے۔ سونے والے سوچکے ہوں گے۔ موقع دیکھ کر میں نے چاقو کا ٹمن دبایا تو کھٹ کی آواز سے چاقو کا پھل کھل گیا۔ میں نے پھل کی دھار پر انگلی پھیری، اس کی تیزی کو محسوس کیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ بس کچھ دیر کی بات ہے اور پھر چاقو کی پیاس بجھ جاتی۔

میں کس طرح ان دونوں کو جہنم رسید کروں گا، اس منصوبے پر غور کرتے ہوئے میں نے ہپ پاکٹ سے کنگھی نکالی اور کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دونوں کھڑکیوں کے درمیان ایش ٹرے سے دو فٹ اوپر گول سا آئینہ فٹ تھا۔ میں نے کنگھی کرنے کے لئے ہاتھ اوپر کیا تو نظریں خود با خود آئینے پر مرکوز ہو گئیں۔ اپنی صورت دیکھتے ہی میں مجنوب ہو گیا۔ پیشانی پر سجدے کا نشان، منہ سے بڑی کچی پکی داڑھی جو میرے تقوئی کی گواہ تھی۔ میں نے گھبرا کر آئینے سے نظریں ہٹالیں اور ذہن میں گونجتی سرگوشیوں کو جھٹک کر کوپے سے باہر نکل آیا۔

ریل اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ کھٹ کھٹا کھٹ کے روہم میں وہ بار بار پٹری بدل رہی تھی۔ اس پر شور ماحول میں بھی سارے مسافر اپنے اپنے کوپے میں بند سو رہے تھے جنہیں نیند نہ آئی ہوگی، وہ کسی مشغلے سے دل بہلا رہے ہوں گے۔ گلیا راسنسان پڑا تھا۔ میں نے حتی الامکا ن کوشش کی تھی کہ میرے قدموں کی دھمک نہ ابھرے۔ میں بلی کی چال سے اس کوپے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں وہ دونوں سو رہے تھے۔ ان میں ایک انسپکٹر سنڈری تھا اور دوسرا ایس آئی مہندر۔ دونوں ہی میرے افسر تھے ان کی ماتحتی میں میں نے ایک عرصہ گزارا تھا مگر آج وہ دونوں میرے شکار بننے والے تھے۔

جس وقت میں ٹرین میں سوار ہوا تھا، شام کا سایہ اتر رہا تھا۔ میں نے جسم کے گرد شال لپیٹ رکھی تھی۔ مجھے ڈرتھا کہ کہیں وہ دونوں مجھے پہچان نہ جائیں اس لیے میں نے چہرے کو جھکا رکھا تھا۔

میں گھیارے میں کھڑا تھا کہ مجھے عقب میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ کوٹ پینٹ میں ملبوس ایک نوجوان بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے ارادہ بدل دیا اور اپنی رفتار بڑھا دی، مطلوبہ کوپے کو پار کرتے ہوئے گیٹ پر پہنچ گیا۔ کمپارٹ منٹ کا دروازہ اندر سے بولٹ تھا۔ ریلوے قانون کے مطابق رات کے وقت چلتی ٹرین کا دروازہ کھولنا جرم ہے اس لئے میں نے صرف کھڑکی کھولنے پر اکتفا کیا اور سر نکال کر لمبی لمبی سانس لینے لگا گویا جیسے جس سے مجبور ہو کر ہوا خوری کے لئے کھڑکی پر آیا ہوں۔ میری آنکھیں اندھیرے میں سیاہ ہیولوں کی طرح بھاگتے پیلروں اور پہاڑی سلسلے پر لگی تھیں۔

ریل نشیب و فراز طے کرتی، دونوں جانب پھیلی ہوئی گھاٹیوں سے گزرتی، موڑ کاٹتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ برابر میں بھی پٹریاں تھیں

’چاندنی میں سانپ کی طرح مل کھاتی پٹریاں چمک رہی تھیں‘ میں ان پر نظریں ٹکائے کھڑا تھا مگر میری ساری توجہ عقب میں تھی، میں احساس کی نگاہوں سے پیچھے آنے والے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پیروں کی چاپ بتا رہی تھی کہ وہ بڑھتا ہی چلا آ رہا ہے۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ وہ میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے بھی میرے برابر سے اپنا سر باہر نکال لیا تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ میرے بہت قریب کھڑا تھا۔ کپار ٹمنٹ جھکو لے کھارہا تھا۔ میں نے چاقو داہنی جیب میں رکھا تھا اور وہ بھی داہنی جانب تھا۔ کسی بھی تیز جھکولے سے ہمارے بدن ٹکرا سکتے تھے تب اسے معلوم ہو جاتا کہ میری جیب میں کیا ہے؟ وہ شور مچا کر مجھے ڈاکو کہہ کر گرفتار کر دیتا۔ یوں بھی یہ علاقہ ڈاکوؤں کی شورہ پشتی کے لئے خاصا بدنام تھا۔ میں کسی قسم کی الجھن کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا سو فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے پیچھے ہٹتے دیکھ اس نے بھی اپنا سر اندر کر لیا اور میرے روبرو کھڑے ہو کر میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”کیا ٹائم ہوا ہوگا؟“

باتھ روم کے دروازے سے پیٹھ ٹکا کر میں نے جواب دیا۔ ”ایک من رہا ہوگا۔“
”اور ابھی تک ہم رستے میں ہیں۔ ٹرین پورے چھ گھنٹے لیٹ چل رہی ہے۔ تو بے ہے یہ لوگ وقت کی پابندی نہیں کر سکتے تو ریلوے ٹائم ٹیبل کیوں چھاپتے ہیں؟“ اس نے جمائی لے کر کہا۔

”مسافروں کی سہولت کے لئے۔“ میں نے مسکرا کر کہا ”انہیں معلوم ہوتا رہے کہ اب ٹرین کتنی لیٹ ہے۔“
وہ ہنس دیا پھر کوپے کے بند دروازوں پر نظر ڈالتے ہوئے بولا ”اس پوری قوم کو ڈسپلین سے الرجی ہے اور یہ مرض بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ خدا جانے اس کا علاج کرنے کون آئے گا؟ کیا آسمان سے فرشتے اتریں گے۔“
”اگر اترے تو انکا اپنا ڈسپلین خراب ہو جائے گا۔“ میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔ اس کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ یوں بھی کوئی جاہل جٹ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے سے رہا۔ جن کے پاس نوٹوں کے بنڈل ہوتے ہیں وہی فرسٹ کلاس کے کوپے ریز رو کراتے ہیں ورنہ غریبوں کے لئے تو سیکنڈ کلاس یا پھر تھرڈ کلاس ہوتے ہیں۔ اتنے روپے خرچ کرنے میں عام مسافر ہچکچاتے ہیں۔
”آپ کا کیا خیال ہے چار بجے تک ہم پہنچ جائیں گے؟“

”امید تو ہے!“ میں نے جواب دیا۔
”یہ بندہ تو باتونی لگتا ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس سے پیچھا چھڑانا ضروری ہے تاکہ چار بجے سے پہلے اپنا کام کر لوں۔ میں نے مڑ کر اس کوپے کی طرف دیکھا جس میں میرے شکار سو رہے تھے۔ پھر میں واش روم میں گھس گیا تاکہ اس پیرتسمہ پا سے نجات مل جائے۔ اندر داخل ہو کر میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

باتھ روم میں آنے جانے کے بہانے میں نے اچھی طرح ان کے کوپے کو پہچان لیا تھا اور اب میں موقع کا منتظر تھا مگر پتا نہیں وہ پیرتسمہ پا کہاں سے آ گیا۔ جس کی وجہ سے مجھے واش روم میں بند ہونا پڑا۔
میں واش روم میں کھڑا آئینے میں اپنی شکل دیکھ رہا تھا کہ چونک گیا۔ ٹرین کسی پل پر سے گزر رہی تھی۔ گھر گھر کی مکروہ آواز سے پورا

کمپارٹمنٹ گونج رہا تھا۔ میں نے اس بک بکے کو دیکھنے کے لیے واش روم کے دروازے میں ہلکی سی جھری پیدا کی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب تک وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا ہے یا چلا گیا۔ لیکن باہر کا منظر دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ حیرت کی شدید لہر نے مجھے جکڑ لیا تھا۔

وہ شخص میرے شکار کے کوپے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا تار تھا جسے وہ دروازے کی خلا میں ڈال کر ہلا رہا تھا۔ شاید وہ اندر کی چٹنی کو گرا کر کوپے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اس نے اندر کی چٹنی کھول لی۔ دروازہ کھلتے ہی اندر کی نیلی روشنی باہر آنے لگی۔ میں اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا پھر پورا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

”یہی وہ چور ہے“۔ میں نے سوچا۔ یوں بھی آج کل چلتی ٹرینوں میں چوری ایک عام سی بات ہے۔ وہ چور میرا پلان چوہٹ کر سکتا ہے یہ سوچ کر میں واش روم سے باہر نکل آیا اور بے قدموں ادھر بڑھا۔ اس شخص نے بند دروازے کو کھول کر میرا کام آسان کر دیا تھا اب مجھے اسے خوفزدہ کر کے بھگانا تھا۔ تبھی اندر سے کرہناک چیخ ابھری اور پھر اٹھا بیچ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے جھری سے اندر جھانکا۔ اندر کا منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ میرا ایک شکار خون میں لت پت تھا جبکہ اسی کے قریب وہ شخص گھتم گھتا تھے۔ ان میں سے ایک وہ ہی شخص تھا۔ وہ نیچے تھا اور اس کے سینے پر انسپکٹر سنڈری سوار تھا۔ زخمی ایس آئی چاقو لے کر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چاقو خون آلود تھا شاید اسی چاقو سے مہندر کا کام تمام ہوا تھا۔ تبھی میرے دماغ میں سرگوشی سی گونجی ”دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے اسے پہچانا ضروری ہے“۔ اور میں نے جیب سے چاقو نکال لیا۔ کھکا دباتے ہی چاقو کا پھل کھل گیا اور میں ایک لمحہ گنوائے بغیر اندر داخل ہو گیا۔

وہ دونوں اپنے شکار سے الجھے ہوئے تھے اسی لئے انہیں احساس بھی نہیں ہوا اور میں ان کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے اپنا چاقو والا ہاتھ بلند کیا اور پوری قوت سے ایس آئی کی گردن میں گھونپ دیا پھر پھرتی سے چاقو کھینچ لیا۔

یہ ضرب ایسی کاری تھی کہ وہ اٹھ ہی نہ سکا۔ اس کی چیخ اور خون کی چھینٹوں نے سنڈری کو بوکھلا دیا۔ وہ اپنے شکار کو چھوڑ کر میری طرف لپکا۔ میں نے پھر چاقو لہرایا اس بار میرا نشانہ انسپکٹر سنڈری کا زرخرہ تھا۔ انسپکٹر سنڈری نے میرے ارادے کو بھانپ لیا اور فوراً ہی بیٹھ گیا۔ میں اپنے ہی جھونک میں آگے رپٹا اور اس سے ٹکرا کر اس پر جھول گیا۔ اس نے بیٹھے ہی بیٹھے مجھے اپنے سر سے ٹکرا کر اچھالنے کی کوشش کی۔ میں کوئی نیا کھلاڑی تو تھا نہیں اور نہ اب وہ سیدھا سادا پولیس کا نشیل تھا۔ میں برق رفتاری سے اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ تبھی جانکنی کے عالم میں تڑپتے ہوئے ایس آئی کا ہاتھ میری پنڈلی سے ٹکرایا اور اس نے میرا پیر پکڑ لیا۔ مرتے ہوئے آدمی کی نیس کھینچتی ہیں۔ اس کی پکڑ بھی لمحہ بہ لمحہ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایس آئی اب خطرناک نہیں ہے جبکہ انسپکٹر موت کا فرشتہ بن چکا ہے۔ اس نے ایس آئی والا چاقو اٹھا لیا تھا۔ وہ اسے لہراتا آگے بڑھا مجھے موت کا بھیاںک چہرہ صاف نظر آنے لگا تھا تبھی انسپکٹر سنڈری کے شکار نے بیٹھے ہی بیٹھے اس کے ٹخنے پر گھونسا مارا۔ وہ پیچھے گرا تھا کہ میں نے چاقو سے وار کیا۔ چاقو انسپکٹر کے سینے میں ترازو ہو گیا تھا اور وہ گرنا چلا گیا تھا۔

اس کے گرتے ہی میں نے اپنے مددگار سے کہا۔ ”ریل کی آواز میں چیخ دب گئی ہوگی یہ سوچنا غلط ہے۔ برابر کے کوپے میں بھی مسافر ہیں۔ اٹھا بیچ کی آوازیں بھی انہوں نے سنی ہوں گی۔ فوراً باہر نکلو۔“

میں بھی باہر آ گیا تھا اور اب دروازے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ گیٹ کا بولٹ کھول کر میں نے کہا ”پائیدان پر ایک پیر رکھ کر چھت والی سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کرو، ہم چھت پر چڑھ کر ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔“

وہ میری بات سمجھ گیا اور پائیدان سے سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش نے اسے کامیاب کر دیا تھا۔ تب میں آگے بڑھا۔ ریل طوفانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ رہ رہ کر جھٹکے لگ رہے تھے۔ ہوا کا دباؤ الگ تھا۔ رات کی خنکی بہت بڑھ گئی تھی مگر اس وقت خوف نے ہر موئے تن کا منہ کھول دیا تھا۔ پسینا رس رہا تھا۔ کسی بھی لمحے اندازے کی ہلکی سی غلطی موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ میں نے بائیں پیر کو پائیدان پر جمایا، بائیں ہاتھ سے دروازے کے پینڈل کو مضبوطی سے پکڑا اور داہنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ڈبے کے عقب میں وہ سیڑھی تھی جس کے ذریعے چھت پر چڑھ کر پائپ سے پانی بھرتے ہیں۔ وہ سیڑھی اب بھی میرے ہاتھ سے تقریباً ایک بالشت کے فاصلے پر تھی۔ میں نے جسم کو مزید خم دیا۔ کچھ اور آگے جھکتے ہی سیڑھی کا راڈ میرے ہاتھ سے مس ہوا۔ میں نے اس پر گرفت مضبوط کر لی، پھر اپنا داہنا پیر بھی آگے بڑھا دیا۔ چھت پر بیٹھا وہ اجنبی مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جتنی آسانی سے سیڑھی پر پہنچ گیا تھا میں ویسی تیزی دکھا نہیں پایا تھا۔ میٹر گج کی ٹرین تھی ورنہ یہ کام ناممکن بن جاتا۔ کامیابی اب ملنے ہی والی تھی کہ میں نے کمپارٹمنٹ میں شور سنا۔ شاید کسی نے لاشیں دریافت کر لی تھیں۔ یہ ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ کسی بھی وقت کوئی بھی دروازے پر آ سکتا تھا۔ اندر کی چٹنی کھلی ہوئی تھی جو کسی مسافر کو متوجہ کر سکتی تھی۔ اگر کوئی دروازے پر آ گیا اور اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو مجھے فوراً ہی دیکھ لے گا۔ میں نے آخری کوشش کی اور کامیابی حاصل کر لی، سیڑھی پر پہنچ گیا۔

اب چھت پر پہنچنا بہت آسان تھا۔ اسی دوران میں ریل کی رفتار سست پڑنے لگی اور انجن کا ہارن رک رک کر بجنے لگا۔ میں اس اجنبی کے ساتھ چھت پر لیٹ گیا۔ ریل نے ہچکولا کھایا اور رک گئی۔ شاید کسی نے زنجیر کھینچ لی تھی۔

ریل جنگل میں کھڑی تھی۔ ہر طرف ویرانہ تھا۔ رات کی تاریکی میں ویرانہ کافی خوفناک لگ رہا تھا۔ تبھی میری نظر ٹارچوں کی چمکراتی ہوئی روشنی پر پڑی۔ ریل کے ساتھ سفر کرنے والے پولیس مین جھاڑیوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ہمیں اتر کر فرار ہو جانا چاہیے۔“ اجنبی نے سرگوشی میں کہا۔

”چپکے پڑے رہو۔ نیچے اترتے ہی دھریے جاؤ گے۔ ابھی تک لوگ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم اتر کر فرار ہو گئے ہیں۔ چھت کی طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا۔“ میں نے ہلکی آواز میں اسے ڈانٹ دیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ریل پھر چل پڑی۔ سب نے یقین کر لیا ہوگا کہ قاتل فرار ہو چکے ہیں۔ ریل کے چلتے ہی ایک دوسری فکر نے گھیر لیا۔

اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ریل سے نجات کس طرح حاصل کریں؟ تقریباً دو گھنٹے بعد اسٹیشن آنے والا تھا۔ اسٹیشن کی جگہ گاٹ میں کسی کی بھی نظر ہم پر پڑ سکتی تھی اور ہم دھریے جاتے۔ تبھی اس اجنبی نے کہا۔ ”مجھ سے اب زیادہ دیریوں بیٹھا نہیں جائے گا۔ ہاتھ اکڑ رہے ہیں۔ کسی بھی وقت واٹر جنکشن کا سرا جھوٹ سکتا ہے۔ اس ٹھنڈ میں ہوا کی تیزی بھی مارے ڈال رہی ہے۔“

مجھے اندازہ تھا۔ کمپارٹمنٹ کی چھت میں نصب واٹر جنکشن جس کے ذریعے ڈبوں میں پانی بھرا جاتا ہے اسے پکڑ کر طوفانی ہوا میں بیٹھنا

ٹرک تھا۔ جب سے جنگ چھڑی تھی صوبے میں تحریک نجات شروع ہو گئی تھی اور جگہ جگہ تصادم ہونے لگے تھے۔ فوجیوں نے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ جگہ جگہ چھاؤنیاں سی بن گئی تھیں۔ پھر بھی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہی جگہ جگہ دھماکے، فائرنگ اور نعرے بازی۔ امن کی فاختہ تو کب کی اڑ چکی تھی۔ اب تو بارود ہی یہاں کی پہچان بن چکی ہے۔

ٹرک گزرتے ہی میں نے کہا۔ ”بھائی میاں! اب ایسا کرو کہ پیدل ہی مشرق کی سمت چل پڑو۔ تقریباً چار میل کا فاصلہ ہے۔ سورج نکلنے تک ہم سورج گڑھ پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے ہر جانب کی بسیں ملتی ہیں جہاں چاہو جاسکتے ہو۔“

وہ چل پڑا۔ کچھ دور چلنے کے بعد بولا ”پتا نہیں میرے دوسرے ساتھیوں کا کیا حال ہے؟“

”تمہارے ساتھ اور بھی لوگ تھے؟“

”ہاں ہم چار ساتھی تھے۔“

”ان پولیس والوں سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟“

”سارے پولیس والے ہمارے دشمن ہیں۔ یہ دونوں تو کب سے ہماری لسٹ پر تھے۔ ہمیں کل خبر ملی تھی کہ یہ لوگ چھٹیاں گزار کر آرہے ہیں۔ چھٹیاں تو بھانہ تھا دراصل عیاشی کرنے گئے ہوئے تھے ورنہ دونوں ایک ساتھ کیا کرنے جاتے۔“

”بھائی اب اپنا تعارف کرا دو۔ تم کون ہو؟ کیا نام ہے؟“ میں الجھ گیا تھا۔

”جی مجھے آصف جاہ کہتے ہیں۔ بی اے کر چکا ہوں۔ گڈری پور کارہنے والا ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرے والد فوج میں تھے۔ رائل انڈین آرمی کی آرٹلری میں۔ اس دن جرمنوں کا حملہ بہت شدید تھا۔ ابو جس مورچے پر تھے اسے انہوں نے ہر جانب سے گھیر لیا تھا۔ زندگی اور موت کا کھیل جاری تھا کہ ابو کا ایک ساتھی بری طرح زخمی ہو گیا۔ ڈیوڈ نامی وہ کیپٹن فرانس کا رہنے والا تھا مگر بیوی بچے دلی میں رہتے تھے۔ اس کے دونوں پیراڑ گئے تھے۔ میڈیکل یونٹ سے امداد کی توقع نہ تھی۔ ابو ہی نے اس کی مرہم پٹی کی۔ اس کے بچنے کی بہت کم توقع تھی۔“

اس نے جلد بازی میں خط لکھا اور اسے لفافے میں بند کر کے ابو کو دیتے ہوئے بولا۔ ”خان صاحب! اسے آپ خود میرے گھر پہنچا دیجئے گا۔“ ابو نے خط لے کر رکھ لیا اتفاق کی بات ہے کہ کچھ دیر بعد وہ خود بھی زخمی ہو گئے۔ ایک قریب المرگ ساتھی کی وصیت کو پورا کرنے کی ہامی بھرنے والے کی زندگی خود روٹھنے والی تھی۔ وہ سخت جان تھے کہ اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی ہوش میں تھے جبکہ انہیں تین گولیاں لگی تھیں۔ پہلی گولی کندھے میں لگی تھی دوسری گولی پسلی میں اور تیسری گولی کان کی لو کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ مورچے میں صرف تین لوگ تھے۔ ڈیوڈ جو مر چکا تھا ابو اور ستیش اسی

ستیش نے میڈیکل کٹ سے ابو کو طبی امداد دی لیکن خون کسی طور بند نہ ہوا۔ ان کی حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ ستیش ان کی بھی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا کہ پیچھے سے کمک پہنچ گئی۔ نئے دستے نے جرمنوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھی لوگوں نے ابو کو میڈیکل کور تک پہنچایا۔ ابو دو ماہ تک اسپتال میں رہے۔ اسپتال سے چھٹی ملی تو پھر انہیں یونٹ میں بلایا گیا کیونکہ علاقے کو وہ بہتر طور پر سمجھتے تھے اور اس علاقے کے لوگوں سے بھی اچھے مراسم تھے اسی لیے افسران نے انہیں ترجیح دی تھی۔ ابھی تک ڈیوڈ کا خط انھی کے پاس تھا۔ انہوں نے اس خط کے بارے میں امی کو خط میں لکھ دیا تھا۔ پھر

ایک دن مورچے میں بیٹھے تھے کہ دشمن کی نایدہ گولی نے انہیں چاٹ لیا۔

ابو کے انتقال کے بعد امی اور دادی نے مجھے پالا۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ پینشن سے زیادہ آمدنی ہمارے باغات کی تھی۔ زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ میں نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ امی نے میرے لیے ایک لڑکی پسند کر لی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ میری شادی جلد سے جلد کر دیں کیونکہ پورا ہندوستان لگا تھا۔ آزادی کی تحریک نے زور پکڑ لیا تھا۔ ہنگامے بلوہ فارنگ روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ گھر کی صفائی ہو رہی تھی۔ ایک ٹرنک کو کھولتے ہی مجھے ایک لفافہ ملا۔ لفافے میں کس قسم کے کاغذات ہیں یہ دیکھنے کے لیے میں نے اسے کھول لیا۔ اندر مختصر سی تحریر تھی۔ فریج میں کس نے کس کو خط لکھا ہے؟ میں ابھی اس کا اندازہ لگانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ امی آ گئیں۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”امی یہ کیا ہے؟“ میں نے لفافہ دکھا کر پوچھا۔

”اوہ!“ امی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا ”تمہارے ابو کا ایک دوست تھا۔ انہی کے ساتھ ایک مورچے میں لڑ رہا تھا کہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ مرتے وقت اس نے یہ خط دے کر وصیت کی تھی کہ اسے میرے گھر پہنچا دینا۔ لیکن افسوس تمہارے ابو کو اجل نے موقع نہ دیا اور یہ خط پڑا رہ گیا پھر میں اسے بکس میں رکھ کر بھول گئی ورنہ میں کسی کے ذریعے پہنچا دیتی پتا نہیں اس کے گھر والے اب دلی میں ہوں گے بھی یا واپس چلے گئے ہوں گے۔ بے چارے کی وصیت پوری نہ ہو سکی۔“

”شادی میں ابھی پورے ایک ماہ گیارہ دن باقی ہیں۔ اتنے دن گزارنا یوں بھی مشکل نظر آ رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں خود دلی چلا جاؤں۔ آؤنگ ہو جائے گی اور ابو کے دوست کی وصیت بھی پوری ہو جائے گی۔“

”جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ مگر زیادہ دن نہ لگانا۔“ یہ کہہ کر امی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ان کی اجازت ملتے ہی میں نے تیاری شروع کر دی اور اگلے ہی دن چل پڑا۔ شہر آیا۔ اب یہاں سے مجھے دلی کے لیے ٹرین پکڑنا تھی۔ گاڑی اگلے دن صبح کے وقت ہلتی۔ رات گزارنے کے لیے میں ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ ہوٹل میں پہنچ کر تجسس نے مجھے اکسایا۔ میں نے سوچا کہ اس خط میں کیا لکھا ہے اسے سمجھ لینا چاہیے۔ اس خیال کے تحت میں نے برابر والے کمرے میں ٹھہرے انگریز سے پوچھا کہ کیا اسے فریج آتی ہے۔ اس نے ہاں میں جواب دیا تو میں نے اسے خط کا ترجمہ کرنے کو کہا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کو سن کر میں کانپ اٹھا۔ ایک مرتے ہوئے شخص سے ایسی امید عبث ہے لیکن اس بد معاش نے ایسا کر دکھایا تھا۔ اس نے خط میں لکھا تھا۔ ”میرا یہ خط جو ایک انڈین لے کر جا رہا ہے آپ کو ملے گا تب تک میں یہ جسم تیاگ چکا ہوں گا۔ میری روح اور جسم کا رشتہ ٹوٹ چکا ہوگا۔ میں گریٹ برٹن کے نام پر قربان ہو چکا ہوں گا۔ میرے جسم میں جرمنوں نے پتا نہیں کتنی گولیاں اتار دی ہیں۔ میری دونوں ٹانگیں اڑ گئی ہیں۔ اب میں مرنے والا ہوں۔ میری آخری خواہش ہے کہ میرا بدلہ لیا جائے۔ مجھے جرمنوں نے مارا ہے اور جرمن کے دوست انڈین ہیں۔ جو برٹن کے راج کو ختم کرنے کے لیے جرمنوں کا ساتھ دے رہے ہیں اس لیے میں ایک

انڈین کو آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے۔ میرے یونٹ کا افسر ہے۔ مگر انڈین ہے۔ یہ سارے انڈین کچھو ہیں۔ آپ اس کے کٹڑے کٹڑے کر دیں۔ تبھی میری روح کو قرار ملے گا۔“

خط کا ترجمہ سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے دلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور واپسی کی بس پکڑ لی۔ مجھے شام میں بس میں سوار ہونا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے ایک دوست کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”خدا کا شکر ہے تم صحیح و سالم ہو۔ یہاں تو عجیب عجیب باتیں سنی جا رہی تھیں۔“

”کس قسم کی باتیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں تمہیں نہیں معلوم؟“ اس نے الٹا سوال کر دیا۔

”نہیں بھائی میں تو شہر میں تھا۔“

”تمہارے علاقے میں کوئی خطرناک انقلابی آگیا تھا۔ اس کے پیچھے پولیس پہنچ گئی۔ کریک ڈاؤن ہوا تھا۔ اس انقلابی نے فرار کی بجائے مقابلے کی ٹھانی اور اس نے دو سپاہیوں کو گولی مار دی۔ جواب میں انگریزوں نے اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ پچاسوں بے گناہوں کو شہید کر دیا گیا۔ بے انتہا ظلم ہوا ہے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”پرسوں رات آپریشن ہوا تھا اب بھی محاصرہ جاری ہے۔ میرے خیال سے تم ابھی گاؤں نہ جاؤ۔ دو ایک دن یہیں گزارو۔ حالات سنبھل جائیں تو چلے جانا۔“

دوست کے کہنے پر میں رک گیا۔ ایک ہفتے بعد جب میں اپنے گھر پہنچا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ انگریزوں کے اس بہادر فوجی کو جس نے اپنی زندگی قربان کر کے مہارانی ویکٹوریہ کی شان کو محفوظ رکھا تھا جسے بہادری کا تمغہ ملا تھا اسی کے گھر کو انگریز فوجیوں نے جلا کر راکھ کر دیا۔ صرف اس جرم میں کہ وہ ایک انڈین فوجی کا گھر تھا۔ میری ماں کو بندو قوں کے اتنے بٹ مارے گئے اتنی ایذا نہیں دی گئیں کہ وہ اس برطانیہ کے نام پر تھوک کر ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

”میری ماں مر گئی، گھر جل کر راکھ ہو گیا مگر مجھے غم نہیں۔ میں نے ماں کی موت سے حوصلے کو زندگی دے دی۔ گھر کے شعلوں کو انتقام کی آگ میں بدل لیا اور ایک خفیہ تنظیم میں شامل ہو گیا۔ اس تنظیم کا پہلا کام ہے ان لوگوں سے انتقام لینا جو یہاں کے معصوم لوگوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ وہ دونوں پولیس والے جنہیں ہم نے ٹرین میں ختم کیا ان کے قتل کے احکام مجھے اسی تنظیم نے دیے تھے کیونکہ ان کی درندگی اب برداشت سے باہر ہو چکی ہے۔“ نوجوان نے آنسو پونچھ کر کہا۔

”میں خود بھی ان کے ظلم کا شکار ہوں۔ اس دن میں ان کے شکار کو نکلا تھا۔ اس نے پہلے کہ میں ان کے کوپے میں داخل ہوتا، تم آگئے اور میں کمپارٹمنٹ کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ تم سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہی میں واش روم میں داخل ہوا تھا لیکن جب تمہیں ان پر حملہ کرتے

دیکھا تو مدد کے لیے آگیا۔“

”جب ہماری منزل ایک ہے تو آئیے ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیے ہماری تنظیم میں شامل ہو جائیے۔“

”تم مجاہد میں گنہگار تم ایک نصب العین کے تحت لڑ رہے ہیں اور میں ذاتی انتقام کے لیے۔ ہم تم کیسے ایک کہلائیں گے؟ میں اپنی لڑائی

لڑ رہا ہوں، وطن کی نہیں۔“ میں نے رک کر کہا۔

”دشمن ایک ہو تو لڑائی جدا نہیں ہوتی۔ یہاں اتنی ڈھیر ساری تنظیمیں اپنے طور پر لڑ رہی ہیں۔ سب کا اپنا انداز ہے اور ہر ایک کی جنگ

جہاد کہلائے گی کیونکہ اسی قسم کے اقدام سے آزادی کے نزدیک آتے ہیں آزادی بھیک یا تحفہ میں نہیں ملتی چھین کر لینا پڑتی ہے اور ہر ایک کا چھیننے کا

طریقہ الگ الگ ہوتا ہے۔“

اتنی دیر میں ہم قصبے کے نزدیک پہنچ گئے تھے مشرقی افق پر سحر کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ اس قصبے میں رام اوتار کا گھر تھا۔ اس پر میرے

احسانات تھے۔ میں نے اس کے بیٹے کو ایک کیس میں بچایا تھا۔ اس کے بیٹے نے پڑوسی کی بیٹی کو محبت کے جال میں پھانس لیا تھا اور اسے بھگا کر شہر

لے جا رہا تھا۔ بس اڈے پر میری ڈیوٹی تھی۔ میں نے شک کی بناء پر انہیں پکڑ لیا تھا۔ رام اوتار سے صاحب سلامت تھی اسی وجہ سے اس کے بیٹے کو سر

زش کر کے چھوڑ دیا تھا۔ اس دن سے رام اوتار جوشی میرا معتقد ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس کو شبہ بھی نہیں ہوگا کہ آزادی کی تحریک کا کوئی مسلمان

رکن کسی ہندو کے گھر میں چھپا ہے۔ اس نوجوان کے لیے بھی سب سے مناسب جگہ وہی تھی۔ میں سیدھا اس کے محلے میں پہنچا۔ محلہ پانڈے قصبے کے

شروع میں تھا مگر رام اوتار جوشی کا گھر محلے کے وسط میں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اتنے سویرے ہمیں دیکھ کر کوئی بھی سوال کر سکتا تھا ”تم لوگ کون ہو؟“ اس

ڈر سے میں تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دعا کر رہا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ ابھی ہم محلے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ مندر کے مہنت کو چہوڑے

پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں زنا رہا تھا جسے وہ گردش دے رہا تھا۔ کچھ بڑا بھی رہا تھا۔ شاید کسی اشلوک کا چاپ کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر تازہ قشقہ

کھنچا تھا۔ یقیناً وہ ابھی ابھی پوجا کر کے باہر آیا تھا۔“

نور محمد کی داستان ابھی جاری تھی کہ حسن آرا ناشتہ لے کر آگئی اور میں نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ پہلے وہ ناشتہ کر لیں۔ مگر وہ اپنی

کامیابی کی داستان سنانے کے لیے اتنے پر جوش تھے کہ انہیں روکنا ناگوار لگا مگر بہ حالت مجبوری انہیں رکنا پڑا۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ گویا نگل رہے

تھے جیسے انہیں بقیہ داستان سنانے کی جلدی ہو۔

ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی وہ بولے۔ ”ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں اس پنڈت کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس نے مجھے

دیکھا ضرور پر کچھ بولا نہیں۔ چاپ میں غلغل پڑتا اسی کا فائدہ مجھے ملا تھا اور میں آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ میرے ساتھ وہ نوجوان بھی تیز تیز قدم اٹھاتے

ہوئے چل رہا تھا۔ گلی میں مڑتے ہوئے میں نے کہا ”ہم ایک ہندو کے گھر میں ٹھہریں گے تاکہ پولیس کو شبہ نہ ہو۔“

”ہندو اور قابل اعتبار! مجھے یقین نہیں کہ وہ ہمیں جگہ دے گا کیونکہ جب سے آزادی کا محاذ کھلا ہے زیادہ تر ہندوؤں کی نظریں بدل گئی

ہیں۔ اس لیے کہ انہیں امید ہے کہ انگریز جب جانے لگیں گے تو یہاں کی حکومت ان کے حوالے کر کے جائیں گے۔“

ہم رام اوتار جوشی کے گھر پہنچے تو وہ سو رہا تھا مجھے دیکھتے ہی اس نے اندر بلا یا فوراً سبز چائے کا پیالا آگیا۔ ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ جوشی کا بیٹا بھاگتا ہوا آیا۔

”باپو..... او باپو جاپانیوں نے برما پر حملہ کر دیا۔ رنگون پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔“ جوشی کے بیٹے نے کہا۔

اس خبر نے ہم دونوں کو پریشان کر دیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جاپانی اتنا آگے بڑھ آئیں گے لیکن حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ان باپ بیٹوں کے اندر جاتے ہی آصف جاہ نے کہا ”چچا! ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ جاپان ہی ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔ اگر اسے شکست ہوگئی تو ہمیں آزادی کون دلائے گا۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم رسل و رسائل کے سلسلے کو تو منقطع کر سکتے ہیں۔ محاذ پر جانے والے فوجیوں کو پریشان تو کر سکتے ہیں۔“

”مگر جنگ یہاں نہیں برما میں ہو رہی ہے۔“

”چچا آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہاں بھی تو فوجی ہیں انگریز فوجی۔ بدلہ ہم یہاں لیں گے میں اپنی تنظیم سے رابطہ کرتا ہوں آپ یہیں ٹھہریں میں شام تک لوٹ آؤں گا۔“ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

آصف جاہ کے جاتے ہی میں جوشی کی بیٹھک میں دراز ہو گیا۔ اب مجھے اپنا غم تھوڑا لگ رہا تھا۔ جاپان ہماری امیدوں کا مرکز تھا اس کی شکست ہماری شکست تھی۔ بھلے ہی ہم جاپان کے شہری نہ ہوں مگر ہمارے دل تو اس وقت انہی لوگوں کے ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ میں کس کس طرح جاپانی فوج کی مدد کر سکتا ہوں اسی بات پر میں غور کرنے لگا۔

جاتے وقت آصف جاہ نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ بارہ بجے ہی لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”جوشی کہاں ہے؟“

”وہ دکان پر گیا ہوا ہے اب شام کو ہی لوٹے گا۔“

”میں نے اسلحے کا انتظام کر لیا ہے۔ میری تنظیم نے آپ کو بھی قبول کر لیا ہے۔ انہیں بھی آپ کے درد کا پتا ہے۔ آپ کی بیٹی صبا کو ہماری تنظیم نے ہی ان درندوں کے چنگل سے آزاد کر لیا ہے اور آپ کو بھی انہوں نے ہی بچایا تھا۔ وہ آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے مجھے بچایا۔ میری مدد کی۔“

”ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ ہتھیار کہاں رکھے ہیں؟“

”محلے کے باہر ایک باغ میں ہم نے جیب کھڑی کی ہے۔ ہماری مدد کے لیے ایک شخص بھی آیا ہے۔ وہ جدید اسلحہ چلانے کا ماہر ہے پھر

اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگ سے ایک پستول نکال کر دیا ”یہ آپ کے لیے ہے اسے اپنے لباس کے نیچے چھپالیں۔“

تو چلو وقت گوانا عقل مندی نہیں ہے۔“ کہہ کے میں نے پستول لے لیا اور باہر کی جانب بڑھا۔ تبھی دروازہ زوردار آواز سے کھلا اور جوشی

کا بیٹا رنجیت اندر داخل ہوا۔

”چاچا پولیس آپ کی تلاش میں آرہی ہے۔“

”پولیس!“ میں نے حیرت سے کہا اور آصف جاہ کی جانب مڑ کر دیکھا۔

”یہ بد بخت یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

”لگتا ہے اس پنڈت نے انہیں خبر کی ہے۔“ آصف جاہ نے کہا۔ ”بچھلی جانب سے نکل چلو۔“

ہم دونوں اندر گھستے چلے گئے۔ اندر بیٹھی عورتوں نے گھبرا کر گھونگٹ گرا لیا۔ ہم نے کسی جانب توجہ نہ دی اور آنگن کی بچھلی دیوار پھانڈ کر بچھلی گلی میں نکل آئے۔ ابھی ہم اس گلی سے نکلے ہی تھے کہ گلی کے اگلے موڑ سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ”نور محمد رک جاؤ۔“

میں نے مڑ کر دیکھا، اکٹھے کمار دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے بھی دوڑنا شروع کر دیا۔ دوڑتے دوڑتے میں نے گن نکال لی نال کو کندھے پر رکھ کر پیچھے فائر کیا۔ اتنی دیر میں آصف جاہ نے بھی گن نکال لی تھی میرے ساتھ اس نے بھی فائر چلایا۔ اکٹھے کمار پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا تھا۔ اور اب وہ بھی گولیاں چلا رہا تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے اس کی طمنچ کی رنج سے باہر نکل آئے تھے۔

”بیٹا! مندر کے اندر ہو کر نکل جاؤ محفوظ رہو گے۔“ اسی مہنت نے زور سے کہا جسے ہم صبح جاپ کرتا دیکھ چکے تھے۔

”جلدی کرو پولیس والے گھوم کر جتنی دیر میں یہاں آئیں گے تم کافی دور جا چکے ہو گے۔“ مہنت نے پھر کہا۔

ڈوبتے وقت تک ابھی شہتیر لگتا ہے۔ میں نے بھی اس کا کہا مان لیا اور ہم مندر میں داخل ہو گئے۔

مندر کی دوسری طرف بھی ایک چھوٹا سا دروازہ تھا ہم اس دروازے کو کھول کر باہر نکل آئے۔ ابھی ہم مندر کے پیچھے نکلے ہی تھے کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کے پاس سے گزری۔ میں نے جلدی سے خود کو گرا لیا اور لڑھکتے ہوئے جھاڑیوں کی آڑ لے لی۔ آڑ لیتے ہی میں نے گولی چلا دی۔ گولی برباد گئی مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ مجھ پر فائر کرنے والا اپنی جگہ پر چھپا کھڑا رہ گیا۔ آصف جاہ نے بھی اپنی پوزیشن لے لی تھی۔ ہمیں ایک قدرتی مورچل گیا تھا۔ مٹی نکالنے کے لیے محلے والوں نے گڑھا کھودا تھا ہم اسی میں بیٹھ کر مقابلہ کرنے لگے۔ دونوں جانب سے گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

”یہاں چھپے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ایسا کرو تم پہلے نکلو میں ان مردودوں کو روکے رکھتا ہوں۔“

”نہیں آپ نکلیں میں مقابلہ کرتا ہوں آپ باغ کی طرف بڑھیں۔“

اس کی ضد کے آگے میں ہار گیا اور سینے کے بل رہنے لگا ہوا میدان کے عقبی طرف اگی ہوئی جھاڑیوں کی سمت بڑھنے لگا۔ آصف جاہ رک کر فائر کر رہا تھا۔ پتا نہیں اس کے پاس کتنی گولیاں تھیں۔ میرے پاس تو بہت کم گولیاں باقی تھیں۔ میں دھیرے دھیرے جھاڑیوں تک پہنچ گیا۔ جھاڑیوں کے درمیان پہنچتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے پولیس پارٹی کی طرف دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا۔ اکٹھے کے برابر میں رنجیت کھڑا تھا۔ شاید اسی کہینے نے پولیس والوں کو بلایا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ جیب والی واردات کی خبر اخباروں میں بھی آئی ہوگی اور رنجیت نے بھی پڑھا ہوگا۔ اس وقت اس نے اس کا اظہار نہیں کیا بلکہ پولیس کو بلالایا۔ میں پھرتی سے قریبی درخت پر چڑھ گیا اور زندگی کو داؤ پر لگاتے ہوئے رنجیت کا نشانہ لیا۔ پہلی ہی گولی کا گر ثابت ہوئی اور وہ چیخ کر الٹ گیا۔ اکٹھے ہوشیار ہو چکا تھا اور اپنے جیب کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ میں نے پھر فائر کیا۔ اس بار ایک سپاہی کا

نشانہ لیا تھا جو آصف جاہ پر فائز کر رہا تھا۔ وہ سپاہی بھی چیخ کر اٹ گیا۔ میری دو گولیوں نے دشمنوں کے دو مہروں کو الٹ دیا تھا اور آصف جاہ کو سنبھلنے کا موقع دے دیا تھا۔ وہ بھی اس قدر ترقی مورچے سے نکل کر جھاڑیوں تک پہنچ گیا۔

”اب نیچے آجائیے۔“ اس نے کہا۔

میں اوپر سے اتر آیا اور دو تین فائر کرنے کے بعد باغ کی جانب دوڑنا چلا گیا۔ باغ میں پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ ایک جیب کھڑی ہوئی تھی مگر خالی تھی۔ اس میں کوئی بھی نہ تھا۔ جیب کو خالی دیکھ کر آصف جاہ بھی گھبرا اٹھا تھا، تبھی نزدیکی پیر سے ایک آدمی کودا، میں نے چونک کر ادھر دیکھا اس آدمی کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ اسے دیکھتے ہی آصف جاہ نے کہا ”اللہ تیرا شکر ہے“۔ پھر وہ تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ”یار تم بھی عجیب انسان ہو میں تو ڈر رہی گیا تھا۔“

”میں حالات کا جائزہ لے رہا تھا کہ تم لوگوں کو مدد کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اپنی جانب سے اس لیے پہل نہیں کر رہا تھا کہ خواہ مخواہ پولیس والے ادھر متوجہ ہو جاتے۔ تم لوگوں نے تو کمال کر دیا۔ اکشے کمار پانچ سپاہیوں کے ساتھ آیا تھا اور اس میں سے تم نے چار کو مار گرایا، باقی رہ گیا ایک سپاہی وہ اکشے کمار کے ساتھ بھاگ رہا ہے۔ یہی موقع ہے ہم اسے راستے میں گھیر لیتے ہیں۔“

”چلو اسے شہر نہیں پہنچنے دیں گے۔“ آصف جاہ نے کہا۔

”مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اکشے یہاں کیسے پہنچ گیا۔ یہ علاقہ تو اس کے تھانے کی حدود میں نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ نے غور نہیں کیا رنجیت کے ساتھ جو کھڑا تھا وہی اس علاقہ کا تھانہ دار تھا۔ اکشے کسی کام سے یہاں آیا ہوگا۔ اسے جب آپ کے بارے میں معلوم ہوا تو دوڑا چلا آیا۔“ ڈرائیونگ کرنے والے نو جوان نے کہا۔

ہم باغ سے نکل کر سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ اکشے کو اسی راستے سے گزرنا تھا۔

”شاید! جیب کو سڑک کے درمیان روک کر کھڑا کر دو۔ ہم کچھ پہلے کسی چیز کی اوٹ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسے ہی وہ آئے گا سڑک کے درمیان کھڑی جیب اس کا راستہ روک لے گی۔“

آصف جاہ کا مشورہ برا نہیں تھا، شاہ حسین نے جیب کو سڑک پر کھڑا کر دیا۔ ہم نیچے اترے اور نشیب کی جانب دوڑتے چلے گئے۔ ایک ٹیلے کی آڑ میں شاہ حسین کھڑا ہو گیا، میں نے ایک پٹر کی آڑ لے لی۔

آصف جاہ سڑک کی دوسری جانب نشیب میں سینے کے بل لیٹ گیا تھا۔ مورچہ بندی کے بعد ہم اکشے کا انتظار کرنے لگے۔ قصبے سے نکلنے کا واحد راستہ یہی تھا۔ اسے بھی اسی راستہ سے آنا تھا۔ ہماری نظریں سڑک پر ٹکی ہوئی تھی۔ ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ دور سے دھول اڑاتی ایک جیب آگے بڑھتی نظر آئی۔ ہم سب الٹ ہو گئے۔ سانس روکے ادھر دیکھنے لگے۔ جیسے ہی جیب ہماری ریچ میں آئی میں نے فائر کر دیا، میرا نشانہ ناز تھے۔ دھماکے کے ساتھ دو ناز پھٹ گئے۔ جیب ناکارہ ہو گئی۔ اس اچانک حملے سے اکشے گھبرا اٹھا۔ اس نے جیب سے چھلانگ لگائی۔ سڑک کی دوسری جانب آصف جاہ اسی لمحے کا منتظر تھا اس نے فائر کر دیا۔ گولی اس کے ساتھ بیٹھے سپاہی کے سر میں لگی۔ میں نے بھی فائر کیا۔ گولی اکشے کے

بالوں کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔

”ہنڈ زاپ!“ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

اکشے نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ اتنی دیر میں آصف جاہ اور اس کا ساتھی بھی سڑک پر پہنچ گئے۔

”تم کو رکھے رہو میں تلاشی لے لیتا ہوں۔“ میں نے آصف جاہ سے کہا۔

”بے فکر رہو۔ اگر یہ بلا بھی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“ آصف جاہ نے جواب دیا۔

باکس ہاتھ میں گن لے کے میں آگے بڑھا۔ مجھے دیکھتے ہی اکشے کی آدمی جان نکل چکی تھی۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ میں

نے داہنے ہاتھ سے اس کی تلاشی لی۔ اسلحے کے نام پر اس کے پاس فقط قلم تراش تھا۔ شاہد ڈیوٹی پر نہ ہونے کی وجہ سے وہ بغیر اسلحے کے یہاں آیا تھا۔

میں نے جیب میں رسی دیکھی تھی۔ شاید ٹوچنگ کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ میں بھی اس سے ٹوچنگ کا کام لینے والا تھا مگر انداز

جدا تھا۔ گاڑی کو گاڑی سے نہیں گاڑی سے آدمی کو کھینچنے والا تھا۔ میں نے اکشے کے دونوں ہاتھ باندھے اور پھر اسی رسی کے دوسرے سرے کو جیب

سے باندھ دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹوچنگ کے لیے گاڑی سے گاڑی کو باندھتے ہیں۔ میری اس کارروائی کو آصف جاہ اور اس کا ساتھی بڑی حیرت

سے دیکھ رہے تھے۔

اکشے کو باندھنے کے بعد میں نے آصف جاہ سے کہا ”چلو فوراً پیٹھ جاؤ۔“ میں بھی ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھا تبھی میری نظربیک ویو

مرر پر پڑی اور میں غصے میں بھر گیا۔ میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں انکارہ بنی ہوئی تھیں میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی سیلف لگایا اور پھر ایک سیلٹر دہاتا چلا

گیا۔ پہلے ہی جھٹکے میں وہ سڑک پر گرا تھا پھر کھشتا چلا گیا تھا۔ زمانہ قدیم میں بادشاہان مجرموں کو اسی طرح گھوڑوں سے گھسیٹتے تھے۔ زمانے نے ترقی

کر لی۔ گھوڑے کی جگہ موٹر ویکل نے لے لی۔ انگریز جب قدیم انداز میں ظلم کر سکتے تھے تو ہم بدلہ اسی انداز میں ان کے پٹھوں سے کیوں نہیں لے

سکتے؟ مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ دیر میں مرجائے گا۔ اس نے جس طرح مجھے ذہنی اذیت دی تھی میری معصوم صبا کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کے مقابلے

میں یہ کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اسے سسکا سسکا کر کئی دن میں ختم کروں گا۔ اس پر اتنا تشدد کروں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی عبرت

کے لیے اس واقعے کو یاد رکھیں گی۔ لیکن افسوس میرے پاس ہانڈنگ پوائنٹ نہیں تھا۔ اگر چھپنے کی جگہ مل جاتی تو میں اپنی قسم ضرور پوری کرتا، اس سلسلے

میں آصف جاہ بھی مدد دے سکتا تھا۔ ان کی بھی تو پناہ گاہیں ہوں گی۔ وہ کسی ایک میں اس بد بخت کو قید کر سکتا تھا مگر مجھے یہ بات پسند نہ تھی اس لیے کے

وہ لوگ عوام کی جنگ لڑ رہے تھے اور میں اپنی۔ میں اپنے ذاتی مقصد کے لیے ان جبری افراد کا سہارا نہیں لینا چاہتا تھا اسی لیے وہ لوگ فی الفور سزا

دینے کی ہامی تھے۔ ابھی ہم پکی سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک جیب نظر آئی۔ وہ جیب ابھی بہت دور تھی مگر اس کو دیکھ کر میرا دل

دھڑک اٹھا۔ وہ جیب پولیس کی تھی۔ ہم ایک عجیب منحصرے میں پھنس چکے تھے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ ہم جیب کا رخ تبدیل کر سکتے تھے اور

آگے بھی نہیں بڑھ سکتے تھے کیوں کہ آگے بڑھتے ہی ہماری جیب کے پیچھے بندھے اکشے کو وہ دیکھ لیتے۔ ہم بری طرح پھنس گئے تھے۔

”گاڑی روک لو!“ میں نے جلدی سے کہا۔

آصف جاہ نے پھرتی سے بریک دبا دیا۔ جیپ کے رکتے ہی میں جلدی سے نیچے اتر اور اس کے کشتے کی جانب دوڑا۔ وہ جاں کنی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ رگڑ سے بری طرح مسخ ہو گیا تھا۔ ایسی بھیانک شکل ہو گئی تھی کہ دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو دونوں طرف کے پہیوں کے درمیان سیدھا رکھا اور آصف جاہ کو آہستہ آہستہ بیک کرنے کو کہا۔ جیپ دھیرے دھیرے پیچھے آنے لگی۔ اب اس کے جسم پوری طرح جیپ کے نیچے چھپ گیا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ اب اسے پولیس والے بہ آسانی دیکھ نہیں سکیں گے لیکن ابھی ایک ڈر باقی تھا۔ پولیس جیپ میں سوار کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا تھا جو مجھے پہچانتا ہو اس لیے میں سڑک کے کنارے کھیتوں کی جانب رخ کر کے بیٹھ گیا، ایک نظر میں مجھے دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ میں پیشاب کر رہا ہوں۔

میرا چہرہ کھیتوں کی جانب تھا مگر میرے کان سڑک کی جانب لگے ہوئے تھے۔ میں اس پولیس جیپ کے گزرنے کا منتظر تھا کہ گولیوں کی آواز سے پورا علاقہ گونج اٹھا، میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ہماری جیپ سے تقریباً دو ڈھائی فرلانگ پہلے ہی ایک پارٹی نے پولیس کی جیپ کو گھیر لیا تھا۔ اس جیپ میں کل چھ سپاہی تھے۔ وہ سب اپنی جیپ سے اتر کر آڑ میں پوزیشن لے چکے تھے اور اب اس پارٹی کا مقابلہ کر رہے تھے۔

پورا علاقہ دھماکوں سے گونج رہا تھا۔ یہ ایک الگ مصیبت تھی۔ قصبے میں ہم نے فائرنگ کر کے دہشت پھیلا دی تھی اس کی خبر افسران تک پہنچ چکی ہوگی اور وہاں سے مزید نفری چل پڑی ہوگی، آس پاس بھی کوئی نہ کوئی چوکی ہوگی۔ فائرنگ کی آواز اس تک پہنچ رہی ہوگی۔ وہ بھی آنے والے ہوں گے۔ یوں بھی اس دور میں فائرنگ اتنی عام نہ تھی۔ جہاں کہیں گولی چلتی اس کا ذکر مبینوں ہوتا تھا۔ تبھی سڑک کی دوسری جانب سے بھی پولیس کی جیپ آتی نظر آئی۔

ایسی حالت میں جب میری جیپ کے ساتھ ہمارا ایک مجرم بھی بندھا ہوا تھا ہمارا رکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ گوکہ ہم سڑک کے کنارے نہایت شرافت سے کھڑے تھے مگر ان سے ہمیں شرافت کی توقع نہ تھی۔ وہ نزدیک آتے ہی ہماری تلاشی لیتے اور ہمارے پاس ہتھیار بھی تھے اور زخمی اس کے بھی۔ تبھی آصف جاہ نے کہا ”چچا! آپ اس کے کما کو جیپ میں ڈالیں ہم اس آنے والی جیپ کو روکنے کے لیے جا رہے ہیں۔“

آصف جاہ اپنے ساتھی کے ساتھ نشیب میں اتر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ دونوں مسلح تھے جبکہ پولیس والوں کی ٹرک پر بڑی والی بندوق صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے بھی اپنی بندوق نکال لی اور بونٹ کھول کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے انجن میں کوئی خرابی ہو بونٹ کی آڑ میں اپنی گن رکھ لی تھی کہ ضرورت پڑتے ہی نکال لوں۔

پچھلی جانب دھواں دھار فائرنگ ہو رہی تھی۔ دونوں جانب سے اسلحہ کا استعمال ہو رہا تھا۔ تبھی سامنے بھی مقابلہ شروع ہو گیا۔ شاید آصف جاہ نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ پولیس والے بھی جواب دے رہے تھے۔ میں مجھے میں پھنس گیا تھا۔ سڑک کے دونوں سرے بند ہو گئے تھے۔ میں کسی بھی طرح نکل نہیں سکتا تھا۔ پولیس والے تو اپنی جگہ مورچہ بند تھے لیکن آنے والا دستہ گولیاں چلاتے ہوئے آگے بڑھتا آرہا تھا۔ یہ مصیبت اس نئی پارٹی نے ہمارے سر منڈھ دی تھی جو پتا نہیں کہاں سے درمیان میں آکھڑی تھی۔ اگر وہ درمیان میں نہ آ جاتی تو ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے۔ کب کا اس منحوس قصبے سے نکل چکے ہوتے۔ اس کے سے انتقام لینا ہمارا مقصد تھا اور یہ مقصد کب کا پورا ہو چکا تھا۔ اب تو وہ

بدبخت میری جیب کے نیچے مردوں کی طرح پڑا کر رہا ہے اور یقیناً اپنی موت کی دعا مانگ رہا ہوگا کیونکہ اب تو اس میں اتنی بھی قوت نہیں بچی تھی کہ وہ اٹھ کر بھاگ سکتا۔ وہ کروٹ بدلنے کی حالت میں بھی نہ تھا پھر بھی میں نے جھک کر اسے دیکھا، وہ جہاں پر لیٹا تھا وہ جگہ اس کے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ میں نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا اور آصف جاہ کی مدد کے لیے آگے بڑھنے لگا۔

ایک جانب پولیس والے تھے جنہیں اس نئی پارٹی نے روک رکھا تھا اور دوسری جانب نیا دستہ جنہیں آصف جاہ اور اس کے ساتھی نے روک رکھا تھا۔ پولیس والوں سے ٹکرانے والی پارٹی کے اسلحوں کی آوازیں بتا رہی تھی کہ وہ خاصے مضبوط ہیں پھر تعداد میں بھی زیادہ ہیں جبکہ آصف جاہ اور اس کا ساتھی نئے آنے والوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھے۔ ان کو تو اسی کام کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ انہیں تو صرف لڑنا مارنا ہی آتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں آصف جاہ مبتدی تھا۔ اسے مدد کی زیادہ ضرورت تھی اسی لیے میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کھڑے ہونا موت کو دعوت دینے کو مترادف تھا اس لیے میں سینے کے بل ریگلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی میں بمشکل ڈھائی تین میٹر آگے بڑھا تھا کہ عقب سے زبردست دھماکا سنائی دیا۔

میں سرعت سے پلٹا، دیکھا پولیس کی جیب سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ شاید جیب پر دستی بم مارا گیا تھا، میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ ”خس کم جہاں پاک۔“ میں نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا اور آگے کی جانب پھر سے ریگلتے لگا۔ تبھی میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی اور میں دھیرے دھیرے اٹھ بیٹھا۔ بیٹھتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ نئے آنے والے دیکھ نہ سکیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں کوئی پولیس والا فوج کراہر تو نہیں آ رہا ہے مگر ایک بھی پولیس والا نظر نہیں آیا، شاید سب کے سب کام آچکے تھے۔

میں نے نئی پارٹی کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ وہ والے ہتھیار جو صرف پولیس والوں کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ سب سڑک کی دوسری جانب سے سینے کے بل آگے کی جانب ریگ رہے تھے۔ ان کے کرونگ کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سب ٹرینڈ ہیں۔ یقیناً ان کا کسی ایسے گروپ سے تعلق ہوگا جو فوجیوں کے خلاف لڑنے کی ٹریگ لے چکی ہے۔ شاید آزاد ہند فوج کے جوان بھی ہو سکتے تھے۔ اس لیے کہ کئی شہروں میں فوج سے رٹائرڈ فوجیوں نے مادر وطن کو آزاد کرانے کے لیے ٹکڑیاں بنالیں تھی۔ جو آزاد ہند فوج میں شامل ہونے کے لیے ملیشیا جانے والے تھے۔ یہ بھی شاید ایسے ہی کسی گروپ کے لوگ تھے تبھی تو انہوں نے اتنی آسانی سے پولیس والوں کا کام تمام کیا اور اب وہ نئے آنے والی پولیس کی ٹکڑی سے دودھ ہاتھ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔

اب پولیس کے لڑاکا دستے والوں کو ہر حال میں پسپا ہونا پڑے گا۔ میں نے خود سے کہا اور دوبارہ آگے کی جانب ریگلتے لگا تبھی پولیس کے لڑاکا دستے والوں نے ان چاروں پر فائر کیا۔ شاید انہوں نے ان چاروں کو دیکھ لیا تھا۔ جواب میں ان چاروں نے بھی فائر کیا اور سرعت سے نشیب میں اتر گئے۔ نشیب میں اتر کر انہیں نے باضابطہ مقابلہ شروع کر دیا تھا۔ اب معاملہ کچھ یوں تھا۔ سڑک کی ایک جانب وہ چاروں تھے اور دوسری جانب آصف جاہ اور اس کا ساتھی۔ درمیان میں پھنسے پولیس کے لڑاکا دستے والے دونوں کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن ان میں سے ایک بھی ٹرک کے باہر نہ تھا۔ تین سپاہی نیچے اترے تھے جن کی لاشیں سڑک پر پڑی تھیں۔ جیب پر بھی سپاہیوں کی تعداد کم تھی۔ فائرنگ کا انداز یہ اشارہ دے رہا تھا کہ تین یا چار فوجی سے زیادہ نہیں ہیں لیکن یہی تعداد لڑاکا دستے کے لیے خطرناک تھی۔ سب سے زیادہ خطرہ اس فوجی سے تھا جو ڈرائیور ہڈ میں بنے

بڑے سے ہول میں کھڑا تھا۔ سامنے سے وہ کورڈ تھا اس لیے اب تک آصف جاہ وغیرہ سے محفوظ تھا۔ پھر ان کے پاس جدید اور خطرناک اسلحہ تھا جب کے نوجوانوں کے دستے میں صرف عام سی بندوقیں تھیں۔

تبھی میرے دماغ میں یہ بات آگئی کہ کیوں نہ میں یہیں سے اسے نشانہ بناؤں کیونکہ نزدیک سے اس کا نشانہ لینا ممکن نہ تھا لیکن ایک بڑی پریشانی یہ تھی کہ میرے ہاتھ میں معمولی گن تھی اور وہ پولیس والا رنچ سے باہر تھا۔

میں فوراً پلٹ گیا۔ اب میرا رخ جیپ کی جانب تھا۔ میں کروٹ لگ کر تا ہوا جیپ کے نزدیک پہنچا اور اس میں رکھے اسلحے کے ڈھیر سے ایک پولیس والی گن اٹھالی۔ یہ دور سے وار کرنے میں زیادہ موثر تھی۔ میں اسے لے کر جیپ کی بونٹ پر چڑھ گیا۔ وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے میں بہ آسانی اس فوجی کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ اگر نزدیک میں کوئی بیڑ ہوتا تو اور بھی آسانی ہوتی۔ مجبوری میں ہی میں جیپ کے بونٹ پر چڑھا تھا۔ ترپال کی ہڈ سے میں نے تھوڑا سا سر ابھارا۔ ٹرک پر کھڑا فوجی صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے ہڈ پر گن رکھی۔ اور اس فوجی کا نشانہ لینے لگا۔ اس نے خود پہن رکھا تھا اس لیے سر پر گولی بے اثر ثابت ہوتی مجبوراً میں نے اس کی گردن کو ہدف بنایا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا نشانہ خطا نہیں ہوگا اور اسکی گردن پر روشن دان بن جائے گا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا اور اپنی کامیابی کی دعا مانگتے ہوئے ٹریگر پر دباؤ بڑھا دیا۔ میرا نشانہ سچا تھا۔ گولی اپنے ہدف پر لگی اور وہ سپاہی لڑھک گیا۔ اس کا کام تمام کرتے ہی میں نیچے اتر آیا۔ اب جتنے بھی سپاہی تھے وہ آڑ میں بیٹھے تھے۔

میں بونٹ سے اتر آیا اور آہستہ آہستہ ریگلتے ہوئے آصف جاہ کی مدد کو آگے بڑھنے لگا۔ دوسری پارٹی نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ سڑک کی دوسری جانب سے فائرنگ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ”شاید وہ لوگ خاموشی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔“ اس وقت یہی بات میری سمجھ میں آئی تھی۔

ابھی میں آصف جاہ سے دس بارہ میٹر کی دوری پر تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جو انردی کی زندہ مثال آصف جاہ کا دست راست سینہ پکڑ کر الٹ گیا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ آصف جاہ اس کی چیخ سن کر پلٹا تھا۔ یہ لاشعوری حرکت اسے بھی مہنگی پڑی۔ یکا یک اچھل جانے کی وجہ سے وہ آڑ سے باہر آ گیا تھا۔ اس کا فائدہ سپاہیوں نے اٹھالیا۔ اسے بھی ایک گولی آ کر لگی اور وہ اپنے دوست کے برابر میں گر پڑا۔ ان دونوں کو گرتے دیکھ کر میں ان کی طرف دوڑا تھا۔ ابھی میں نشیب میں تھا اس لیے بے خوف تھا کہ فوجیوں کی نگاہوں سے میں اوجھل ہوں لیکن میری یہ خام خیالی فوراً ہی دور ہو گئی۔ ایک گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ میں پھرتی سے پھر لیٹ گیا۔ شاید کوئی فوجی سڑک کے کنارے تک آپہنچا تھا تبھی تو اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ یہی سوچتا ہوا میں آگے کی جانب سرکنے لگا۔ کئی اور گولیاں بھی میرے اوپر سے گزریں۔ اب خاموش رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں نے بھی فائرنگ شروع کر دی لیکن میری فائرنگ اندھے کی لانٹھی تھی۔ بغیر کسی ہدف کے میں گولیاں چلا رہا تھا۔ میری یہ کوشش کافی حد تک کامیاب رہی۔ ایک بھی سپاہی آگے بڑھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ سب اپنی ہی جگہ جے فائر کیے جا رہے تھے۔

میں لیٹے لیٹے آگے کی جانب کھسک رہا تھا۔ ادھر ایک نیلہ تھا۔ کھلے میدان میں وہی ایک جائے پناہ تھی اسی لیے میں اس نیلے کی آڑ میں پہنچنا چاہتا تھا۔

کافی جدوجہد کے بعد میں نے کامیابی حاصل کر لی۔ اس نیلے کے پیچھے پہنچ کر میں نے اطمینان کی سانس لی اور پھر آڑ سے جھانکا۔

آصف جاہ اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اسی کے برابر میں اس کا ساتھی بھی خون میں غلطاں تھا۔ اس کے ساتھی کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ مر چکا ہے کیونکہ گولیاں اس کے سینے میں لگی تھیں لیکن آصف جاہ کے بارے میں اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ اسے صرف ایک گولی لگی تھی۔ خدا کرے وہ گولی کسی حساس جگہ نہ لگی ہو اس طرح اس کے بچ جانے کی امید تھی۔

میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر اوپر سڑک کی جانب دیکھا۔ سڑک پر سپاہی اب کچھ اور آگے آگئے تھے اور وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہے تھے مگر ان کا نشانہ ٹیلہ نہیں وہ گڑھا تھا جہاں میں کچھ دیر پہلے لیٹا فائر کر رہا تھا۔

مجھے اس نئی پارٹی پر حیرت ہو رہی تھی کی اب تک ان لوگوں نے فائر کیوں نہیں کیا۔ اگر وہ چاہتے تو دوسری جانب سے فائر کر کے مجھے کور دے سکتے تھے۔ تبھی میرے دماغ میں ایک نئی بات آئی کہ یہ معمولی پولیس والے نہیں کمانڈو ہیں۔ ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوا کرتا۔ ہو سکتا ہے پارٹی کوئی چال چلنا چاہتی ہو اور اسی لیے اب تک وہ لوگ خاموش ہیں لیکن میں کیا کروں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی تبھی مجھے ایسا لگا کہ میرے پیچھے کوئی ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ انہی چاروں میں سے ایک جو نہ جانے کب سڑک کر اس کے اس جانب آ گیا تھا اور اب دھیرے دھیرے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا دیا۔ وہ بھی مسکرایا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کی مسکراہٹ مجھے کچھ عجیب سی لگی اور سب سے عجیب بات تو تب ہوئی جب وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ اس نے قریب آتے ہی اپنی گن کا بیرل میری گدی پر رکھ دیا اور غرایا ”اپنی گن پھینک کر خود کو پولیس کے لڑاکا دستے کے حوالے کر دو۔“

میں نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی رقصاں تھیں۔ کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے گن پھینک دیا۔ ”تم لوگ بے وقوفوں کی طرح انگریز سرکار سے لڑ رہے ہو۔ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ایسے دیش دروہی (خدا روٹن) کو پکڑنے کے لیے سرکار نے ہمیں بھی لندن سے ٹریگ دلوائی ہے۔ ہم پہلے مجرموں میں گھستے ہیں، ان کے ساتھی بن کر ایک ایک کو گرفتار کر لیتے ہیں۔“ وہ قریب آیا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔

اس دھماکے نے اسے بھی چوٹ لگائی اور وہ سڑک پر گر پڑا۔ اُدھر سے زخمی آصف جاہ گولیاں چلاتے ہوئے آرہا تھا۔ اگر میں اس موقع کا فائدہ نہ اٹھاتا تو مجھ سے بڑا کوئی بے وقوف نہ تھا۔

دھماکا ہوتے ہی پانسہ پلٹ گیا۔ میں نے پھرتی سے گن اٹھایا تھا اور اس کے سر کا نشانہ لیے بغیر فائر کر دیا تھا۔ بس میں نے اتنا دیکھا تھا کہ وہ گرا تھا پھر میں بھی رکنا نہیں تھا میرے لیے یہ وقفہ نعمت سے کم نہ تھا اور میں دوڑنے کی رفتار سے بھاگنے لگا تھا۔ جب جان پر بن آتی ہے تو چوہا بھی شیر بن جاتا ہے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اب یہ کیس معمولی نہیں رہا۔ پٹنہ تک محدود کیس نہیں رہا ہے اب میرے پیچھے پوری رائل فورس لگ جائے گی۔ لندن کے ایوان میں بھی اس حادثے کی گونج سنائی دے گی۔

میرے لیے تمام راستے بند ہو گئے تھے۔ اب مجھے اپنی عقل سے خود کو محفوظ رکھنا ہوگا۔ ایک لمحے کے دسویں حصے میں خیال آیا اور میں بھاگتا چلا گیا تھا۔

میں سیدھے سیدھے بھاگتا چلا جا رہا تھا کافی دور آنے کے بعد مجھے ایک بیڑ کے نیچے بیٹھے کچھ لوگ نظر آئے۔ ان کے قریبی میدان میں گھوڑے چر رہے تھے۔ یقیناً انہی لوگوں کے ہوں گے۔ اس دور میں سواری کا اعلیٰ ذریعہ ہی یہی تھے۔

وہاں تک دھماکا اور فائرنگ کی آواز یقیناً سنائی دی ہوگی مگر وجہ اور دھماکے کا نتیجہ ان کے علم میں نہیں ہوگا اسی لیے وہ سب حیرت و تجسس سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

وہ سب میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ جانتا چاہتے ہوں کہ میں کیوں بھاگ رہا ہوں؟ میری نظر انہی کی طرف تھی مگر قریب پہنچتے ہی میں نے رخ اُسی طرف موڑ دیا جہر گھوڑے چر رہے تھے۔۔۔ جیسے ہی ایک گھوڑا قریب آیا میں اُچھل کر اُس پر سوار ہو گیا۔ وہاں بیٹھے سب کے سب چیختے ہوئے دوڑے مگر میں رکنا نہیں گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سر پٹ دوڑاتا چلا گیا۔

کافی آگے جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے تعاقب میں دو گھڑ سوار لگے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ میرے والے گھوڑے کے مالک کے ہی خواہ ہوں گے۔ اُن کے ہاتھ آنے کا مطلب تھا جان سے ہاتھ دھولینا۔ چور کی پٹائی کیسی ہوتی ہے اس کا مشاہدہ کر چکا تھا اس لیے میں نے گھوڑے کو سست ہونے نہیں دیا تھا اور بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا۔

مجھے معلوم تھا آگے جانے پر وہ مشہور پل ہے جو بانگی پور اور دانا پور کو جوڑتا ہے۔ اُس پل کے نیچے سے کل کل کرتی ہوئی ندی گزرتی ہے۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح میں اُس پل تک پہنچ جاؤں کیونکہ میرا گھوڑا تھکنے لگا تھا۔ اُس کی رفتار میں اب دم خرم نہیں تھا جبکہ تعاقب میں آنے والوں کے گھوڑے عربی النسل تھے خوب اونچے پورے۔ اُن کی رفتار بھی تیز تھی۔ وہ جس طرح سے بڑھتے چلے آ رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ بس کچھ دیر کی بات ہے کہ وہ میرے برابر پہنچ جائیں گے اسی لیے میں ایڑ پر ایڑ لگا رہا تھا اور میرا گھوڑا منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا پوری قوت لگا کر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

اب مجھے تعاقب میں آنے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں بہت نزدیک سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اُن میں سے ایک رکاب پر پیر کا کرکڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اُس کے ہاتھ میں کند تھی۔ شاید وہ کند پھینک کر مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔ یہ اور خطرناک بات تھی۔ میں اپنے گھوڑے پر تقریباً لیٹ گیا۔ پوری طرح اُوندھا ہو گیا تاکہ کند میرے گلے میں نہ پھنس سکے۔ ساتھ ہی ساتھ بھرپور انداز میں ایڑ لگا دی مگر میں اپنے گھوڑے کی رفتار کو بڑھانہ سکا جبکہ وہ قریب سے قریب آتا جا رہا تھا۔

میری پوری کوشش تھی کہ میں کسی بھی طرح ندی پر بنے پل تک پہنچ جاؤں۔ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب تھا۔ پل اب زیادہ دور نہیں تھا۔ میں اب پل تک پہنچنے ہی والا تھا۔ پل کی دوری بس ایک فرلانگ تھی۔ یہ ایک فرلانگ بھی اُس وقت مجھے کوسوں دور لگ رہا تھا۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر ایڑ لگائی گھوڑے کو الف کرنا چاہا اور تہجی زن سے کوئی چیز میرے کانوں کے نزدیک سے گزری۔ میں سمجھ گیا اُس نے کند پھینکی ہوگی۔ اُس کا یہی مطلب تھا کہ اب میں اُس کی کند کی زد میں ہوں۔ اُس وقت مجھے اللہ یاد آیا اور میں نے خدا کا نام لے کر گھوڑے کو پھراڑ دے دی۔

خدا مسبب الاسباب ہے سب کی سنتا ہے۔ میری بھی سن لی اور میرے گھوڑے کے سموں نے پل کو چھو لیا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا تہجی مجھے یاد آ گیا کہ میری پنڈلی پر خنجر بھی بندھا ہوا ہے۔ میں نے جھک کر خنجر کو نکالا اور ہاتھوں میں لے لیا تاکہ اگر کند میرے گلے میں پھنس بھی

جائے تو میں کاٹ سکوں گو کہ یہ ناممکن سی بات تھی پھر بھی کوشش تو کرنی ہی تھی۔

اب میرا گھوڑا اہل کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، گھوڑے والا بالکل سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے رکاب سے بیہر نکالا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہوا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔

میرا یہ اقدام بروقت تھا۔ میں تقریباً اڑتا ہوا چھپاک کی آواز کے ساتھ نیچے گرا تھا اور بہتے پانی کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا تھا۔ اتنی اونچائی سے چھلانگ لگائی تھی۔ کافی گہرائی تک چلا گیا تھا۔ اندر ہی اندر تیرتے ہوئے آہستہ آہستہ اوپر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا مگر میں بھی پوری کوشش کر رہا تھا۔ نتیجتاً آہستہ آہستہ میں سطح آب پر ابھر آیا۔ اوپر آنے کے بعد میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس جائزے کے بعد میں خوف سے کانپ اٹھا۔ دونوں کناروں پر پولیس کی بھاری جمیعت کھڑی تھی۔ ان سب کی نظریں میری طرف تھیں۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ اگر میں بروقت چھلانگ نہ لگاتا تو پولیس کے زرخے میں آ جاتا۔ وائرلیس یا کسی ذریعے سے پولیس کو الارٹ کر دیا گیا تھا اور ان لوگوں نے ہل کی دوسری طرف گھیرا ڈال رکھا تھا۔ یقیناً شہر کی پولیس بھی پیچھے آ رہی تھی، تبھی تو دوسرا کنارہ بھی بھرا ہوا تھا۔ اُس وقت پولیس والوں کی فائرنگ کی ایسی اجازت نہ تھی جتنی اس دور میں ہے ورنہ میرا بدن چھلنی ہو چکا ہوتا۔ اُس وقت تک پولیس والوں کے پاس اتنی وافر تعداد میں آتشیں اسلحے بھی نہیں رہتے تھے اس لیے وہاں موجود پولیس والے صرف چیخنے کے علاوہ کچھ نہیں کر رہے تھے۔

میں نے پھر غوطہ لگا دیا اور پانی کے نیچے بہاؤ کے رخ پر تیرنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر باہر نکالتا اور سانس لے کر پھر نیچے چلا جاتا۔ میں جلد سے جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ تیرتے تیرتے کافی آگے نکل آیا تھا۔ میں نے سر باہر نکال کر کنارے کا جائزہ لیا۔ پولیس پارٹی کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ دونوں کنارے سنسان ہو رہے تھے۔ اب میں نے کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ میں پانی سے نکل کر خشکی پر آ جاتا تو زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ سکتا تھا۔ میں اسی خیال کے تحت کنارے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں خشکی پر پہنچ گیا۔ یہ پٹنہ شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔ یہاں سے شہر پہنچنے کے لیے ٹانگہ یا ٹیل گاڑی مل سکتی تھی مگر ابھی فوراً شہر میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے میں کسی پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلتا رہا۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے ایک گھر نظر آیا۔ مٹی اور کھیریل کا بنایا گھر کافی خوبصورت تھا۔ اُس کی خوبصورتی بتا رہی تھی کہ اُس میں رہنے والے اچھے لوگ ہیں۔ گھر کی دیواریں گوبر سے لپی ہوئی تھیں اور اُس پر چونے سے نقاشی کی گئی تھی۔ کچھ اور آگے بڑھا تو دروازے پر رگولی بنی نظر آئی۔

عام طور سے رگولی براہمن گھروں کی عورتیں بناتی ہیں اس لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے میرا نام پوچھا تو پرکاش دو بے بتاؤں گا۔ براہمن کو براہمن گھر میں بے آسانی جگہ مل سکتی ہے۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

اس گھر کے احاطے میں داخل ہوا ہی تھا کہ اندر سے نکل کر باہر آئی ایک عورت نظر آئی۔ اُس نے دھانی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ مانگ میں سرخ سیندور تھا گویا وہ شادی شدہ تھی۔ جیسے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھٹھک گئی اور فوراً ہی مڑ گئی۔ کچھ ہل بعد دروازے پر ایک پینتیس چالیس سال کا آدمی نظر آیا۔ وہ تیز قدموں سے میرے قریب آیا اور بولا۔ ”جی شریمان.....! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟“

”میں راستہ بھٹک کر ادھر آ گیا ہوں۔ مجھے پتہ نہ چلتا ہے۔“

”اچھا! آپ جاتری (مسافر) ہیں۔ چلیے میرے گھر چل کر وشرام (آرام) کر لیجیے۔ کل میں اناج لے کر منڈی جاؤں گا۔ میرے ساتھ ہی چلیے گا۔ میں تیل گاڑی پر آپ کو شہر پہنچا دوں گا۔“

میں تو آیا ہی تھا اسی خیال کے تحت اس لیے فوراً ہی اُس کے ہاں آرام کرنے پر راضی ہو گیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اندر داخل ہوا۔ پہلے ہی کمرے میں دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اُس دور میں شرفاء کی پہچان ہی چار پائی ہوا کرتی تھی کیونکہ کرسی، ٹیبل کا رواج رائج نہیں تھا۔ غریبوں کے گھر میں نروا (دھان کے خشک پودوں) کا بستر ہوتا تھا اور نسبتاً خوشحال گھروں میں چار پائیاں۔ اُسی چار پائی پر بیٹھا بھی جاتا تھا اور سویا بھی جاتا تھا۔ مجھے ساتھ لے کر وہ ایک چار پائی تک پہنچا پھر بولا۔ ”یہاں برا جیئے.....!“ (تشریف رکھیے!)

میں اشارہ پا کر بیٹھ گیا۔ وہ اندر والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے لیے جل پان (ناشتے) کا بندوبست کرتا ہوں۔“ کھانے کا سن کر میری بھوک جاگ اٹھی۔ ندی سے یہاں تک آنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگا تھا۔ تیز دھوپ میں چل کر آیا تھا اس لیے بھی بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں بے صبری سے اندر والے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک لوٹے میں پانی لے کر آیا۔ مسلمان اور ہندو کے لوٹے میں ایک واضح فرق ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے لوٹے میں ٹوٹی ہوئی ہے جبکہ ہندوؤں کا لوٹا گول بغیر ٹوٹی کا ہوتا ہے۔ اُس سے پانی پینے کا طریقہ مجھے آتا تھا۔ مسلمان پانی پینے کے لیے برتن میں منہ لگاتے ہیں مگر ہندو منہ لگانے کو غلط سمجھتے ہیں۔ وہ لوٹے کو منہ سے چار انگلی دور رکھ کر منہ میں پانی گراتے ہیں۔ اس طرح پانی پینا مسلمانوں کے لیے دشوار ہوتا ہے مگر میں پولیس کی نوکری کرتے ہوئے ہندوؤں کے ساتھ رہتے رہتے اُن کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ اس لیے اُن کے طور طریقے اچھی طرح معلوم تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر لوٹا لے لیا اور دروازے کے باہر جا کر کچھ پانی پیروں پر گرایا اور چہرے پر چھینٹنے مارے پھر لوٹ کر چار پائی پر آیا پھر چٹو میں پانی لے کر منہ ہی منہ میں پد پدایا اور چاروں طرف چٹو کے پانی کا چھینٹنا مار لیا۔ برہمن ایسا کرتے ہوئے کچھ پڑھتے ہیں۔ کیا پڑھتے ہیں یہ تو مجھے معلوم نہ تھا مگر اداکاری ایسی ہی تھی۔

پانی چھینٹنے کے انداز پر اُس شخص کے چہرے پر پہلے حیرت پھر خوشی چھا گئی۔ وہ بولا۔ ”بھائیہ ہمارے۔ آپ برہمن دیوتا ہیں۔ ہم بھی برہمن ہیں۔ کون سے برہمن ہیں؟“

”ہم تو دو بے ہیں۔“ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”اچھا! اچھا! دو بے ہیں..... ہم بھی جو بے ہیں۔“ کہہ کر اُس نے آواز دی۔ ”ارے بھئی.....! جلدی آؤ! ہمیں بھی بھوک لگ رہی ہے یہ بھی برہمن ہیں اس لیے ساتھ کھائیں گے۔“

اُس کی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ عورت دو تھالی میں چاول اور ساگ لے کر اندر آئی۔ اُس نے دونوں تھالیاں ہمارے سامنے رکھ دیں۔ مسلمان اور ہندو کے کھانے کا انداز بھی مختلف ہے۔ مسلمان نفاست سے انگلیوں سے نوالہ اٹھا کر کھاتے ہیں جبکہ ہندو کھانے میں ہتھیلی تک استعمال کرتے ہیں۔ پورا ہاتھ لٹھڑا لیتے ہیں۔ میں نے انہی کے انداز میں کھانا شروع کر دیا۔ مسلمان تھالی کے کنارے سے کھانا شروع کرتے ہیں

اور ہندو بیچ سے۔ میں نے بھی بیچ سے کھانا شروع کیا تھا۔ کھانا ختم کر کے میں نے ہاتھ دھوئے۔ عورت تھالی لے کر چلی گئی تھی۔

”آپ بھرام کریں.....!“ کہہ کر وہ بھی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جسم تو پہلے ہی تھکا ہوا تھا، اب پیٹ بھی بھر گیا۔ اناج کا اپنا نشہ ہے۔ مجھے بھی نیند کے جھپکے آنے لگے اور میں لیٹ گیا۔

میری آنکھ لگی تھی کہ نیند ٹوٹ گئی۔ شاید یہ میری چھٹی جس کا کمال تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میں فوراً اٹھ کر بیٹھا نہیں بلکہ آنکھیں بند کیے اندازہ لگانے کے لیے اسی طرح پڑا رہا۔ وہی شخص جو مجھے لے کر آیا تھا شاید اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ”ہاں..... اب ہمارے دلہہ ردور ہونے والے ہیں۔ سرکار کا انعام ہمیں ہی ملے گا۔ سر بیجی کو بلا کر دکھا دیا ہے۔ اُن کا بھی یہی کہنا ہے کہ یہ شخص وہی ہے جس کے بارے میں اعلان کیا گیا ہے۔ سر بیجی نے کہا ہے کہ وہ سرکار سے ہمیں ہی انعام دلائیں گے۔ وہ پولیس کو بلانے گئے ہوئے ہیں.....“

اس آواز نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ تو میرے چھانسنے کا جال ہے۔ اس بد معاش نے کس خوبصورتی سے مجھے چھانا ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے ہر آن یہی دھڑکا تھا کہ وہ بد بخت کسی لمحے کمرے میں آ سکتا ہے۔ میں گریبہ پا چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور نہایت آہستگی سے دروازہ کھولا پھر اُسی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل آیا۔

میرے سامنے وہ راستہ تھا جس سے چل کر میں یہاں آیا تھا۔ پیچھے گاؤں کے کچے کچے مکانات تھے جبکہ دائیں بائیں کماد کے کھیت تھے۔ میں نے کھیتوں میں چلنا پسند کیا اور تقریباً بھاگتا ہوا کھیت میں داخل ہو گیا۔ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی تھی۔ میں اُسی پگڈنڈی پر بڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں اُس گاؤں سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں اب بھی یہی خوف تھا کہ وہ شخص کمرے میں مجھے نہ پا کر میرے پیروں کے نشانات سے مجھے ڈھونڈنے نکل پڑا ہوگا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے کھیتوں کی پگڈنڈی کو ہی منتخب کیا ہو اور اب تب میں مجھ تک پہنچنے ہی والا ہوگا، میں اسی ڈر سے تیز تیز دوڑ رہا تھا۔

آہستہ آہستہ کھیت پیچھے چھوٹتے چلے جا رہے تھے۔ میں کھلے میدان میں پہنچنے والا تھا۔ اب صرف ڈھائی تین فرلانگ کا کھیت رہ گیا تھا۔ تبھی مجھے ایسا لگا جیسے ادھر ہی سے چند گھڑ سوار چلے آ رہے ہیں۔ پہلے مجھے گھوڑے کے ہنہانے کی آواز سنائی دی تھی پھر ٹاپوں کی آواز بھی آئی تھی۔ کچی زمین پر ٹاپ کی آواز ہلکی ہوتی ہے اسی لیے پہلے مجھے سنائی نہیں دی تھی۔

اُن دنوں پولیس والے گاؤں دیہات میں گھوڑوں پر سوار ہو کر راؤنڈ لگاتے تھے۔ کہیں پولیس والے نہ ہوں اس خیال کے آتے ہی میں نے کھیت کے اندر سرک جانا مناسب سمجھا اور پگڈنڈی سے اتر کر کھیت میں داخل ہو گیا۔ کچھ دور تک اندر اندر چلا پھر دُک کر بیٹھ گیا کیونکہ میرے چلنے سے کماد کے پودے ہل رہے تھے۔

مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہ گھڑ سوار اُس جگہ پہنچ گئے جہاں کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ اُن میں کتنے پولیس والے ہیں اس کا اندازہ نہیں لگا سکا کیوں کہ اُن کے گھوڑوں کے صرف پاؤں نظر آ رہے تھے۔ وہ پولیس والے ہی ہیں اس کا اندازہ مجھے ایسے ہوا کہ اُن میں سے کسی کو ”داروغہ بابو.....!“ کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ مخاطب کرنے والے نے کہا تھا۔ ”یہ جو بھاگا ہوا مجرم ہے اُسے پکڑوانے پر

سرکار ہمیں انعام دے گی ناں.....؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں، سرکار نقد انعام بھی دے گی اور کوئی اہم خطاب بھی۔“ یہ کوئی دوسری آواز تھی۔

میں سمجھ گیا کہ یہی داروغہ ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے آرہا ہے۔ جب یہ لوگ اُس گھر تک پہنچیں گے اور وہاں مجھے نہ پا کر یقیناً غصے میں بھراٹھیں گے، پھر پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈنا شروع کر دیں گے، اس لیے مجھے جلد سے جلد اس علاقے سے دور بہت دور نکل جانا چاہیے مگر یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا کیونکہ میں پیدل تھا اور وہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں زیادہ دیر تک اُن سے آگے بھاگ نہیں سکتا تھا پھر بھی میں نے اللہ کا نام لیا اور جیسے ہی وہ پگڈنڈی سے مڑے، میں دھیرے دھیرے کھسک کر کھیت کے کنارے آ گیا پھر کھڑا ہوا اور سرپٹ دوڑنے لگا۔ کھیت کے ختم ہوتے ہی میدان تھا اور میدان پار کرتے ہی ایک کچی سڑک تھی۔

ابھی میں اُس سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ مجھے کہاں نظر آ گئے۔ وہ ڈولی اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ اُن کے چلنے کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ ڈولی خالی ہے۔ خالی ڈولی والے خراماں خراماں چلتے ہیں جبکہ سواری والے نہایت تیز رفتاری سے۔ میں تیز تیز قدموں سے اُن کے پاس جا پہنچا اور بولا۔ ”بھائی.....! میں بیمار ہوں، مجھے احمد پورہ پہنچا دو گے، پورے ایک لاکھ دو سو گے۔“

ایک روپیہ ملے گا، یہ سن کر وہ چاروں فوراً راضی ہو گئے اور میں اُن کی ڈولی میں بیٹھ گیا۔ ڈولی یعنی پاکی میں صرف عورتیں ہی نہیں، مرد بھی بیٹھتے ہیں، اس لیے مجھے اُن کے راضی ہو جانے پر حیرت نہ تھی۔

چاروں کہاں مجھے لے کر دوڑتے ہوئے احمد پورہ کی طرف بڑھنے لگے۔ احمد پورہ شہر کا پہلا حصہ تھا۔ وہاں سے مجھے کوئی دوسری سواری بہ آسانی مل سکتی تھی، اسی لیے میں مطمئن انداز میں بیٹھا تھا کہ میرے کانوں میں سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ اس طرح سرپٹ گھوڑے وہی دوڑاتے ہیں جنہیں جلدی ہو یا پھر کوئی اُن کا پیچھا کر رہا ہو یا پھر وہ خود کسی کا پیچھا کر رہے ہوں۔

کہیں وہ میرے تعاقب میں تو نہیں ہیں؟ اس خیال کے آتے ہی میں دہل اٹھا اور پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ واقعی آنے والے لال پگڑی والے تھے۔ اُن دنوں یہی پولیس کی وردی تھی۔ اس لال پگڑی کا اتنا خوف ہوتا تھا کہ لوگ سرخ پگڑی کی جھلک دیکھ کر بھاگنے لگتے تھے۔ لیکن میں تو خود پولیس کی نوکری کر چکا تھا اس لیے بالکل نہیں گھبرا یا۔

شام دھیرے دھیرے رات کا چولا پہن رہی تھی اور سپاہی کا گھوڑا آہستہ آہستہ نزدیک آتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے خنجر کو پھر پنڈلی پر بندھے تھے سے کھول کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اس بار کسی ایک سپاہی کے گلے پر پھیر کر اپنے کھاتے میں ایک اور قتل کا اضافہ کر لوں گا۔ ابھی انھوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مختار نے عادت کے مطابق اندر آتے ہی دخل دیا۔ ”آپ نے اسے کاٹ لیا ہوتا، کاٹا کیوں نہیں؟“

”تم چپ رہو۔“ نور بیگم جو نہ جانے کب اندر آ گیا تھا اور خاموش کھڑا نور محمد کی روداد سن رہا تھا جلدی سے بولا۔

”ارے وہ پیچھے آرہے تھے انہیں تو ضرور کاٹنا چاہیے تھا۔“ مختار نے ٹرے سے جواب دیا۔

”تم خاموش رہو،“ نور بیگم نے ڈانٹا پھر نور محمد کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ہاں آپ سنائیں کیا بتا رہے تھے۔“

”میں بتا رہا تھا کہ گھوڑے کی ٹاپیں اب بالکل سر پر محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے جیسے اُن کی آواز تیز ہو رہی تھی، میرے جسم میں اکڑا ہٹ کا عنصر بڑھ رہا تھا۔ نہیں تک ٹن گئی تھیں۔“

میں نے پاکی سے جھانک کر دیکھا، سپاہی تیز تیز گھوڑا بھگاتا ہوا نزدیک آتا چلا جا رہا تھا، پھر وہ اُچھٹی سی نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پاکی پر عام طور سے امیر امراء ہی بیٹھتے ہیں اس لیے اس نے بھی یہی سمجھا ہوگا کہ کوئی مہاجن، نواب یا زمیندار جا رہا ہے۔ فرار آسانی کہاں پاکی کا سہارا لے گا۔ سپاہی کے آگے جاتے ہی میں نے ٹھنڈی اور گہری سانس لی۔ کہاں میری ڈولی کو کندھے پر رکھے اُسی رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ انہیں پتا بھی نہ چلا کہ چند لمحوں کے لیے یہ دنیا میرے لیے کتنی کٹھن بن گئی تھی۔ مجھ پر کیا گزر گئی ہے۔ میں ہر طرف سے مطمئن ہو کر پاکی کی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ نیند کے جھونکے آنے لگے اور میں بار بار نیند کا مزہ لینے کے لیے اپنا سر ڈھلکا تا رہا۔ شاید میں بے خبر سو جاتا کہ پاکی رُک گئی۔ کہاں میں نے پاکی کو زمین پر رکھ دیا تھا اور مجھے آواز دے رہے تھے۔ میرے خوابیدہ ذہن میں خیال ڈر آیا کہ میں پٹنہ پہنچ چکا ہوں اس لیے باہر نکل آیا۔ دورانہ دیر میں سفید مسجد کا اونچا مینار نظر آ رہا تھا۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کی ہر اُس جگہ میں جہاں ہندوؤں کا بڑا تیر تھ استھل ہے وہاں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی ہے۔ یقیناً یہ مسلمانوں کی ہستی ہے۔ مجھے کسی ایسی ہی ہستی میں پناہ مل سکتی تھی۔

میں نے ایک نظر ہستی پر ڈالی، پھر کھیں میں سے ایک روپیہ نکال کر پاکی والے کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ چاندی کا کلنی دار روپیہ لیتے ہوئے کہاں کے چہرے پر جو خوشی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔

وہ پیسے لے کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اُس کے ساتھی بھی ساتھ چل دیئے۔ میں کچھ دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا، پھر آگے بڑھا تھا کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے نادانستہ طور پر پاکی میں رکھا کبیل کندھے پر ڈال لیا تھا جو اب تک کندھے پر تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ پاکی والے نے بھی کبیل کو نہیں دیکھا۔ تب میرے دل نے کہا کہ ہو سکتا ہے یہ کبیل مجھ سے پہلے جو بھی پاکی میں سوار ہوگا، اُسی کا ہوگا ورنہ کہاں سے فوراً پہچان جاتے اور مانگ لیتے۔ میں نے کبیل کو کھول کر اوڑھ لیا۔ میرے بال پہلے ہی بکھرے ہوئے تھے۔ کبیل کے بگل نے چہرے پر پھیلی پریشان حالی کو سوا کر دیا ہوگا۔ میں اس بات پر خوش ہو رہا تھا کیونکہ اس طرح مجھے آسانی سے پہچانا نہیں جاسکے گا۔ میں یہی کچھ سوچتا ہوا آگے بڑھنے لگا، تبھی میری نظر حلوائی کی دکان پر پڑی۔ گاؤں دیہات میں جس قسم کے حلوائی ہوتے ہیں وہ دکان بھی ویسی ہی تھی۔ گھاس پھوس کے چھروالی جہاں صرف بیڑے اور میٹھی بندیاں ملتی ہیں یا پھر آؤر پر چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ میں اُسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ نزدیک پہنچ کر میں نے کہا۔ ”کچھ تیار ہے؟“

”دال اور کچوری ہے، پیڑا ہے۔“ جواب ملا۔ دکاندار نے لائین کی لو کو اونچا کر دیا تھا۔

میں نے اچھی خاصی مقدار میں یہ چیزیں خرید کر تھیلے میں رکھ لیں اور پھر آگے بڑھنے لگا۔ دراصل بھاگ دوڑ میں بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کہیں بیٹھ کر پیٹ کی آگ بجھالوں گا۔

میرا رخ ہستی کی طرف تھا۔ اُس جگہ سے ہستی کا فاصلہ بہ مشکل تین چار فرلانگ ہوگا۔ میں اس فاصلے کو دھیرے دھیرے کم کرنے لگا۔

اگر بستی میں کسی نے میرا تعارف پوچھا تو میں انہیں کیا بتاؤں گا؟ اس خیال کے آتے ہی میں الجھن میں پڑ گیا۔ میں انہیں کیا بتاؤں گا؟ یہ سوچنے کے لئے میں وہیں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ جگہ صاف ستھری تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں لوگ بیٹھتے ہوں۔

ابھی مجھے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایسا لگا جیسے کوئی ادھر ہی آرہا ہو۔ باتوں کی آواز ہوا کے دوش پر سوار ہو کر مجھ تک پہنچی تھی۔ میں نے ادھر ہی دیکھنا شروع کر دیا۔ مگر کوئی دکھائی نہیں۔ پگڈنڈی خالی خالی نظر آئی تھی۔ تبھی پتا چل گیا کہ وہ آواز کہاں سے آرہی تھی۔ آواز کا مخرج کما دکا کھیت تھا۔ کھیت میں یا کھیت کے پیچھے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ وہی آپس میں باتیں کر رہے تھے پھر مجھے ایسا لگا جیسے زمین پر پہلے پڑا ہو۔ شاید کوئی زمین کھود رہا تھا۔

میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا احساس کرادیا اور میں ایک دم سے ہوشیار اور محتاط ہو گیا اور بیٹھے بیٹھے کھیت کی طرف کھسنے لگا۔ گوکہ رفتار چوٹی سی تھی پھر بھی میں کھیت کی منڈی تک پہنچ گیا۔ کما دکا کے چھدرے چھدرے پتوں کے اس پار میں نے ایک دھندلا سا منظر دیکھا۔ بڑا ہی عجیب منظر تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا۔ سرفردشوں کے ساتھ سے پہلے کا وقت ہوتا تو میں ایسا منظر دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ لیتا اور مقابلہ دوڑ جیسے انداز میں بھاگنے لگتا مگر اب تو ڈر کا عفریت نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے دیکھا تھا کہ وہاں دو آدمی کدالیں ہاتھوں میں لیے ہوئے زمین میں گڑھا کھود رہے ہیں۔ ان کے قریب ہی مٹی کے تیل کا لالٹین رکھا تھا جس کی لوکانی دھیمی تھی وہ دونوں ہر جانب سے بے پروا گڑھے سے مٹی نکالنے میں مشغول تھے۔ زمین پر مٹی کا ڈھیر سا جمع تھا۔ ان کے قریب ہی کوئی لمبی سی چیز زمین پر سفید کپڑوں سے ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ یہ چیز بالکل بے حس و حرکت پڑی تھی اور مکمل طور پر چادر سے ڈھکی ہوئی تھی اور میں کافی کوشش کے بعد بھی اس کا کوئی حصہ دیکھ نہیں پایا تھا۔

لیکن مجھے اس چیز کو دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس کو دیکھے بغیر میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ چادر کے نیچے کیا ہے اس کا اندازہ لگا چکا تھا۔ یقیناً وہ کوئی لاش تھی جسے انہوں نے چادر سے ڈھک رکھا تھا اور اسی کو دفن کرنے کے لئے وہ گڑھا کھود رہے تھے۔

”تم نے کچھ سنا شرفو میاں!“ اچانک ان میں سے ایک نے دوسرے کو مخاطب کیا۔ ”مجھے ایسا لگا جیسے کوئی چل رہا ہو۔“

”نہیں وکیل میاں! میں نے ایسا کچھ نہیں سنا ہے۔“ شرفو نے جواب میں کہا۔ ”کوئی کتا یا گیدڑ بھاگا ہوگا۔ اتنی رات گئے یہاں کون آئے گا۔“

گاؤں دیہات میں مغرب کے بعد ہی گہری رات اتر آتی ہے۔ اس لئے وہ رات کے ابتدائی حصے ہی کو اتنی رات کہہ رہے تھے۔ میں نے اپنی قوت سماعت ان کی طرف لگا دی۔ شرفو کہہ رہا تھا۔ ”ہمارے گاؤں سے یہاں تک کا اچھا خاصا فاصلہ ہے پھر لوگ شام کے وقت باہر نکلنا پسند نہیں کرتے۔“

میں اس حد تک بے حس و حرکت ہو گیا تھا کہ میں نے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ اس لئے کہ سامنے لاش دفنائی جا رہی تھی ان کا انداز جیج جیج کر کہہ رہا تھا کہ قتل کے بعد کی یہ کارروائی ہے مگر میں اسے بھی پرسکون انداز میں دیکھ رہا تھا۔ جبکہ میں خطرے میں تھا۔ وہ دو تھے ان دونوں کے پاس کدالیں تھیں اور شاید کلباڑیاں بھی ہوں لیکن مسئلہ ان کے مسلح ہونے کا نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ لیں میں تو یہ چاہتا تھا کہ صرف میں انہیں دیکھوں اور میں جان لوں کہ وہ کون ہیں اور یوں خفیہ طور پر کس کی لاش کو دفن کر رہے ہیں۔

”میرا خیال ہے ہم آگے جا کر جائزہ لے لیں۔ جھاڑیوں کے پیچھے جا کر دیکھ آئیں۔“ وکیل میاں نے اصرار کیا۔ ”کیونکہ میں نے کسی کی آہٹ صاف محسوس کی ہے۔“

”تم تو ہوسدا کے وہمی۔“ شرفو میاں بگڑ کر بولا۔ ”کوئی گیدڑ وغیرہ ہوگا یا شاید کوئی کتیا کوئی دوسرا جانور ہوگا اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے پھر بھی تمہیں شک ہے تو آؤ شک دور کر لیتے ہیں۔“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے کدال زمین پر پھینک دیا۔ وکیل میاں نے بھی کدال زمین پر ڈال دیا۔ انہوں نے لائین اور لاش کو اسی طرح وہاں چھوڑا اور خود آہستگی اور احتیاط کے ساتھ چلتے ہوئے کدال کے کھیت دوسری طرف آنے لگے جہاں میں موجود تھا۔

لیکن میں ان کی گفتگو سے ان کے ارادے بھانپ چکا تھا اور قبل اس کے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتے میں بلی کی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا دائیں جانب دبک گیا تھا جہاں بڑے بڑے پتھروں کے تودے موجود تھے۔ میں دو تودوں کے درمیانی جگہ میں اپنے جسم کو پھنسا کر بیٹھ گیا تھا اور گویا ان تودوں کا ہی ایک حصہ بن گیا تھا۔

میرا کالا کبیل اس وقت میری بہت مدد کر رہا تھا۔ یہ پرانا میل کھایا کبیل تاریک رات کے دامن کا ایک ٹکڑا بن کر اندھیرے میں مدغم ہو گیا تھا۔ تاہم اگر وہ لوگ زیادہ توجہ کے ساتھ ادھر ادھر تلاش کرتے تو ان کے لئے مجھے پالینا ایسا مشکل نہیں تھا اور میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ دو گھنٹوں میں انہیں بے ہوش کرنا تھا پھر یہ دیکھنا تھا کہ وہ لاش کس کی ہے اور نزدیکی گاؤں میں جا کر اس کی اطلاع دینا تھی۔ تبھی ان میں سے ایک میرے قریب والی جھاڑیوں میں گھس گیا۔

”تم اتنا زیادہ ڈرتے کیوں ہو شرفو؟ جب سرخج کا حکم ہے تو پھر ڈرنا کس بات کا؟ آخر ہماری تو سیلہ سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ بھلا ہم اسے کیوں قتل کرتے اور یہاں دفن کرتے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں سرخج کے حکم پر کر رہے ہیں جس کی ہم رعیت ہیں۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو بھی گئی تو سرخج صاحب خود سنبھال لیں گے۔“

”ارے تم نہیں جانتے۔“ شرفو نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”جب چھوٹے لوگوں پر برا وقت آ پڑتا ہے تو پھر بڑے لوگ ان کے کام نہیں آتے بلکہ اپنی کھال بچانے کے لیے ان کو ہی قربانی کا بکرا بنادیتے ہیں۔“ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر جا چکے تھے لیکن انہوں نے اپنا کام ابھی دوبارہ شروع نہیں کیا تھا۔ میں اب جس جگہ موجود تھا وہاں سے ان کی شکلیں تو نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ ان کی آوازیں بالکل صاف طور پر سن سکتا تھا۔

”ذرا سادہ لے لو یا ر۔ تھک گئے ہیں۔ ابھی چند منٹ کے بعد دوبارہ کام شروع کریں گے۔“ وکیل خان نے شرفو سے کہا۔ اس شخص کو شرفو نے اسی نام سے مخاطب کیا تھا۔ نام میں انفرادیت تھی اسی لیے یہ نام یاد رہ گیا تھا۔ پٹنہ میں ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں کچھ انصاری برادری کے لوگ رہتے ہیں۔ سید بھی مل جاتے ہیں اور خان بھی مگر خان برادری کے لوگ سسرام میں بسے ہوئے ہیں جو یہاں سے کافی دور ہے۔ ”ٹھیک ہے۔“ شرفو نے کہا۔ ”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا میں بزدل نہیں ہوں میں کسی سے نہیں ڈرتا لیکن یہ کام جو ہم لوگوں نے کیا ہے بس

خدا سے دعا کرو کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے اگر کہیں چھوٹے سرخ رسول بخش کو پتا چل گیا تو سمجھ لو ہماری خیر نہیں ہے۔“

”کیوں ہماری خیر کیوں نہیں ہے؟ ہماری سلیمہ سے کیا دشمنی تھی؟ ہم نے سرخ کے کہنے پر ہی ایسا کیا۔ سرخ کے بیٹے کو اگر کچھ کہنا ہے تو اپنے باپ سے کہے۔“

”تجھے بڑا ترس آ رہا ہے بے چاری سلیمہ پر۔“ شرفو نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”میں نے جب دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبایا تھا تو میں بتا نہیں سکتا کہ اس کی آنکھوں میں کیا تھا۔ وہ کچھ بول تو نہیں سکتی تھی لیکن یاران آنکھوں میں ایسی بے بسی تھی ایسی حیرت تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے تو وہ گاؤں کے دوسرے بڑی عمر کے لوگوں کی طرح چاچا کہتی تھی اور اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ میں ایک دن اس کا گلا دبا دوں گا۔“

”میں اس کی آنکھوں کو نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں اس کی دونوں ٹانگیں پکڑے ہوئے تھا اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے اس کا زندہ چہرہ نہیں دیکھا ورنہ مجھے بھی تمہاری طرح تکلیف ہو رہی ہوتی۔“ وکیل خان بولا۔

”مگر یار سرخ نے یہ کچھ اچھا نہیں کیا۔“ شرفو نے کہا۔ ”آخر سلیمہ بے چاری کا جرم کیا تھا؟ یہی ناکہ وہ بہت غریب تھی اور سرخ کے بیٹے رسول بخش سے محبت کرنے لگی تھی؟ مگر اس میں تنہا اس کا قصور تو نہیں تھا۔ سرخ کا بیٹا اس کے پیچھے دیوانہ تھا۔ بھلا کس کو یہ بات نہیں معلوم تھی وہ سلیمہ کے عشق میں پاگل ہو رہا ہے اور اس نے اپنی خالہ زاد سے شادی سے صاف انکار کر دیا ہے جبکہ ان دونوں کی منگنی بچپن ہی میں طے ہو گئی تھی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے شرفو، مگر ذرا یہ بھی تو سوچو کہ سرخ کے خاندان میں سلیمہ جیسی لڑکی جاسکتی تھی؟ کیا سرخ جیسا آدمی سلیمہ جیسی لڑکی کی بیٹی کو اپنی بہو بنا کر حویلی میں لاسکتا تھا؟ نہیں شرفو، ہرگز نہیں۔ کہاں سرخ کا خاندان کہاں سلیمہ.....“

”تو پھر سزا صرف سلیمہ کو کیوں ملے؟“ شرفو نے کہا۔ ”سرخ کے بیٹے کو بھی تو اس کے ساتھ سزا ملنی چاہیے تھی۔ وہ کیوں سلیمہ کے پیچھے لگا ہوا تھا؟ سلیمہ بے چاری میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ ایسی بات سوچ سکتی۔ سب جانتے ہیں کہ پہل چھوٹے سرخ رسول بخش کی طرف سے ہوئی تھی اور اسی نے سلیمہ کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا یا تھا۔“

”اب ان باتوں کو چھوڑو شرفو اپنا کام کرو۔ ہمیں تو بس اپنا کام کرنا ہے سرخ جو حکم دیں گے اسے پورا کرنا ہے۔ زیادہ سوچا مت کرو جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ زیادہ سوچنے سے صرف اپنا دماغ ہی خراب ہوتا ہے۔ تم سرخ کے ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔“

”سچ کہتے ہو میرے بھائی!“ شرفو نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ ”ہم بھلا سرخوں کے ہاتھ کیونکر پکڑ سکتے ہیں؟ چلو یار کھدائی شروع کرو۔ رات بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ کام کر کے جلدی سے گاؤں واپس چلیں۔“

ان دونوں نے ایک بار پھر کدالیں سنبھال لیں اور کھدائی میں مصروف ہو گئے۔ وقتی طور پر ان کی باتیں بند ہو گئی تھیں اور فضا میں اب صرف کدالوں کے زمین پر گرنے اور اٹھنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

دونوں شاید اپنے اپنے خیالوں میں محو کام میں لگے ہوئے تھے میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی کمین گاہ سے نکل کر خاموشی سے ایک بار پھر اسی جھاڑی کی اوٹ میں آ بیٹھا جہاں سے میں ان کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

انہوں نے کافی زمین کھود لی تھی اور اب وہ پھاوڑے سے مٹی باہر نکال نکال کر ڈھیر کر رہے تھے۔ قبر کی تیاری کا کام بڑی تیزی کے ساتھ جاری تھا۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے پھاوڑے چھوڑ کر دوبارہ کدالیں سنبھال لیں اور کھدائی ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ مٹی کے ڈھیر اب کافی اونچے ہو گئے تھے اور کھدائی برابر جاری تھی۔

لائین کی ٹمٹاتی ہوئی روشنی میں یہ منظر بڑا پر اسرار اور بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے گہرے سناٹے اور گہرے اندھیرے میں دو آدمی ایک لاش کے ساتھ۔ ایک لڑکی کی لاش جسے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے ہلاک کیا تھا اور اب وہ اسے دفن کرنے کے لیے اپنے ہی ہاتھوں سے گڑھا بھی کھود رہے تھے۔

میں دم سادھے ہوئے وہاں بیٹھا رہا اور ان کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب وہ لوگ زیادہ تیزی کے ساتھ کام کر رہے تھے کیونکہ رات گزرتی جا رہی تھی اور انہیں جلد از جلد اپنا کام ختم کر لینا تھا۔

بالآخر وہ وقت بھی آیا جب انہوں نے پھاوڑے ہاتھوں سے ایک طرف پھینک دیئے۔ قبر کھد چکی تھی اور اندر کی ساری مٹی باہر نکالی جا چکی تھی۔ ”چلو یار اٹھاؤ۔“ وکیل خان نے لاش کو دوسری طرف سے پکڑا اور اس کی زبان سے کلمے کا ورد جاری ہو گیا۔ اس کی تقلید میں شرفو بھی فوراً کلمہ پڑھنے لگا۔

کیا ستم ظریفی تھی۔ وہ قاتل اپنے مقتول کو زمین میں گاڑنے کے ساتھ ساتھ کلمہ پڑھ رہے تھے۔ ان کا یہ عمل اس سوہوم ڈھکی چھپی نیکی کی عکاسی کر رہا تھا جو ان کے سیاہ اور گناہ آلود دلوں کے کسی نہ کسی دور دراز گوشے میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔

ان دونوں نے مل کر سفید چادر میں لپیٹی ہوئی اس لاش کو بڑی آسانی کے ساتھ اٹھایا۔ شاید سلیب نامی یہ لڑکی بہت نازک اندام تھی۔ انہوں نے اس کے جسم کو بڑی احتیاط کے ساتھ گڑھے کے اندر لٹا دیا۔

”چلو جی اب مٹی ڈالو۔“ شرفو نے کہا اور پھاوڑا سنبھال کر مٹی ڈالنے لگا۔ دوسرا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے گڑھے کو مٹی سے بھر دیا لیکن اب بھی کافی مٹی بچ رہی تھی۔ جس کے گڑھے کے چاروں طرف ڈھیر لگے ہوئے تھے ان دونوں نے فوراً اس مٹی کو پھاڑوں کی مدد سے آس پاس کی زمین پر پھیلانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے گڑھے کی زمین کو تقریباً برابر کر دیا۔

”لو جی یہ قصہ بھی ختم ہو گیا۔“ دوسرے نے اپنی کمر کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تم یہ تو نہیں بھولے ہو کہ کل تمہیں کیا کرنا ہے؟“ ”نہیں یار!“ شرفو نے ایک بار پھر گہری سانس لے کر کہا۔ ”اس میں بھولنے والی کون سی بات ہے؟ سرخچ کا پڑھایا ہوا سبق بھلا کون بھول سکتا ہے؟“

”ہاں اب کل صبح سے سلیب کی تلاش شروع ہو جائے گی۔“ دوسرے نے کہا۔ ”وہ حویلی میں رات کے کام انجام دینے اور رات کو سرخچ کی بیوی کی خدمت کرنے اور رات حویلی میں گزارنے کے بعد جب صبح کو خلاف معمول اپنے گھر نہیں پہنچے گی تو اس کی تلاش شروع ہو جائے گی اور اس

کے ماں باپ کو یہ بتایا جائے گا کہ وہ تو کل شام ہی کو حویلی سے یہ کہہ کر چلی گئی تھی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ گھر واپس جانا چاہتی ہے بیگم صاحبہ اور بہت سے لوگ اس کی گواہی دیں گے کہ وہ کل شام ڈھلے حویلی سے نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو رہی تھی اور پھر..... پھر تم اس کے والدین کو یہ بتاؤ گے کہ تم نے سلیمہ کو ایک اجنبی نو جوان کے ساتھ گاؤں کے باہر جاتے دیکھا تھا۔ اجنبی نو جوان کوئی شہری معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا۔“

”مجھے یہ کہانی اچھی طرح سے یاد ہے۔“ شرفو نے آہستہ سے کہا۔ ”اس کہانی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سلیمہ کسی شہری کے ساتھ بھاگ گئی ہے پھر بعض دوسرے لوگ بھی یہی بات کہیں گے کہ انہوں نے ایک آدھ بار سلیمہ کو کسی اجنبی نو جوان کے ساتھ دیکھا تھا؟“

”بس ہمارا کام یہی ہوگا کہ ہم اس بات کو گاؤں کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دیں۔“ وکیل خان نے کہا۔ ”اس کو خوب اچھی طرح پھیلائیں تاکہ بچہ بچہ یہ جان لے کہ سلیمہ کسی اجنبی نو جوان کے ساتھ چلی گئی ہے۔“

”ہاں جی!“ شرفو نے کہا۔ ”اور پھر چھوٹا سرخچہ اسے زندگی بھر تلاش کرتا رہے گا اور کبھی نہیں ڈھونڈ پائے گا۔“

”کون کسی کو زندگی بھر یاد رکھتا ہے شرفو؟“ وکیل نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”دن گزرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی باتیں اور یادیں بھی پرانی ہو جاتی ہیں۔ وقت گزرتا ہے اور آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔“

شرفو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے پھاؤڑے اور کدالیں سنبھالیں اور پھر وکیل خان نے لائین کو اٹھا کر اسے پھونک مار کر بھجا دیا۔

اس کے ساتھ ہی چاروں طرف گہری تاریکی کا راج ہو گیا۔ روشنی کا جو چھوٹا سا نقطہ ابھی تک یہاں موجود تھا۔ وہ ختم ہو گیا اور وہ دونوں اور وہ سارا منظر سب کچھ تاریکی کا حصہ بن گیا۔

میں نے ان کے جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنی۔ اندھیرے اور سناٹے میں کچھ دیر تک یہ آواز آتی رہی اور پھر رفتہ رفتہ بالکل معدوم ہو گئی۔ اب ہر طرف موت کا سناٹا طاری تھا۔

جو کچھ میں نے دیکھا تھا اور جو کچھ سنا تھا اس نے میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس سرزمین پر بنارس کے اسی نواح میں جہاں میرے ساتھ مسلسل بڑے درد انگیز اور کرب ناک واقعات پیش آئے تھے اور جہاں کی فضاؤں سے بہت سی دکھ بھری یادیں وابستہ تھیں ایک بار پھر میرا خیر مقدم ایک گہرے الیے نے کیا تھا۔

اس الیے سے اگرچہ میرا کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا۔ میں نے تو سلیمہ نامی اس بے چاری لڑکی کی کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی جسے یہ دونوں آدمی ابھی کچھ دیر پہلے زمین کا پیوند بنا کر گئے تھے لیکن پھر بھی میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں سلیمہ کے معاملے کے بارے میں ان دونوں آدمیوں کی زبانی بہت کچھ سن چکا تھا اور یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ اس کو غریبی اور محبت کے جرم کی سزا ملی ہے۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس کو اطلاع دینا حماقت ہوگی اس قسم کی جگہوں پر پولیس مکمل طور پر زمین داروں اور جاگیرداروں کی غلام

ہوتی ہے اور ان کے ہی اشاروں پر نجاتی ہے۔ جو جاگیر دار جتنا بڑا ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ پولیس کی حمایت اسے حاصل ہوتی ہے اس لیے پولیس سے تو رجوع کرنا فضول تھا سیدھی سی بات تھی اگر پولیس اس معاملے میں کوئی کارروائی کرتی بھی تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی کہ شرف کو سلیمہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا اور پھر شاید انہیں پھانسی کی سزا ہو جاتی یا عمر قید کی۔ یہ بات تو کبھی بھی ثابت نہ ہوتی کہ شرف اور اس کے ساتھی نے کس کے حکم سے ایسا کیا تھا۔

”تو پھر کیا اس خونِ ناحق کو یوں ہی رائیگاں جانے دوں؟“ میں نے گہرے تاسف کے ساتھ سوچا۔ ”نہیں اس سے زیادہ گھٹیا حرکت بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے اور میں وکیل خان اور شرف کے علاوہ اس سب کا عینی گواہ ہوں۔ اس بے گناہ لڑکی کو قتل کرنے کے بعد اس کے اوپر بے ہودہ اور گھٹیا قسم کے الزامات لگائے جانے کا بھی پروگرام ہے۔ نہیں کم از کم میں اس کے معصوم چہرے پر لگنے والے اس کلنک کو تو روک ہی سکتا ہوں۔ وہ میری صبا جیسی ہی معصوم ہوگی۔ اس پر الزام لگانا مجھے گوارہ نہیں تھا۔“

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے دل میں ایک آخری فیصلہ کر لیا اور مطمئن ہو گیا۔

اب مجھے فی الحال کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے یہ رات یہیں گزارنی تھی تاکہ دن کی روشنی میں اس جگہ کو اچھی طرح دیکھ سکوں جہاں سلیمہ کو خاموشی سے دفن کیا گیا تھا۔

میں جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل آیا اور میں نے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان ایک اچھی سی جگہ تلاش کر لی جہاں میں رات گزار سکتا تھا۔ میرے پاس تھیلے میں کھانے پینے کے سامان کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن طبیعت اس قدر شدید طور پر کمزور ہو رہی تھی کہ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ابھی ابھی میری آنکھوں کے سامنے زمین میں ایک لاش دفن کی گئی تھی۔

اب میں نے اپنی تلاش کی ہوئی جگہ پر ڈیرہ جمالیا اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ نہ تو کپڑوں کے خراب ہونے کا کوئی اندیشہ تھا اور نہ جسم کے میلا ہونے کا خدشہ۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر آہستہ آہستہ مجھے نیند آ گئی۔ صبح کو ہزار ہا پرندوں کے چہچہانے کے شور سے میری آنکھ کھلی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا اور میں نے اپنے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی۔ رات کے سیاہ اور دھندلے مناظر غائب ہو چکے تھے اور اب دن کی پھیلتی ہوئی روشنی میں سب کچھ صاف دیکھ سکتا تھا۔

یہ منجر اور غیر آباد زمین کا ایک سلسلہ تھا جو بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ شاید کسی زمانے میں یہ زمین سرسبز شاداب رہی ہو اور اس پر کھیتی باڑی بھی ہوتی ہے لیکن اب تو اس کو سیم اور تھور نے کھالیا تھا جس کی علامتیں جگہ جگہ موجود تھیں۔ دور دور تک چھوٹے بڑے ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے اور جا بجا گھنٹی کانٹے دار جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔

وہ مقام میری نظروں کے سامنے تھا جہاں رات کو شرف نے سلیمہ کی لاش کو دفن کیا تھا انہوں نے مٹی کو چاروں طرف بکھیر دیا تھا تاہم میں نے اس کے وسط میں اس جگہ کو با آسانی تلاش کر لیا جہاں لاش کو دبایا گیا تھا۔

میں نے ادھر ادھر سے چار بھاری بھاری پتھر تلاش کئے اور پھر انہیں اس جگہ کے چاروں کونوں پر رکھ دیا جہاں لاش دفن کی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے پورے علاقے کو اچھی طرح دیکھا اور اس کی کئی خاص خاص نشانیاں مقرر کیں اب میں کسی کو بھی اس جگہ کے بارے میں بالکل ٹھیک طور سے بتا سکتا تھا۔

رات بھر کچھ نہ کھانے کے باعث مجھے اب بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی چنانچہ میں نے اپنے تھیلے میں سے تھوڑا سا کھانا نکالا اور اسے کھا کر پانی پی لیا۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر میں نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور سلیمہ کی قبر پر بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ فاتحہ پڑھی میں نے ایک ایسی لڑکی کی مغفرت کے لیے دعا مانگی جس کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد میں خاموشی سے چل پڑا۔

میں نے اندازے سے آگے کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ رات کو وہ دونوں کس سمت کو گئے تھے اس کا مجھے صحیح طور پر علم نہیں تھا کیونکہ اس وقت انہوں نے لائٹیں بجھا دی تھیں اور گھپ اندھیرے میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔

مجھے یاد تھا کہ انہوں نے آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے گاؤں کا اس جگہ سے فاصلہ کوئی تین میل کے قریب تھا۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں یہ فاصلہ مجھے طے کر لینا چاہیے تھا بلکہ اس سے بھی کم وقت میں لیکن مجھے چلتے چلتے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا اور اب تک مجھے کسی ہستی کے آثار نہیں دکھائی دیئے تھے ہر طرف بخر اور بے آب و گیاہ زمین پھیلی ہوئی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مجھے کافی دور کچھ بکریاں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیئے اور جلدی جلدی چلتا ہوا اس طرف بڑھنے لگا۔

وہ ایک نوعمر لڑکا تھا جو بکریوں کا ریوڑ اپنے ساتھ لے کر اس طرف آ نکلا تھا۔ میں نے جب اس سے گاؤں کا پتا پوچھا تو اس نے مخالف سمت میں اشارہ کر کے بتایا۔

مطلب یہ کہ اب تک میں گاؤں کے قریب جانے کے بجائے اس سے مزید دور ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے ایک بار پھر واپسی کا سفر طے کرنا تھا مجھے اپنے اوپر سخت غصہ بھی آیا اور جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ غلطی میری ہی تھی مجھے رات کو ان دونوں کا پیچھا کر کے کم از کم اس سمت کو جان لینا چاہیے تھا جدھر وہ جا رہے تھے اور اب خواہ مخواہ اتنا بہت سا وقت ضائع ہو گیا تھا۔

میں نے پھر واپسی کا راستہ اختیار کیا اور ایک بار پھر میں اس جگہ کے پاس سے ہو کر گزرا جہاں سلیمہ کی قبر واقع تھی۔ وہ جگہ بالکل اسی حالت میں تھی اور میرے لگائے ہوئے چاروں پتھر اپنی جگہ پر موجود تھے۔

اُف.....! کس قدر رویران کس قدر بے جان، بوجھل اور افسردہ منظر تھا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس مٹی کے نیچے وہ نامعلوم لڑکی سو رہی تھی جو کل شام تک زندہ تھی اور غالباً موت کے خوف سے بھی یکسر آزاد۔ بھلا وہ اپنے بارے میں یہ کیوں کر سوچ سکتی تھی کہ آج شام اس کی زندگی کی آخری

شام ہے اور وہی لوگ اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر ڈالیں گے جنہیں وہ چا چا اور ماما وغیرہ کہتی ہے۔

میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی اب دن چڑھ آیا تھا اور فضا گرم ہوتی جا رہی تھی۔ سورج کی گرمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ گرمی میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی میں اس سے بخوبی واقف تھا لیکن ایک عرصے سے شہروں میں زندگی گزارنے کے باعث میں اس قسم کے موسم جیسے بھول ہی گیا تھا۔

میں نے اپنے تھیلے میں سے ایک بڑا سا پرائیڈر اٹکالا اور اسے اپنے سر پر ڈال لیا۔ اور پھر میں نے قدرے سکون کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ کچھ آگے گیا تھا کہ مجھے ایک قدرتی انار کا ڈنڈا نظر آ گیا۔ یقیناً کسی نے اسے اپنے لیے کاٹ کر پھیلا ہوگا مگر ساتھ لے جانہ سکا۔ میں نے اسے اٹھا لیا کہ ڈنڈا جانور اور انسان دونوں سے حفاظت کرتا ہے۔ اگر کتے وغیرہ مل گئے تو اس سے انہیں ڈرا کر میں بھاگ سکتا تھا۔

میں بہ مشکل آدھ گھنٹہ چلا ہوں گا کہ مجھے سامنے سے ایک بستی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ تقریباً تین گھنٹے ضائع کرنے کے بعد میں نے آدھ گھنٹے کی وہ اصل مسافت طے کی تھی جس نے مجھے گاؤں کے قریب پہنچا دیا تھا۔

”اس گاؤں میں کوئی کچا اور چھوٹا سا مکان ہوگا جس میں سلیمہ کے والدین اس کا انتظار کر کے تھک چکے ہوں گے۔“ میں نے اپنے دل میں سوچا۔ کاش میں سیدھا ان کے پاس جاسکتا اور انہیں یہ بتا سکتا کہ وہ اب سلیمہ کو تلاش نہ کریں وہ ایسی جگہ جا چکی ہے جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کر نہیں آیا ہے۔

جب میں گاؤں کے اندر داخل ہو رہا تھا تو اس وقت میں نے جو چیز سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نمایاں دیکھی وہ ایک عظیم الشان حویلی تھی اور مجھے اس کے بارے میں کسی سے بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی ایسی شان دار حویلی تو صرف سرینچ جیسے آدمی کی ہی ہو سکتی تھی جس کے حکم پر اس کے کارندے بے گناہ انسانوں کا بے دریغ خون کر دیا کرتے تھے۔

حویلی گاؤں کے مغربی حصے میں آخری کنارے پر واقع تھی اور میں اسی طرف سے گاؤں کے اندر داخل ہوا تھا۔ چنانچہ میں سب سے پہلے حویلی کے سامنے سے ہی گزرا۔ حویلی کا بھاری بھر کم پھانک کھلا ہوا تھا اور ڈیوڑھی میں چار پائی ڈالے ہوئے کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے زور سے اپنا ڈنڈا فرش پر پٹخ کر حق اللہ کا ایک زبردست نعرہ مستانہ بلند کیا اور حویلی کے پھانک کے سامنے سے گزرنے لگا۔ ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی گردنیں ایک دم اٹھ کر میری طرف گھوم گئیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ میری طرف سے بے توجہ ہو گئے۔ گاؤں میں کسی فقیر کی آمد کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی۔

حویلی کے آگے سے گزر کر میں گاؤں کے مزید اندر داخل ہوا اور تب میں نے ایک جگہ کچھ لوگوں کو کھڑے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھا کوئی چھ سات آدمیوں کا مجمع تھا۔ میں بھی اسی طرف جا نکلا۔

اس مجمع میں اس وقت ایک آدمی بول رہا تھا اور بولنے والے کو میں نے اس کی آواز سے اس کی شبیہ سے بھی جوکل رات کی تاریکی میں میں نے دیکھی تھی پہچان لیا وہ شرفو تھا۔

”بھاگ گئی اپنے اسی چاہنے والے کے ساتھ۔“ شرفو کہہ رہا تھا۔ ”میں نے خود اپنی آنکھوں سے دونوں کو گاؤں سے باہر کی طرف جاتے

ہوئے دیکھا تھا۔“

”خدا کے غضب سے ڈر وشر فو!“ ایک سفید داڑھی والا بوڑھا کہہ رہا تھا۔ ”سلیمہ اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔“

”کیا بات کرتے ہو سلامت چاچا!“ ایک اور شخص بولا جو میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ ”شر فو غلط نہیں کہہ رہا ہے میری ان گناہ گار آنکھوں

نے اس سے پہلے بھی کئی بار سلیمہ کو ایک شہری نو جوان کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا ہے۔“

”لیکن یہ بات اس سے پہلے تو تم نے آج تک نہیں بتائی تھی؟“ بوڑھے نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”نہ تم نے کبھی اس نو جوان کی

نشاندہی کی اور نہ اس کے بارے میں کچھ بتایا۔ آج پہلی بار تمہاری زبان سے یہ بات سن رہا ہوں۔“

بولنے والا چند لمحوں کے لیے شٹا سا گیا لیکن پھر اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ”مجھے کیا ضرورت تھی کسی کے معاملات کا گاؤں بھر

میں ڈھنڈورا پیٹنے کی۔“ اس نے خاصے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اور مجھے کیا علم غیب تھا کہ ایک روز وہ اسی نو جوان کے ساتھ گاؤں سے فرار بھی ہو جائے گی۔“

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔“ بوڑھے نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”مگر تم لوگوں کو اس پر اس قسم کے الزامات نہیں لگانے

چاہئیں۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے۔“

”حق اللہ!“ میں نے بڑے زور سے اپنا ڈنڈا زمین پر مار کر ایک نعرہ بلند کیا۔ سارے لوگ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی

طرف کوئی توجہ نہیں دی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور پر چند افراد کی ایک ٹولی کھڑی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔ اس ٹولی میں عورتیں بھی شامل تھیں اور یہاں میں نے وکیل خان کو

دیکھا۔ میں نے اسے اس کی آواز کی بنا پر بالکل واضح طور پر پہچان لیا۔

”زمانہ بڑا خراب ہے زمانی بہن۔“ وہ ایک عورت سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”بھلا کون سوچ سکتا ہے کہ سلیمہ جیسی لڑکی کسی کے ساتھ

بھاگ جائے گی مگر دیکھ لو وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چل دی۔“

”مگر یہ تو صرف تمہارا خیال ہے۔“ زمانی نے جواب دیا۔ ”کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھاگ گئی ہے۔“

”ارے کمال کرتی ہو۔ بھاگ نہیں گئی تو اور کہاں گئی؟“ وکیل خان نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آ خر گاؤں سے کہاں چلی جائے گی جبکہ

شر فو نے خود اپنی آنکھوں سے اسے ایک اجنبی شہری نو جوان کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔“

”دلوں کے بھید تو اللہ ہی جانتا ہے۔“ زمانی نے کہا۔ ”مگر سچ تو یہ ہے کہ سلیمہ سے ایسی امید نہیں تھی۔“

”حق اللہ! اللہ ہوا!“ میں نے زمین پر ڈنڈا تلخ کر ایک فلک شکاف نعرہ لگایا اور وہ لوگ ایک دم خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگے لیکن میں نے

ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور وہاں سے آگے جا کر ایک گھنے اور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

کافی دور سے چل کر آیا تھا اس لیے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں نے بڑا لطف دیا۔ میں نے اپنا ڈنڈا اور کشتکول اپنے قریب رکھ لیا اور درخت

کے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اس طرح مجھے بے حد آرام اور سکون کا احساس ہوا۔

وکیل خان اور شرفا اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی نمک حلائی اور مستعدی کا مظاہرہ میں ابھی ابھی دیکھ چکا تھا۔ اس ساری مہم کا مقصد اپنے بھیا نک جرم کو چھپانے کے علاوہ یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اور خاص طور سے سرینچ کے بیٹے رسول بخش کے دل میں سلیمہ کے خلاف نفرت پیدا کر دی جائے سلیمہ کو ایک آوارہ اور بدتماش لڑکی قرار دیا جائے۔ وہ اس سے متنفر ہو جائے کسی مرنے والے کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس پر اس قسم کے جھوٹے الزامات لگائے جائیں۔

میں آنکھیں بند کیے ہوئے انہی خیالات میں غرق بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

”شاہ جی! شاہ جی!“ کوئی عورت درد بھری آواز میں مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اپنے سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت کو پایا اس کی آنکھیں کثرت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں اور اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔

”کیا بات ہے بی بی؟“ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے گرد آلود بال چہرے پر چھائی وحشت اور کالے کمبل وڈنڈے نے میری اداکاری میں رنگ بھر دیا تھا۔ وہ حقیقت میں مجھے گدا سمجھ بیٹھی تھی۔

”شاہ جی؟“ اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور ہلک کر رونے لگی۔

”معلوم تو ہو بی بی تو کیوں رو رہی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تجھ پر کیا مصیبت آئی ہے؟“

”شاہ جی!“ عورت نے روتے ہوئے ہچکچوں اور سسکیوں کے درمیان کہا۔ ”شاہ جی میری بیٹی کل سے گھر سے غائب ہے۔“

”سلیمہ!“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں شاہ جی!“ عورت ایک دم چونک پڑی اور اس کے اداس چہرے پر ایک رنگ دوڑ گیا۔ ”مگر آپ کو؟ آپ کو کیسے معلوم؟ اچھا شاید آپ نے کسی سے سنا ہوگا۔ سارے گاؤں کے لوگ اسی بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے سلیمہ کے بارے میں کچھ بتائیے شاہ جی! آپ جیسے بزرگ تو میری مدد کر سکتے ہیں۔“

”لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں تیرا اس بارے میں کیا خیال ہے بی بی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں اس پر یقین نہیں کرتی شاہ جی!“ عورت نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”وہ لوگ اس پر طرح طرح کے الزامات لگا رہے ہیں مگر یہ سب جھوٹ ہے بالکل جھوٹ ہے شاہ جی! سلیمہ کی کسی شہری نوجوان سے دوستی نہیں تھی وہ کسی کے ساتھ نہیں بھاگی یہ صرف اسے بدنام کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”تیرا میاں اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے عورت سے پوچھا۔

”وہ چند دوسرے لوگوں کے ساتھ سلیمہ کی تلاش میں گیا ہے۔“ عورت نے کہا۔ ”وہ لوگ اگلے گاؤں تک گئے ہیں شاید وہاں سے کچھ خیر خبر مل جائے۔“

”سرینچ کا بیٹا رسول بخش کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سرینچ کا بیٹا رسول بخش.....!“ عورت ایک دم چونک پڑی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے۔ ”آپ انہیں جانتے ہیں شاہ جی؟“

”جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دلے بی بی!“ میں نے کافی کرخت اور بھاری آواز میں کہا اور عورت میرے اس بدلے ہوئے لب و لہجے سے گھبرا گئی۔

”وہ بھی۔ شاہ جی!“ اس نے آنکھیں جھکا کر انک کر کہا۔ ”وہ بھی سلیمہ کی تلاش میں گیا ہوا ہے۔“

”جب وہ واپس آ جائے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔“ میں نے عورت سے کہا۔ ”میں یہیں اس درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہوں اور دیکھ ایک بات اچھی طرح سن لے خبردار اور کسی سے اس کا ذکر مت کرنا بس اس کو خاموشی سے میرے پاس بھیج دینا۔“

”جو حکم شاہ جی!“ اس نے جلدی سے کہا مگر ایک بات تو بتا دیجیے کہ شاہ جی کیا میری سلیمہ مل جائے گی؟“ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ پھر رونے لگی۔ ”خدا کے لیے شاہ جی.....!“

”اب تو یہاں سے چلی جا بی بی جا.....“ میں نے کہا۔ ”اور دیکھ یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک وہ واپس نہیں آ جاتا میں اس جگہ بیٹھ کر انتظار کروں گا۔“

”اچھا شاہ جی!“ عورت نے کہا اور جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کے جاتے ہی میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور گویا مراقبے میں چلا گیا۔ کافی دیر تک میں اسی حالت میں بیٹھا رہا اور پھر میں نے کسی کے قریب آنے کی آہٹ سنی اور آنکھیں کھول دیں میں نے اپنے سامنے وکیل خان کو کھڑا پایا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا وہ میرے لیے اجنبی تھا میں نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”حویلی میں چل کر کھانا کھا لو۔“ وکیل خان نے کہا۔

”کون سی حویلی، کس کی حویلی؟“ میں نے خاصے کرخت اور درشت لہجے میں پوچھا۔

”سرینچ کی حویلی اور کس کی حویلی۔“ اس نے کہا۔ ”اس گاؤں کے زمیندار ہیں وہ۔“

”جا بابا جا۔“ میں نے ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہاتھ سے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ ”ہم فقیروں کو حویلیوں میں جانے کی عادت نہیں ہے ہمارا وہاں کیا کام؟ جا ادھر سے جا۔“

”یہ تو سبکی معلوم ہوتا ہے۔“ وکیل خان کے ساتھ والے آدمی نے کہا۔ ”چھوڑو بھوک لگے گی تو خود ہی آئے گا۔“

وہ دونوں وہاں سے جانے ہی والے تھے کہ اسی وقت سلیمہ کی ماں وہاں آ پہنچی اس کے ہاتھ میں ایک سینی تھی۔

”کھانا کھا لیجیے شاہ جی!“ اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ”میں نے خاص طور سے آپ کے لیے تیار کیا ہے۔“

”رکھ دے ادھر بی بی!“ میں نے آہستہ سے کہا اور اس عورت نے جلدی سے سینی میرے سامنے رکھ دی گو کہ مجھے کسی سے کھانا لینے کی

ضرورت نہیں تھی کیونکہ میرے تھیلے میں اب بھی کافی کھانا موجود تھا۔ تاہم میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی کس قدر دل گرفتہ اور پریشانی کا شکار تھی۔

”بس اب جا۔“ میں نے سلیمہ کی ماں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”جا ادھر سے۔“

”اس کا دماغ واقعی کچھ کھسکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔“ وکیل خان نے مسکرا کر اپنے ساتھی سے کہا اور وہ دونوں وہاں سے چل پڑے سلیمہ کی ماں بھی ان کے ساتھ ہی چل پڑی۔

”شاہ جی کے بارے میں ایسی بات مت کہو بھائی!“ سلیمہ کی ماں کہہ رہی تھی۔ ”کوئی اللہ والے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔“

”تمہیں تو اس وقت ہر راہ چلتا ہوا شخص بھی اللہ والا معلوم ہوگا۔“ وکیل خان نے کہا۔ ”تم سمجھتی ہو وہ تمہاری بیٹی کی تلاش میں مدد دے گا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ وہ.....“

”بس بس بھائی!“ عورت نے اسے روکتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ”آگے کچھ نہ کہنا میں جانتی ہوں کہ شرفو بہت الٹی سیدھی بکواس کرتا پھر رہا ہے لیکن سلیمہ میری بیٹی ہے۔ اسے مجھ سے زیادہ بہتر طور پر اور کون جان سکتا ہے؟ شرفو بالکل غلط کہتا ہے۔ وہ سراسر الزام تراشی کر رہا ہے۔“

”اللہ جانے بی بی!“ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ ”شرفو کو تم سے کوئی دشمنی تو ہے نہیں جو وہ الزام تراشی کرے گا۔ جیسی تمہاری بیٹی ویسی ہی ہماری بیٹی.....“

آوازیں مجھ سے دور ہوتی گئیں اور وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں نے کھانا کھایا۔ سلیمہ کی ماں نے میرے لیے بہت عمدہ کھانا پکایا تھا خود اس نے صبح سے شاید کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ اس کی اور اس کے شوہر کو کھانے پینے کا کچھ ہوش ہی نہیں ہوگا۔

میں نے کھانا کھا کر برتن سینی میں رکھ دیے اور ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا کافی دیر کے بعد مجھے اپنے قریب دوبارہ آہٹوں کی آواز سنائی دی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

سلیمہ کی ماں میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی اس کے ساتھ ایک نوجوان آدمی تھا صحت مند تو انا اور دراز قد۔

”یہ ہے چھوٹے سرخج‘ شاہ جی!“ سلیمہ کی ماں نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز گلوگیر اور بھاری تھی۔ ظاہر تھا کہ رسول بخش بھی سلیمہ کی تلاش میں ناکام رہا تھا۔

”تم رسول بخش ہو؟“ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ”سرخج کے بیٹے رسول بخش۔“

”ہاں میں رسول بخش ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے تیور سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کو مجھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور وہ مجھے بھی ان فقیروں میں سے ایک سمجھ رہا ہے جو طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر دوسروں کو دھوکے دیتے ہیں۔“ کہو کیا بات ہے۔“

”بی بی! تو ادھر سے جا۔“ میں نے سلیمہ کی ماں سے کہا لیکن وہ جھجک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ وہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں نظر آتی تھی۔ آخر

اس کی بیٹی کا معاملہ تھا۔

”جانی بی‘ جا‘ تو نے سنا نہیں۔ میں نے کیا کہا۔“ میں نے سختی کے ساتھ کہا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے وہاں سے جانے لگی۔

”گھوڑا ہے تیرے پاس یا پیدل چلے گا؟“ سلیمہ کی ماں کے کچھ دور جانے کے بعد میں نے رسول بخش سے پوچھا۔

”مگر جانا کہاں ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ میری بات سن کر اسے مجھ سے ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

”مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔“ میں نے فقیرانہ جلال کے ساتھ کہا۔ ”جہاں لے چلوں میرے ساتھ چل جو کچھ میں کہوں اسے غور سے

سن جتنا بتانے کا مجھے حکم ملا ہے اتنا ہی بتا دوں گا۔ تیرے پوچھے بغیر ہی بتا دوں گا اس کے علاوہ کچھ اور مت پوچھنا مجھ سے کیونکہ مجھے حکم نہیں ہے۔“

”میں چلتا ہوں شاہ جی!“ رسول بخش نے ایک دم آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ میرے پاس گھوڑا ہے۔ آپ بتائیں کہاں

جانا ہے؟ میں ابھی گھوڑا لے کر آتا ہوں۔“

”ادھر مت لانا۔“ میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ”گاؤں کے باہر آموں کے باغ کے پاس میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ ادھر ہی آ جا

ایک بات کان کھول کر سن لے۔ زبان کو سختی کے ساتھ بند رکھنا ہے۔ اکیلے آنا کسی کو نہ تو ساتھ لانا اور نہ میرے بارے میں کچھ بتانا۔“

”بے فکر رہیں شاہ جی!“ اس نے کہا۔ ”میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“

”فکر کی مجھے نہیں تجھے ضرورت ہے۔“ میں نے ڈنڈا سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ہم فقیروں کو کس بات کی فکر؟“ اس کے ساتھ ہی میں اس کی

طرف دیکھے بغیر وہاں سے چل پڑا۔

میں گاؤں سے نکل رہا تھا تو اس وقت اچانک ایک دیوار کے پیچھے سے ایک سایہ سالپکا اور تیزی سے میرے سامنے آ کر میرا راستہ روک

کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ سلیمہ کی ماں تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

”آپ جا رہے ہیں شاہ جی اور آپ نے میری سلیمہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”جو کچھ معلوم کرنا ہے رسول بخش سے پوچھ لینا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن ابھی نہیں کچھ دیر کے بعد وہ تجھے سب کچھ بتا دے گا اور

اب تو میرے راستے سے ہٹ جا۔ جانی بی جا اپنے گھر جا۔“

سلیمہ کی ماں نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ لے کر ایک طرف ہو گئی اور میں آگے بڑھ گیا۔ جب میں گاؤں کے

باہر آموں کے باغ کے قریب پہنچا تو میں نے وہاں ایک گھوڑے کو پہلے سے کھڑے دیکھا۔ اس پر رسول بخش بیٹھا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں بھی اس کے ساتھ سوار ہو گیا۔ ”اس طرف چل۔“ میں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور رسول بخش نے گھوڑے کا رخ اس

طرف موڑ دیا۔

”لوگ سلیمہ کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے متعلق تیرا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے یقین نہیں ہے شاہ جی!“ اس نے بلاتامل جواب دیا۔ سلیمہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ وہ کسی کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“

”کیوں بہت محبت ہے سلیمہ کو تجھ سے؟ تجھے اس کے اوپر پورا اعتماد ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں شاہ جی!“ اس نے کہا۔ ”مجھے اس پر پورا اعتماد ہے وہ کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی اور میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر شادی کروں گا تو صرف سلیمہ سے چاہے اس کے لیے مجھے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ میرے باپ نے مجھے عاق کرنے کی دھمکی دی ہے اور میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ”اب تو سب کچھ ختم ہو چکا ہے دوست۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”اور میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ تم اپنے باپ کی اصلیت کو جان لو اور یہ بھی جان لو کہ سلیمہ کے خلاف لگائے جانے والے الزامات جھوٹے ہیں۔“ کچھ دیر کے بعد ہم لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سلیمہ کو دفن کیا گیا تھا۔ صرف چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا میں نے اس جگہ کو با آسانی پہچان لیا۔

رسول بخش کو ساتھ لیے ہوئے اس جگہ تک آیا جہاں چار بڑے بڑے پتھر سلیمہ کی قبر کی نشاندہی کر رہے تھے۔

”سلیمہ یہاں دفن ہے۔“ میں نے قبر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس جگہ.....“

”کیا؟“ رسول بخش نے چلا کر میرے کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”سلیمہ کو قتل کر دیا گیا ہے رسول بخش!“ میں نے کہا۔ ”اور اس کو قتل کرنے والا تمہارا باپ ہے.....!“

”نہیں، نہیں۔“ رسول بخش دیوانوں کی طرح اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ اف میرے خدا۔“ اور وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

”یہ ہو چکا ہے رسول بخش!“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”یہ ہو چکا ہے۔ کمزوری تمہاری ہے تم اپنی محبت کی حفاظت نہ کر سکے اور تمہاری محبت کے دشمن اپنا کام کر گئے اب اگر تم اور کچھ نہیں کر سکتے تو اتنا ضرور کر سکتے ہو کہ تمام لوگوں کو یہ بتا دو کہ سلیمہ کہیں نہیں بھاگی۔ وہ کسی کے ساتھ نہیں بھاگی اسے قتل کیا گیا ہے۔“

”شاہ جی!“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے یہ کہا ہے کہ سلیمہ کو میرے باپ نے قتل کروایا ہے لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اسے کن لوگوں نے قتل کیا ہے۔“

”یہ سوال اگر پوچھنے کی ہمت ہے اور پوچھ سکتے ہو تو اپنے باپ سے پوچھنا۔“ میں نے کہا۔ ”اور میرا کام اب ختم ہوا۔ میں چلتا ہوں۔“ ”نہیں شاہ جی، نہیں۔“ رسول بخش بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ ”خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر مت جائیے مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ میری مدد کیجیے۔“

”سنو رسول بخش!“ میں نے سخت اور قدرے ترش لہجے میں کہا۔ ”میں اس سے زیادہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا کہ میں نے سلیمہ کی قبر کی نشاندہی کر دی ہے اور تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ اس کو تمہارے باپ نے قتل کروا کر یہاں دفن کروا دیا ہے اس سے زیادہ میں کچھ اور نہیں بتا سکتا۔ میں نے

اپنا فرض پورا کر دیا اور اس کے آگے تمہارا فرض شروع ہوتا ہے اگر پوچھ سکتے ہو تو باقی باتیں اپنے باپ سے پوچھ لینا اور ایک بات اور سن لو جن لوگوں نے سلیمہ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کیا ہے ان کی سلیمہ سے کوئی دشمنی نہیں تھی انہوں نے تو صرف اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔“

”آپ اگر میری مزید کوئی مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم مجھے کوئی مشورہ تو دے سکتے ہیں۔“ رسول بخش نے کہا۔ ”آپ مجھے یہ تو بتا سکتے ہیں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ کہہ کر اسے گڑھے کو کھدوا سکتے ہو کہ آس پاس کے علاقوں میں تلاش کے دوران تمہیں اس جگہ تازہ کھدی ہوئی اور بکھری ہوئی مٹی دیکھ کر یہ شبہ ہوا تھا کہ یہاں گڑھا کھودا گیا ہے اس بنجر اور ویران علاقے میں چونکہ گڑھا کھودنے کا کوئی خاص مقصد ہی ہو سکتا ہے اس لیے میں نے اس جگہ کو دوبارہ کھود دیا اور یہاں سے سلیمہ کی لاش نکلی پھر تم اپنے باپ سے پوچھ گچھ کر سکتے ہو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پولیس درمیان میں ضرور آجائے گی لیکن تم خوب جانتے ہو کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا دنیا کا کوئی بھی قانون تمہارے باپ کو مجرم ثابت نہیں کر سکے گا۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام بس ایک بات یاد رکھنا میرا حوالہ کہیں مت دینا کسی سے بھی میرا ذکر مت کرنا۔“

”مگر شاہ جی آپ نے اتنی اہم بات بتائی۔“

”دیکھو رسول بخش!“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”فقیروں کو ستانا ٹھیک نہیں ہے بس اب مجھے جانے دو۔“ اور اس کے ساتھ ہی میں وہاں سے چل دیا۔

”ٹھہرے شاہ جی!“ رسول بخش نے میرا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو کہاں جانا ہے؟ میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔“

”اگر تم مجھے صرف کچی سڑک تک چھوڑ دو تو مہربانی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”پھر میں چلا جاؤں گا۔“

رسول بخش کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور لگام پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے تاہم وہ کسی نہ کسی طرح گھوڑا بڑھا رہا تھا راستے میں وہ خاموش رہا اور اس نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں اب اس کی باتوں کا جواب نہیں دوں گا۔

ہم لوگ سڑک سے کچھ فاصلے پر تھے کہ میری نظر وکیل خاں اور شرف پر پڑی وہ دونوں اسی طرف جا رہے تھے جدھر سے ہم آئے تھے۔ شاید وہ یہ دیکھنے جا رہے ہوں گے کہ رات کو کسی جانور نے قبر کو کھودا تو نہیں ان دونوں نے مجھے رسول بخش کے ساتھ بیٹھے دیکھا اور وکیل خاں کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔ اس سے پہلے وہ مجھے گاؤں میں درخت کے نیچے بیٹھا دیکھ چکا تھا اور میں نے اس کی کھانے کی دعوت کو مسترد بھی کر دیا تھا۔ ان دونوں نے شاید رسول بخش کے آنسوؤں سے بھرے ہوئے چہرے کو دیکھ لیا ہو مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں اور نہ ہمارا گھوڑا روکنے کی کوشش کی وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔

چند منٹ کے اندر اندر ہم بڑی سڑک پر پہنچ گئے اور رسول بخش نے گھوڑا روک لیا۔

”شاہ جی صرف ایک آخری سوال۔“ اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ”اگر آئندہ کبھی آپ سے ملاقات کرنا چاہوں تو کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”فقیروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا بابا.....!“ میں نے کہا۔ ”مجھ سے ملنا اب فضول ہے کیونکہ میں تمہاری اور کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ اس کے ساتھ ہی میں وہاں سے چل پڑا۔ رسول بخش نے گھوڑا واپس موڑ لیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں خطرے میں ہوں اور جو کچھ ہوا تھا وہ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وکیل خاں اور شرفو نے مجھے رسول بخش کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور وہ اس بات کی خبر ضرور سرنج کو کریں گے یہ معاملہ آگے چل کر نہ جانے کیا شکل اختیار کرنے والا تھا اور باپ بیٹے کے درمیان تنازعہ کیا رنگ لانے والا تھا مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم تھا میں تو صرف ایک بات جانتا تھا اور وہ یہ کہ اپنے موجودہ بہرہ پر کے ساتھ جلد از جلد علاقے سے نکل جاؤں۔

میں بڑی سڑک پر آنے کے بعد کھڑا ہو گیا اور سواری کا انتظار کرنے لگا کافی دیر گزر گئی اور کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ میں خود اپنے اوپر جھنجھلا رہا تھا کئی بار میں نے تو بہ کی تھی کہ آئندہ کسی دوسرے کے معاملے میں زبردستی اپنی ٹانگ نہیں اڑاؤں گا کیونکہ اس کے نتیجے میں مجھے نقصان کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہ آتا تھا اور اس کے باوجود میں خواہ مخواہ کسی نہ کسی معاملے میں اپنے آپ کو ملوث کر لیتا تھا اور بعد میں طرح طرح کی پریشانیوں اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خطرے کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب تک تو بات نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی ہوگی اور مجھے اس علاقے سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہو گیا تھا مگر کسی سواری کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔ میں کیسے اس علاقے سے باہر جاؤں ابھی یہی کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہیں دور مجھے بھائیالی گانے کی آواز سنائی دی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بھائیالی گانے عام طور پر ملاح گاتے ہیں اور تب گاتے ہیں جب وہ کشتی چلا رہے ہوتے ہیں۔ گویا نزدیک ہی کوئی ندی تھی جس سے کوئی کشتی والا گزر رہا ہے۔ اس وقت سب سے محفوظ سواری مجھے کشتی نظر آئی اور میں آواز کی سمت دوڑنے لگا۔

سامنے والے ٹیلے کو پار کرتے ہی مجھے کل کل کرتی بہتی ندی نظر آگئی۔ گھاٹ پر نظر پڑی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کیوں کہ گھاٹ پر ایک کشتی والا کھڑا اپنی کشتی کے بادبان کی رسی ٹھیک کر رہا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ یہاں سے شہر اب دور نہیں ہے پھر بھی میں نے کشتی ہی کو ترجیح دی۔ اور اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”بھائی! مہندرو تک جاؤ گے؟“ مہندرو پٹنہ شہر کے درمیان میں واقع گھاٹ کا نام تھا۔

”کیوں نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم گھر سے نکلے ہی اسی لیے ہیں کہ لوگوں کو مہندرو تک پہنچاتے رہیں۔ مگر پاس میں پیسہ ہے نا؟“ وہ باتونی لگ رہا تھا۔ میں نے کوئی لفظ ادا کیے بغیر اس کے ہاتھ پر انھنی رکھ دی۔ آٹھ آنے کا سکہ دیکھ کر اس کی باٹھیں کھل گئیں اور وہ بولا۔ ”بس بھیا جلدی بیٹھ جاؤ۔ آج اتنی اچھی بوٹی ہوئی ہے تو دن بھر اچھا گزرے گا۔“ میں نے آگے قدم بڑھا دئے۔ کشتی پر سوار ہو گیا۔

ملاح نے کشتی پر سوار ہو کر لمبے بانس سے کشتی کو دھکیلا۔ کشتی ساحل سے دور ہونے لگی۔ کچھ دور جاتے ہی اس نے چپو سنبھال لیا اور میرے برابر بیٹھ گیا۔

برابر میں بیٹھنے کے بعد اس نے چہو سے کشتی کو کھینا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”بھیا یہ گولیاں کہاں چل رہی تھیں؟ اب کیسا زمانہ آ گیا۔ جب دیکھو دھانیں دھانیں شروع۔ دو مہینہ پہلے بھی اس علاقہ میں خوب دھانیں دھانیں ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا ڈاکو منگل سنگھ کے گروہ نے کھیا جی کے گھر پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ بہت کچھ لوٹ کر لے گئے۔ جاتے جاتے ایک نوکر کو بھی جان سے مار گئے۔ ہے رام کیسا یوگ آ گیا ہے۔ اب لوگ آدمی کو بھی بھینٹ بکری کی طرح مار دیتے ہیں۔ کل یوگ ہے بھیا کل یوگ۔ اب کلکی اوتار کو آنا ہی پڑے گا۔“

مجھے معلوم تھا جیسے ہم یقین رکھتے ہیں کہ امام مہدی دنیا میں تشریف لائیں گے اور پھر قیامت آئے گی۔ حساب کتاب ہوگا۔ جنت جہنم تقسیم ہوگی۔ اسی طرح ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ پر لئے یعنی قیامت آنے کے پہلے کلکی اوتار آئے گا۔ وہ اشور یعنی بہت برے ایک آدمی کو جو بہت ظالم ہوگا۔ اس کے ظلم سے ہر طرف ہابا کار مچی ہوگی اس کو ختم کر کے کلکی اوتار اپنا راج پاٹ قائم کرے گا۔ پھر بھگوان سورگ (جنت) نرک (جہنم) تقسیم کرے گا۔ اس لیے میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”ارے ہاں یہ بات تو رہ ہی گئی کہ اتنی دھانیں دھوئیں جو ہوئی تو کیا ہوا تھا۔ ڈاکا پڑا تھا کیا؟“

”پتا نہیں۔ میں نے بھی صرف آواز سنی تھی۔“ میں نے پہلو بچانے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیا۔

وہ الٹی سیدھی ہانکتار ہا اور میں ہوں ہاں کرتار ہا اور پھر مہندر و گھاٹ آ گیا۔ میں نے اتر کر اسے مزید کچھ پیسے دیئے اور یہاں آ گیا۔ ”نور محمد نے اپنی پتا ختم کر کے میری طرف دیکھا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ داستان امیر حمزہ ختم ہوئی۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں روک دیتا مگر ان کی بزرگی۔ حالات کی نزاکت نے میرے لب سی دیئے تھے۔ بڑی مشکل سے بولا:

”آپ آرام کریں تھک گئے ہوں گے۔ میں آپ کو بلالوں گی۔“ میں نے ہجڑوں کے مخصوص انداز میں کہا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پھر بولے ”میں اپنے دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں جب بھی آپ کو میری ضرورت ہو بلا لیجئے گا۔ الفانسو صاحب نے گھر دیکھا ہے۔ اگر میں نے کوئی راستہ ڈھونڈا تو آپ کو خبر کر دوں گا۔“

”اب آپ ہمارے ساتھ ہیں۔ آپ کا تعلق پولیس سے رہ چکا ہے اس لیے جانتے ہوں گے کہ کسی بھی کام کی کامیابی تہی ممکن ہے جب ہر کوئی نظم و ضبط سے کام لے۔ آپ اپنے طور پر کوئی کام نہ کریں۔ الفانسو اس وقت ہم سب کا سربراہ ہے۔ وہ جو کہے اسی طرح کریں۔“

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

صبح ہی صبح الفانسو پہنچ گیا تھا۔ اسے بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مختار انگریزی مشروب یعنی چائے لے کر آ گیا۔ اس نے ایک ایک کنویرا چائے سب کے سامنے رکھی۔ الفانسو نے چائے پیتے پیتے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ ”بھائی مختار! یہ تو بتاؤ تم شہر میں آئے کیسے۔“

”یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ بابا کے مرنے کے بعد جنگل میں کیا کرتا اس لیے شہر آ گیا۔“

”پہلے ہی دن ان لوگوں سے ٹکرا گئے تھے؟ ان کا ساتھ مل گیا تھا؟“

”نہیں جی، پہلے روز تو بڑی خواری ہوئی تھی۔“

”کیا؟“

”بس جی مت پوچھیں۔“ مختار نے شرما کر کہا۔

”آخر ہمیں بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔ بتادو۔“ الفانسو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں شہر میں آیا تو رات ہونے والی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس طرح بغیر بستر کے رات کیسے کئے گی۔ یہاں سب انسان ہیں۔ یہ ضرور

مدد کریں گے۔ یہ سوچ کر میں نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ایک بڑے میاں باہر نکلتے۔ میں نے ان سے کہا ”بھائی میں شہر میں نیا

ہوں۔ رات گزارنی ہے۔ اگر آپ مجھے اپنے یہاں سونے کے لیے جگہ دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اس شخص نے کہا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں

نے پوچھا ”کیوں؟ ایسی کون سی پریشانی ہے تو وہ بولا کہ میرے یہاں لڑکیاں ہیں کسی اور گھر والے سے پوچھو۔ میں نے دوسرے گھر پر دستک دی۔

اس گھر سے نکلنے والے نے بھی یہی کہا کہ اس کے گھر میں لڑکیاں ہیں۔ میں پریشان ہوا تھا کہ یہ علاقہ کیسا ہے۔ ہر گھر میں لڑکیاں ہیں۔ اگر اسی طرح

پوچھتا رہا تو رات اسی میں گزر جائے گی۔ کیوں نا ایسا کرتے ہیں کہ جلدی جلدی پوچھتے ہیں۔ کوئی تو گھر ایسا ہوگا جہاں لڑکیاں نہ ہوں۔ بس میں نے

اگلے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک خوب موٹا تازہ آدمی باہر آیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کی گل اے۔“

میں اس کی رنگین پگڑی دیکھ رہا تھا کہ اس نے پھر پوچھا۔ ”اوے کی گل اے۔“

میں نے جلدی سے پوچھا ”آپ کے یہاں لڑکیاں ہیں؟“

اس نے خوں خوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں ہیں..... کیوں؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے سونا ہے۔“ بس اتنا کہنا تھا کہ اس نے وہ مار لگائی کہ مت پوچھیں۔ بار بار دل کر رہا تھا کہ اسے کاٹ لوں مگر اس ڈر

سے نہیں کاٹا کہ اگر یہ مر گیا تو سونے کی بھی جگہ نہیں ملے گی۔

مجھے پتے دیکھ کر بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے اس ظالم سے مجھے چھڑایا۔ اور میں جان بچا کر واپس وہیں آ گیا جس کو شنو

نے ریل اسٹیشن بتایا تھا۔ مگر وہاں بھی چین نہ ملا۔ ایک آدمی میرے کاغذوں کی گڈی لے کر بھاگ گیا۔ غصہ تو پہلے ہی تھا۔ میں نے دوڑ کر اسے اور اس

کے ساتھی کو پکڑا اور دونوں کو کاٹ لیا۔ جب ان سے اپنے کاغذ کے بندل لے کر مڑا تو شنو سے ملاقات ہو گئی اور میں ان لوگوں کے ساتھ آ گیا۔“

”واہ تمہاری آپ بیتی تو بڑے مزے کی ہے۔“ الفانسو نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی یہ بتائیں آپ کی تشریف آوری کا مقصد؟“ میں نے مسکرا کر پرمزاج لہجے میں پوچھا۔

”کل شام میں بکسر سے ایک دوسرا فوجی قافلہ آرہا ہے۔ وہ بھی بانگی پور سے ہوتا ہوا منگیر سے راج محل اور وہاں سے گنگا پار کر کے جی ٹی

روڈ سے ہو کر آسام جائے گا۔ اسے تباہ کرنے کے لیے میں دو دو پارٹی ترتیب دی ہے۔ پہلی پارٹی میں صفدر نور محمد اور مزید پانچ افراد ہوں گے۔ ان

کی مدد کے لیے دوسری پارٹی ان کے عقب میں ہوگی۔ اس پارٹی میں بھی رہوں گا۔ اگر تم تیار ہو تو ایک اور پارٹی بنا لیتے ہیں۔ قافلہ بڑا ہے۔ ہو

سکتا ہے یہ مقابلہ ہماری زندگی کا آخری مقابلہ ہو کیونکہ فوجیوں پر حملہ کرنا۔ انہیں شکست دینا آسان نہیں ہے۔ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو سمجھ لو پوری دنیا میں برٹش سرکار کی تھو تھوچ جائے گی۔ نیتاجی سچاں چندر بوس خوشی سے جھوم اٹھیں گے، کرنل سلطان پوری پارٹی کو شاباشی دیں گے۔

”ہمیں نہ نیتاجی سے کوئی مطلب ہے اور نہ کرنل سلطان سے مجھے تو صرف مہناز بانو کا پتا لگانا ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”مگر یہ بھی تو سوچو کہ یہ خواب نواب صاحب کا ہے۔ پھر آزاد ہند تحریک میں سب سے زیادہ مسلمان ہیں۔ تمہیں یاد دلا دوں کہ ابھی کل رات آزاد ہند عارضی حکومت کا اعلان ہو گیا ہے۔ اس کابینہ میں بھی زیادہ تر مسلمان ہیں۔ کریم غنی اور ڈی ایم خان کو وزیر بنایا گیا ہے۔ لفٹنٹ کرنل عزیز احمد۔ ایم ڈی کیانی۔ لفٹنٹ کرنل شہنواز خان۔ لفٹنٹ کرنل احسان قادر کابینہ میں شامل ہیں۔ گویا یہ جنگ مسلمانوں کی زیر نگرانی چل رہی ہے۔ اس لیے تمہیں بھی اس میں شامل ہونا چاہیے۔“

”تمہارا کہنا صحیح ہے مگر میرے لیے مہناز بانو کی بازیابی بھی ضروری ہے۔“

”یہ بات ہمیں بھی یاد ہے۔“

”تو پھر مجھ سے جو کام بھی لینا ہو اس کے بعد لینا۔ میں اندر سے تپ گیا ہوں۔ کیوں کہ تم صرف مجھے استعمال کر رہے ہو۔ اب تک ویکٹر کے سلسلے میں تم نے کوئی اہم کام کیا ہی نہیں۔“ میں نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

”غصہ کیوں کرتے ہو۔ جب میں نے کہا ہے تو اس پر ہاتھ بھی ڈالوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ صرف تمہارا نہیں میرا بھی مسئلہ ہے۔“

”ٹھیک ہے میں رات میں دیکھوں گا کہ تم کیا کرتے ہو۔ واقعی کچھ کرتے ہو یا بہلاؤ دے رہے ہو۔“

”تم خود دیکھ لینا۔ رات میں اب دیر ہی کتنی ہے۔“

”میری مانو تو ہم خود ہی کوشش کرتے ہیں۔“ نور بیگم نے کہا۔ وہ چائے لے کر آرہی تھی۔

”اگر ایسی بات ہے تو کوشش کر لو۔ ویکٹر نے قدم کناں میں گھر لیا ہے۔“

”ہم خود دیکھ لیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں بھی آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے میں نہیں آؤں گا۔“ الفانسو نے اکھڑے لہجے میں جواب دیا۔

”جو ہونا ہے وہ رات میں دیکھا جائے گا۔ ابھی تم چائے تو پی لو۔“ نور بیگم نے اسے ٹھنڈا کرنے کو کہا۔

”اس نے چائے کا موڈ برباد کر دیا۔ میں شام میں آؤں گا تب پیوں گا۔“ کہہ کر الفانسو کھڑا ہو گیا۔ نور نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

میں نے نئی ساڑھی باندھی نور نے بھی شوخ رنگ کی ساڑھی باندھی جب کہ حسن آرانے عام سالہاس پسند کیا مگر سرخی پاؤڈر کا کھل کر استعمال کیا تھا۔ مختار کو ہم نے بوشرٹ اور پتلون پہنایا تھا۔ حسن آرانے اپنا خاص ہتھیار ڈھول گلے میں لٹکا لیا تھا۔ نور نے چٹی یعنی ہارمونیم لے لی تھی۔

پوری تیاری کے بعد ہم گھر سے نکلے۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ سیدھے قدم کناں جائیں گے۔ ہماری معلومات کے مطابق ویکٹر نے وہاں

ڈیرا ڈالا تھا۔

کدم کنواں تک ہم تانگے پر گئے تھے پھر پیدل اس خاص گھر کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے جس کے بارے میں الفانسو نے بتایا تھا کہ وہ گھریکٹر نے کرایہ پر حاصل کیا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک بڑی سی حویل نظر آئی۔ باقی تمام گھر عام سے کچریل کے تھے۔ میں نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی گھر ہو سکتا ہے۔“

ہم سب تیز تیز قدموں سے اس طرف بڑھتے چلے گئے۔ نزدیک پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ گھر اس طرح کا تھا کہ ایک قلعہ جیسا تھا۔ سامنے بڑا سا پھانگ تھا۔ اس مرکزی دروازے میں داخل ہونے کے لیے دروازہ کھلوانا پڑتا مگر اس کے آگے ایک لمبی مونچھوں والا چوکیدار کھڑا تھا۔ وہ چہرے سے ہی راجپوت لگ رہا تھا۔ یوں بھی چوکیدار کے لیے لوگ گورکھا سکھ یا راجپوت کو ہی ملازم رکھتے ہیں۔

”میں اسے الجھاتی ہوں۔“ نور بیگم نے کہا۔ اور تیزی سے حسن آرا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا۔ نزدیک پہنچتے ہی اس نے تان لگائی۔ ”مبارک ہو مبارک ہو۔ دن وہ ہے آیا۔۔۔ مبارک ہو مبارک ہو۔“

”اے کاہے کوشور کرتا۔“ چوکیدار نے ڈانٹا۔

”اے منہ سنبھال کر۔۔۔ ہم سے متی لگیو۔“ حسن آرا نے زور سے آواز لگائی۔ حسن آرا نے زور سے ڈھول پر تھاپ ماری میں نے تان لگائی۔ ”ارے او منے کے ابا دروازہ تو کھول۔“

ہم گیٹ سے اندر کا منظر بھی دیکھ رہے تھے۔ شور شرابا سے اندر برآمدے پر ایک انگریز نظر آیا جو حیرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے آواز لگائی۔ ”اولال چتندر۔۔۔ دروازہ تو کھول۔۔۔ ہم آئے ہیں تھرے دوارے۔۔۔ لے لو مبارک باد لے لو نا۔“

”اے یہ کیا بولنا۔“ اس نے چیخ کر چوکیدار سے پوچھا۔

”تمری اماں کا نیو تالائے ہیں۔۔۔ لے لو مبارک باد۔“ حسن آرا نے پہلا لفظ آہستہ سے دوسرا زور سے ادا کیا۔

”میں اس کو کاٹوں؟“ مختار نے نور بیگم سے پوچھا۔

”ناس پیٹے تجھے کانٹے کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے۔“ حسن آرا نے جل کر کہا۔ ”یہاں ہم اس لال بندر کو باہر لانا چاہ رہے ہیں اور تو کانٹے کی بات کر رہا ہے۔ چپ چاپ دیکھتا رہ۔ جب وقت آئے گا تو میں خود تجھے ہش ہش کر دوں گی۔“

”صاحب جی لال لال ہم تم سے ملنے آئے ہیں۔ ذرا باہر تو آؤ۔“ نور بیگم چیخ کر بولا۔

”لیس۔۔۔ اب بولو کیا مانگنا۔“ انگریز نے گیٹ پر آ کر کہا۔

”صاحب جی ہم بخشش مانگنا۔“ حسن آرا بولا۔

”ہم سنایا یہاں بچہ ہوا۔ ہم مبارک باد دیتا۔“ نور بیگم نے تالی بجا کر کہا۔

”اڈو ہر حورٹ نا ئی رہنا۔ سب مرد رہنا فر پچہ کیسے ہوگا۔۔۔ جاؤ جاؤ۔“ انگریز نے جھڑکا۔

اسی وقت ایک دوسرا انگریز باہر آیا اور پہلے والے سے انگریزی میں کچھ بولا۔ انگریز نے ہماری طرف بغور دیکھا اور کہا۔ ”اندر چلو۔۔۔ ہم تم

کو پیسہ دے گا۔“

اس کی اجازت ملتے ہی ہم چاروں اندر داخل ہو گئے۔ برآمدہ پار کرتے ہی اس نے اندر کی طرف بڑھنے کا اشارہ دیا۔ ہم اندر پہنچے تھے کہ میرے قدم ٹھٹک گئے۔ سامنے کرسی پر ویکٹر بیٹھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے بگڑی ہوئی اردو میں کہا۔ ”شکار خود چل کر آ گیا۔ اب بولو تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

الفانسو کا ساتھ پکڑنے سے پہلے نواب خاندان کا تعارف حاصل کرنے سے قبل جب میری زندگی حسن آرا اور نور بیگم وغیرہ کے ساتھ گزر رہی تھی۔ جب لوگوں کے گھر جا کر کمر لچکا لچکا کر پیسا دو پیسا مانگنا پیشہ تھا اس وقت اگر ایسا کچھ ہوتا تو شاید میری سانس ہی رک جاتی مگر اب ان حالات کو بھگتنے کے بعد میں ہر قسم کے خطروں سے کھیلنے کا عادی ہو چکا تھا۔ میرے لئے قتل و خون ریزی ایک عام سی بات ہو گئی تھی اس لیے بڑے اکڑ کے ساتھ میں نے کہا۔ ”ہم خود تم سے نمٹنے کے لیے آئے ہیں۔ بولو مہنا زبانا لو کو کہاں رکھا ہے۔“

”ہمیں قید کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اتنی بار کرا کر دیکھ چکے ہو۔“

”وہ حرام زادہ الفانسو بھی کچھ دیر میں آنے والا ہے۔ پولیس نے اس کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ انڈیا میں اتار کی پھیلا نے آیا ہے نا۔ اس کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ اسے جلد گرفتار کر کے لندن بھیج دیا جائے گا۔“

”وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ تمہارے جال میں آجائے گا۔ اسے گرفتار کرنے کی حسرت میں تم خود مر جاؤ گے۔ یوں بھی تمہاری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے اگر مہنا زبانا مل گئی ہوتی تو اب تک تم مر چکے ہوتے۔“

”خواب دیکھنے پر کون پابندی لگا سکتا ہے۔ دیکھو خوب دیکھو۔“

”یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”ہر بارے او ہریا۔“ اس نے اپنے کسی ساتھی کو آواززدی۔ ”ان سب بھجوروں کو لے جا کر بند کر دو۔“

اس کا اتنا کہنا تھا کہ وہاں کھڑے اس کے ساتھی ہم پر نوٹ پڑے۔ اتنی پھرتی سے انہوں نے ہمیں رسیوں میں جکڑا کر ہم دیکھتے رہ گئے۔ مختار نے اچھل کود مچائی تھی مگر اس کی بھی ایک نہ چلی کیونکہ اس کی گردن میں پیچھے سے بازو پھنسا کر اسے قابو کیا گیا تھا۔ ہم سب بے دست و پا ہو گئے تھے۔ عین اسی وقت ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ویکٹر سے سرگوشی میں کچھ کہا تھا کہ ویکٹر بولا ”ان کی اچھی طرح خاطر داری کرنا۔ میں اتنی دیر میں کوتوالی سے ہو کر آتا ہوں۔ سنا ہے کہ ایک خطرناک لڑاکو پکڑا گیا ہے۔ وہ معصوم لوگوں کو درغلا کر بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا۔“

ویکٹر نے اتنا کہا اور باہر نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی ایک آدمی نے آوازے کسنا شروع کر دیا۔ ”اب ہندوستان میں مرد رہے نہیں جو بھجوروں نے محاذ سنجال لیا ہے۔“

”بالکل صحیح کہا۔ اب پورے ہندوستان میں مرد رہے کہاں اگر ہوتے تو سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریز ہمیں غلام بنائے رکھ

سکتے۔ مرد تو اب سراج الدولہ تھے، شیخو سلطان تھے۔ بہادر شاہ ظفر اور شہید تیتو میر تھے۔ کیسے اپنے وطن کے لیے جان دے گئے۔“

”بہت بولتا ہے۔ دے دو چار ہاتھ۔“ ایک دوسرے غنڈے نے کہا۔

”ابے تو کیا دے گا میں خود تجھے دے دوں نا۔“ میں اسے چڑا چاہ رہا تھا تا کہ وہ تپ جائے۔

”زیادہ بڑ بڑمت کر ورنہ تھو بڑا توڑ دوں گا۔“

”بزدل کی طرح اچانک دھوکے سے قابو کر لیا تو خود کو سورا سمجھ رہا ہے۔ اگر ہمت ہے تو ہاتھ کھول پھر میں دکھاتا ہوں دھنائی کیسے ہوتی

ہے۔“ میں نے تپانے کی ایک اور کوشش کی۔ وہ کچھ بولتا کہ ایک دوسرے نے ٹھٹھکیا۔

”اُستاد جانو یہ بھجرا تمہیں لاکار رہا ہے اور تم ڈھیل دے رہے ہو۔“

اس نے میرے کام کو آسان کر دیا تھا۔ میں نے ایک اور کوشش کی۔ ”ابے ٹو چپ رہ۔ ابھی تیرا استاد جانو اس بھجورے سے پٹے گا اور تو

تالیاں بجائے گا۔ بس تھوڑا سا صبر کر لے۔“

میرا اتنا کہنا ہی غضب ہو گیا۔ جانو غصے میں بھراٹھا اور جوش میں آگے بڑھا اور میری رسی کھول کر بولا۔ ”اب آجا میدان میں۔ میں بھی

دیکھتا ہوں تیرے اندر کتنا دم ہے۔“

”سوچ لو اگر پٹ گئے تو لوگ کہیں گے بھجورے سے پٹ گیا۔“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”اور اس وقت جب تم میری ٹھوکر میں ہو

گے تو اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بلاؤ گے۔“

”نہیں کوئی دخل نہیں دے گا۔“

”میں کیسے یقین کر لوں۔ ایسا کرو میرے ایک ساتھی کو کھول دو وہ سب پر نظر رکھے گا۔ اگر کسی نے دخل دیا تو وہ اسے روکے گا۔ ورنہ

خاموشی تماشا ئی بنا رہے گا۔“

”بولو کسے کھولوں۔“ وہ غصے میں بھراٹھا تھا اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔

”اسے۔“ میں نے مختار کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اکیلا مختار سب کو سنبھال لے گا۔ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے اس نے بھی بغیر

سوچے سمجھے آگے بڑھ کر مختار کو کھول دیا پھر میری طرف بڑھا۔ تبھی میں نے کہا۔ ”کاٹ کاٹ کاٹ لے۔“

میری آواز پر کمرے میں جمع تمام غنڈے حیرت سے میری طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ مختار نے پوچھا۔ ”کس کس کو؟“

”سب کو۔“ بس اتنا کہنا کہ مختار نے نزدیک کھڑے غنڈے کو دو بوجا۔ اس نے مختار پر گھونسا چلایا تھا کہ مختار نے اس کی گردن پر منہ مارا۔

پھر پھرتی سے اس کے برابر والے کے ہاتھ پر اور پھر اس کے برابر والے کے شانے پر۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مختار لوگوں کو کاٹنے کے لیے ترسا ہوا تھا۔

ایک کے بعد ایک اس نے چھ کے چھ غنڈوں کو کاٹ لیا۔ صرف ایک بار کاٹنا کافی تھا۔ جسے وہ کاٹا وہ گر کر تر پٹے لگتا۔ جانو نے حیرت سے یہ منظر دیکھا

اور بغیر کچھ بولے اس نے دوڑ لگا دی۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ مختار سے مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ وقت کا تقاضہ یہی ہے کہ بھاگ لے۔ اور وہ بھاگ اٹھا

تھا۔ اس کے پیچھے میں بھی دوڑا۔

دوڑتے وقت میں نے کہا۔ ”مختاران سب سے نمٹ کر حسن آرا اور اماں نور بیگم کو کھول دینا اور سب کے ساتھ گھر چلے جانا۔“

میں نے اپنی رفتار تیز رکھی تھی۔ وہ جی جان لگا کر بھاگ رہا تھا ایسے جیسے اس کے پیچھے موت لگی ہے۔ وہ سیدھا جنگل کی طرف دوڑ رہا تھا۔ کدم کنواں کا علاقہ یوں بھی ویران رہتا تھا۔ صرف ایک مندر تھا جس میں پوجا کے لیے ہندو دور دور سے آتے تھے۔ اسی وقت تھوڑا بہت مجمع ہوتا تھا ورنہ سال بھر یہ علاقہ کسی بیوہ کی اجڑی مانگ کی طرح ویران رہتا تھا۔ سنا تھا کہ آگے جو جنگل ہے جس کا ایک سراگزار باغ تک جاتا ہے اس جنگل میں چھوٹے بڑے جانور بکثرت ملتے ہیں۔ اگر وہ اس جنگل میں داخل ہو جاتا تو اسے تلاش کرنا مشکل تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے ویکٹر کے تمام ٹھکانوں کا پتا معلوم کر لوں۔ اسی لیے میں اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔

جانو اب تب میں جنگل میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ میں نے ساڑھی کے آنچل کو کمر میں کس لیا اور لمبی چھلانگ لگا دی۔

وہ مجھ سے ٹکراتے ہی گر گیا تھا لیکن برقی سرعت سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر ہم دونوں کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ شروع ہو گئی۔

اب ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ میں نے پھر اُس پر چھلانگ لگائی۔ اُس نے کمال ہوشیاری سے خود کو بچایا اور ایک طرف ہو کر میرے جڑے پر اتنی زور سے مکا مارا کہ میری ریڑھ کی ہڈی تک میں آگ بھڑکی۔ میں اس کے حملے سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے مضبوط ہاتھوں کا ایک بھرپور وار میرے گلے سے نیچے پڑا۔ میں درد سے کراہ اٹھا۔

میں کوئی فولاد کا تو ہونا ہوا نہیں تھا۔ نواب صاحب کے مسئلہ میں دخل دینے سے پہلے تو میں نے کبھی کسی کو ایک طمانچہ نہیں مارا تھا اور اب کسی جنگجو کی طرح سے لڑنے بھڑنے والا بن چکا تھا۔ الفانسو نے اتنا کچھ اتنے کم عرصہ میں سکھا دیا تھا کہ میں خود کو کامیاب فائٹر سمجھنے لگا تھا۔ مگر اس وقت مجھے تارے نظر آنے لگے تھے کیونکہ میں ہی نہیں وہ بھی لڑائی میں ماہر تھا۔ وہ مجھ پر بھاری پڑ چکا تھا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ وہ اپنے فن سے کام لینے کے بجائے اپنے طمانچہ سے کام لینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے جو نیم جان سادیکھا تو اپنی جیب سے طمانچہ نکالنے لگا۔ اس وقت وہ میرے قریب تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھ پر گھونسا تانا مگر میں اُس پر سبقت لے گیا۔ میں نے اس کے سر پر ایک زوردار ہاتھ دے مارا جس سے وہ بری طرح ڈمگ گیا۔ اس نے اس کے باوجود میری پبلی پر ایک مکار سید کر دیا۔ میں مدافعت کرنے لگا۔ اس کے گھونسوں میں بڑی طاقت تھی جس کی میں تاب نہیں لارہا تھا۔ وہ مجھ پر مسلسل مکوں کی بارش کرتا تو شاید میں بچ نہ پاتا۔ اس نے جودو بارہ طمانچہ نکالنے کی کوشش کی، وہ اُسے مہنگی پڑی۔

میں نے پھر اُس پر ایک اور جست لگا دی اور ہم دونوں زمین پر آ رہے۔ وہ میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے اس کے منہ، سینے اور نازک مقامات پر جنونی انداز سے مکے برسانا شروع کر دیے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس خبیث نے دم توڑ دیا۔ سفاک، وحشی اور ظالم جس کے نامہ اعمال کی فہرست میں نجانے کتنے بے گناہوں کا خون شامل تھا، پرندوں کی تعفن آمیز گندگی کے درمیان پڑا تھا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اُسے کمزور سمجھ لیا تھا۔ میرے دل کو خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے انتقام لے لیا۔ اس بات کی بھی خوشی تھی کہ میرے گھونسوں میں اتنی طاقت آچکی ہے کہ مجھ سے پٹنے والا مر بھی سکتا ہے۔

گھٹنے میں چوٹ آنے کی وجہ سے مجھے چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ اس لیے میں واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اتنی بھاگ دوڑ بیکارگی تھی۔ جس وجہ سے میں نے اتنی لمبی دوڑ لگائی تھی وہ لا حاصل رہی۔ میں اس سے کچھ بھی پوچھ نہ سکا۔ اب کیا کرنا چاہیے میں اسی سوچ میں ڈوبا آگے بڑھ رہا تھا۔ تقریباً ایک میل آگے آیا ہوں گا کہ میری کھوپڑی طنچہ کے دستے کی ضرب سے بچ اٹھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ میں کتنی دیر بیہوش رہا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں زمین پر چیت پڑا تھا۔ اوپر کھلا آسمان تھا۔ آسمان پر پرندے جو پرواز تھے۔ میں نے سر کو گھمایا تھا کہ میرے جڑے پر ٹھوکر لگی۔ ہونٹوں نے خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ معلوم نہیں کہ جڑاٹوٹنے سے کیسے بچ گیا۔ مگر گوشت میں بہت درد محسوس ہو رہا تھا۔ ایک کرخت آواز نے کہا: ”ذرا دائیں طرف کا نظارہ کرنا..... کس قدر دلفریب منظر ہے۔“

اس کا لہجہ استہزائی تھا۔ میں نے اس کے کہنے کے مطابق اس جانب جو سر گھمایا تو پھر میرے جڑے پر ٹھوکر لگی۔ فضاء میں بد معاشوں کے بھونڈے اور بے ہنگم قہقہے بلند ہوئے جو میرے دل پر کوڑوں کی طرح لگے۔ وہاں ایک دو نہیں کئی بد معاش موجود تھے۔ چند ثانیوں کے بعد اس نے حکم دیا: ”چلو اٹھو..... اب سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ۔“

اب میرے نزدیک اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ مجھ پر تشدد کر کے مجھے موت سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ میں چھ بد معاشوں کے زرعے میں ہوں۔ تین ریوالوروں کی نالیں مجھے فرشتہ اجل کی طرح گھور رہی ہیں۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس وقت صورت حال میرے لئے بہت نازک، خطرناک اور پیچیدہ تھی۔ میں اس بری طرح اُن کی قید میں پھنس چکا تھا کہ اس سے نکلنا ممکن نہیں رہا تھا۔

”کھڑے ہو جاؤ.....“ اس مرتبہ وہ بری طرح دباؤ۔

میں نے کھڑے ہو کر اس کی طرف دیکھا جو مجھ پر مسلسل حکم چلا رہا تھا اور جس نے میرے جڑے پر بیدردی سے ٹھوکریں ماری تھیں۔ اُس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ اُسے انسانی مخلوق تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ پورا گنجا تھا۔ نصف چہرہ انسانوں جیسا ضرور تھا مگر باقی نصف چہرہ ہاتھی سے مشابہ تھا، ہاتھی کی طرح چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں اور مونچھوں کی یہ کیفیت کہ گویا بال نتھنوں میں سے گھاس کی طرح اُگ کر باہر نکل آئے ہوں۔ اس کا چہرہ خوفناک اور انتہائی مکروہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف کر لیا کہ یہ منحوس اور مکروہ چہرہ نہ دیکھ سکوں۔

”شباباش.....!“ اس نے تمسخر سے کہا۔ ”تم بڑے سعادت مند ہوتے جا رہے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تم کسی کا حکم سننے کا عادی نہیں ہو۔ اب بتاؤ کہ جانو کہاں ہے۔ تم اس کے پیچھے بھاگے تھے اس کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا اور یہ بھی بتاؤ کہ الفانسو کہاں ہے؟ تم نے اُسے کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟“

”کون الفانسو...؟“ میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔ ”یہ تم کس الفانسو کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟“

”سنو!“ اُس نے تڑختے ہوئے لہجے میں کہا: ”تم ہمیں بے وقوف مت سمجھو۔ میں جو بھی سوال کروں اُس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ اگر تم نے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تو میں تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گڑگا کی مچھلیوں کی غذا بنا دوں گا۔“

یہ محض اُس کی خالی خولی دھمکی نہ تھی۔ وہ اس بربریت کا مظاہرہ کر بھی سکتا تھا۔ پانسہ میرے خلاف پلٹ چکا تھا۔ موت کا فرشتہ میری نظروں کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مجھ پر کیسا ہی تشدد کیوں نہ کرے میں ایک لفظ اُگل نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس شخص کو اُگلوانے کا فن آتا تھا۔ یہ ایذا رسانی میں ماہر تھا۔ ویکٹر نے میرے تعاقب میں خونخوار شکاری کتوں کو بھیجا تھا۔ میں نے بھی دل میں قسم کھائی کہ مر جاؤں گا مگر الفانسو کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے اُس سے کہا: ”تم جس کے بارے میں پوچھ رہے ہو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”اچھا یہ بتاؤ جانو کہاں ہے؟“ وہ غرایا۔ اس کے سوال سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ انہیں جانو کی لاش نظر نہیں آئی ہے یا پھر وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کے بارے میں سوال کرنا بھی یہی بتا رہا تھا کہ انہیں خبر ہو چکی ہے کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔

”جانو.....؟“ میں نے متعجب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے؟“

”تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو..... کیا تم یہاں محض تفریح اور وقت گزاری کے لئے آئے تھے؟ اس کے پیچھے کیا سوچ کر بھاگے تھے؟“

”ہاں.....“ میں نے جواب دیا۔ ”یہاں بہت خوبصورت پرندوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ میں انہیں دیکھنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ اب اگر جانو بھی ادھر آیا ہو تو مجھے پتا نہیں۔“

اُس نے تاؤ میں آکر ایک زوردار مکارسید کیا تو میں پھر زمین پر گر گیا۔ میں نے کھڑے ہونے یا بیٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ اُسی طرح پڑے رہنے میں ہی میری عافیت تھی۔ مگر وہ مجھے کہاں بخشنے والا تھا۔ اس نے جھک کر میرا گریبان پکڑ کر مجھے بٹھا دیا۔ پھر اُس نے ایک بد معاش سے کہا: ”تم جا کر جانو کو تلاش کرو۔“ پھر وہ مڑ کر مجھ سے بولا۔ ”تم اسی کے تعاقب میں آئے تھے اب تمہیں ایک ہی صورت میں زندگی کی ضمانت دے سکتا ہوں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”جھوٹ سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ سچ بتا دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ مجھے معلوم ہے تم یہاں جانو کے تعاقب میں آئے ہو۔ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ تم میرے سوالات کا صحیح جواب دے کر ہی زندہ سلامت واپس جاسکتے ہو۔“

وہ مجھے زندگی کا لالچ دے رہا تھا۔ لیکن اب مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میری زندگی اس وقت تک سلامت ہے جب تک الفانسو کو نہیں پالیتے۔ میں نے کہا: ”پاگل کتے! تم میری بات کو سچ کیوں نہیں تسلیم کر رہے ہو؟“

وہ میرا جواب سن کر طیش میں آ گیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو نکلے رسید کر کے نیچے گرایا اور میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس نے میرے منہ پر دو تین تھپڑ لگاتے ہوئے سورجیسی آنکھوں سے گھورتے ہوئے غصے سے کہا: ”میں تمہارے پورے جسم کی ہڈیاں توڑ ڈالوں گا۔ میں کیا ہوں تم نہیں جانتے ہو۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں اس کی دھمکی میں نہیں آیا۔ وہ مجھے زندہ سلامت رکھنے پر مجبور تھا۔ اس لئے کہ میری موت

اُسے الفانسو کا پتا نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے میرے سینے سے اترتے ہوئے کہا: ”اب تم کھڑے ہو جاؤ تا کہ میں تمہاری ہڈیاں توڑوں۔“
 ”ادھر دیکھو۔“ ان میں سے ایک بولا۔ ”وہ شاید کوئی موٹر ہے اور موٹر پر فرنگی آتے ہیں۔ جھاڑیوں میں چلو۔“

میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ جتنا جلد ہو سکے اُن درندہ صفت بد معاشوں سے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ میرا ذہن برقی سرعت سے ایسی تدبیر سوچ رہا تھا کہ انہیں فریب دے کر بے وقوف بنایا جاسکے۔ چونکہ اُن کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ میں یہاں کس لئے آیا ہوں اس لئے اس بات کا امکان تھا کہ وہ میرے فریب میں آجائیں گے۔ انہیں غلط راہ پر ڈالنے کے لئے میرے ذہن میں یہ تدبیر تھی کہ..... میں انہیں جھوٹ کے جال میں پھانسوں کہ میں یہاں جانو کے تعاقب میں آیا تھا مگر وہ میرے پیچھے سے پیشتر ہی جا چکا تھا۔ انہیں میری بات کی سچائی پر یقین آ جاتا تو وہ میرے بیان کی تصدیق تک مجھے زندہ رہنے دیتے۔ پھر میں اُسی مہلت سے فائدہ اٹھا لیتا۔

میں نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ایک بد معاش نے ہڈیانی لہجے میں چیخ کر کہا: ”وہ دیکھو.....“ پھر وہ سب اُس سمت میں دیکھنے لگے۔ میں نے بھی دیکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اُن کا ساتھی جانو کی لاش کو اس طرح گھسیٹتا ہوا رہا تھا جیسے وہ کسی جانور کی لاش ہو۔ اس حرام زادے نے اپنے ساتھی کا بھی احترام نہیں کیا تھا۔ پھر اُس نے لاش سامنے لا کر چھوڑ دی۔ سبھی اُس لاش کو دیکھنے لگے۔

زمین پر گھسینے سے لاش کی حالت اور ابتر ہو گئی تھی۔ چہرے کا گوشت اور آنکھ کا ایک حصہ رگڑ کی وجہ سے اڑ گیا تھا۔ منہ بھیانک انداز میں کھل گیا تھا۔ اس کی لاش اور موت عبرتناک بن گئی تھی۔ اس کی زندگی تک یہ غنڈے جو اس کے نام سے کانپتے تھے۔ آج وہی اس کی میت کی بے حرمتی کر رہے تھے۔

میں اس خیال سے کانپ اٹھا کہ یہ کہینے میری لاش کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں گے۔ وہ سر غنہ میرے قریب آیا ”تم نے جھوٹ بولا۔ تم نے یہ نہیں بتایا کہ جانو کہاں ہے پھر بھی ہم نے ڈھونڈ لیا۔ اب یہ بتاؤ کیا اس کی یہ حالت ٹھوکر کھانے سے ہوئی ہے؟ میں سب سے پہلے تمہاری دائیں ہاتھ کی ہڈی توڑوں گا۔“

”پہلے میری ایک بات سن لو۔“ میں نے دلدل میں جیسے ننگے کا سہارا لیا۔ ”میں واقعی جانو کے تعاقب میں آیا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ لیکن وہ مجھ سے جیت نہیں سکا۔ اور زندگی کی بازی ہار گیا۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اُس کے پاس انگلیٹڈ کار یا اور بھی تھا اور تم نہتے..... ایسی صورت میں وہ تمہیں ختم کر دیتا، تم اُسے موت کے گھاٹ کیسے اتار سکتے تھے؟“

”ہم دونوں میں کچھ دیر تک ٹکرا رہی تھی۔ میں نے موقع پا کر اُس کے ہاتھ سے ریو اور چھین لیا تھا۔“

”بہت خوب!“ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”تم نے بڑا اچھا لطیفہ سنایا۔ جی خوش ہو گیا۔ گویا تم ریو اور چھیننے میں مہارت رکھتے ہو۔“ اُس نے توقف کر کے جیب سے ریو اور نکالا۔ اُسے اپنی انگلیوں پر نچاتے ہوئے بولا: ”اچھا تو تم اسے چھین کر دکھاؤ..... تم نے چھین لیا تو تمہیں آزاد

کردوں گا اور یہ دلا جی طمچہ بھی تمہیں دے دوں گا۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ میرے ساتھ تفریح کر رہا ہے۔ شاید یہ بد معاش موت کے منہ میں اُتارنے سے پہلے اپنے دشمن کے ساتھ اسی طرح استہزاء کیا کرتے تھے۔ مجھے خاموش اور بے حس و حرکت پا کر وہ بولا: ”کیا ہوا؟ تم نے ابھی تک مجھ سے ریوا لور نہیں چھینا۔ تم تو اس کام میں ماہر ہو۔“

”اس طرف دیکھو.....“ ایک بد معاش نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

سبھی اس جانب دیکھنے لگے۔ ایک سفید موٹر ہماری سمت آرہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ پولیس کی موٹر ہوگی مگر وہ ہم سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر دوسری طرف مڑ گئی۔ اس میں دو آدمی بیٹھے تھے جو ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان دو میں سے ایک عورت نظر آئی۔ وہ دو سو گز دور جا کر موٹر ہماری طرف مڑتی دکھائی دی۔

اُسے مڑتے دیکھ کر غصہ نے کہا: ”ہمیں یہاں سے ہٹ کر پیڑوں کے جھنڈ میں چلنا چاہیے۔ اس طرح یہاں کھڑے رہنے سے انہیں شک ہو سکتا ہے۔“ پھر وہ مجھ سے بولا: ”تمہارا دماغ ابھی درست نہیں ہوا ہے۔ تم الفانسو کے بارے میں نہیں بتاؤ گے تو سوچ لو۔ تمہارا حشر جانو سے بھی زیادہ دردناک ہو سکتا ہے۔“

”وہ میرے پاس نہیں ہے۔ کیا میں اُسے آسمان سے لا کر تمہاری خدمت میں پیش کروں۔“

وہ پہلے ہی سے اندر اندر کھول رہا تھا۔ میرے جواب نے اُسے تپا دیا۔ اُس نے پھر مجھے گھونسا مار کر زمین پر گرا دیا۔ میں جیسے ہی زمین پر گرا اُس نے جھک کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ تب میں نے دل میں سوچا کہ یہ بد معاش اس طرح ایک ایک کر کے میرے سارے بدن کی ہڈیاں توڑ دے گا۔ گیدڑ کی موت مرنے سے بہتر یہ ہے کہ مجھے اس سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ اب اپنے بازوؤں اور صلاحیتوں کو آزمانے کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔

”ارے یہ دیکھو..... یہ کیا ہے؟“ ایک بد معاش نے ہڈیاں انداز میں چیختے ہوئے کہا۔

وہ بد معاش جو مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اپنے ساتھی کی آواز سن کر سرگھما کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ موٹر شور کرتی ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ موٹر پر کھڑی عورت جس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کا انداز حیران کر دینے والا تھا۔ اس کے جسم پر صرف پنبی کوٹ اور بلاؤز تھا اور ساڑھی اس کے ہاتھ میں تھی جسے وہ مست انداز میں ہوا میں لہرا رہی تھی۔ جیسے وہ پاگل ہو۔

وہ سب ادھر دیکھ ہی رہے تھے۔ یہ موقع غنیمت تھا۔ اسی لیے میں نے ایک لمحے میں وہ کر دکھایا شاید ایک گھنٹے میں بھی ممکن نہیں تھا۔ ان کے انہماک سے فائدہ اٹھا کر میں نے گھٹنا چلا دیا۔ میرے گھٹنے کی زوردار ضرب نے مقابل کو بے حال کر دیا اور حلق سے دلخراش آواز نکالتے ہوئے وہ پیچھے ہٹا چلا گیا۔ میں نے اپنی گرفت اُس پر مضبوط کر لی تھی۔ پھر میں برقی سرعت سے اٹھ کھڑا ہوا اور اُسے اپنی ڈھال بنا لیا۔ اب اُس کا طمچہ میرے ہاتھ میں تھا۔

اُس خبیث کا سر میرے شانے پر جھول رہا تھا۔ وہ میری ضرب کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ میری یہ حرکت نازیبا، نامناسب اور

اوجھی تھی۔ مگر جنگ و محبت میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ پھر وہ سفاک ترین اور ایذا رسانی سے مجھے موت کے منہ میں دھکیلنے پر تلا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے اپنے کیے پر ندامت نہیں تھی۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“ اس بد معاش کے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر میں گر جا۔ ”ورنہ تم سب کو ایک ایک کر کے بھون کر رکھ دوں گا۔“ میں نے اپنا جملہ پورا کیا ہی تھا کہ اُن میں سے ایک بد معاش کو دیکھا، جو مجھ پر فائر کرنے کے لئے پر توڑ رہا تھا۔ اس کی اس حرکت سے صرف یہ خبیث نشانہ بن سکتا تھا جسے میں نے ڈھال بنا رکھا تھا۔ تاہم میں نے اُسے موقع نہیں دیا۔ اس پر دو فائر کر دیئے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا تین چار قدم گیا پھر کئے ہوئے درخت کی طرح نیچے گرا اور اُس نے دم توڑ دیا۔ اُس کی موت نے اُس کے ساتھیوں کو خوفزدہ کر دیا۔ اُنہوں نے اپنے اپنے طمچے پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔

”واہ شنوواہ.....“ یہ آواز حسن آرا کی تھی۔ اسے سن کر میں خوشی سے جھوم اٹھا اور چیخ کر حکم دیا:

”شباباش! تم لوگ واقعی بہت سمجھ دار ہو۔ اپنی جگہ سے ہلنا نہیں.....“ میں نے اُنہیں وارننگ دی۔ اُن کے خبیث سر غنہ کو گھسیٹتا ہوا سرِ رُک کی طرف بڑھا۔ پھر تھکسانہ لہجے میں چیخ کر کہا: ”زندہ رہنا ہے تو بھاگ جاؤ۔“

وہ بھاگنے کے لئے پر توڑ رہے تھے۔ میرا یہ حکم سنتے ہی سر پر پیر رکھ کر مختلف سمتوں میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے اس خبیث کو دھکا دے کر دور پھینکا اور خود تیزی سے موٹر کی طرف دوڑنے لگا۔ موٹر بھی میری طرف ہی آرہی تھی۔ چند لمحوں میں میں موٹر میں تھا۔

”یہ بھڑنگی بابو ہیں۔ موت کے کنوئیں میں موٹر چلاتے ہیں۔ میرے ساتھ موٹی سی کلپنا تھی ناں! ارے وہی جس نے گلے میں ہار مونیم لٹکا رکھا تھا۔ یہ اُسی کے مرد ہیں۔“ حسن آرا نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے صاحب کا تعارف کرایا۔ ”میں اماں اور مختار کے ساتھ گھر پہنچی تو میرا دل گھبرانے لگا اور میں گھر سے نکل پڑی۔ راستے میں ان سے ملاقات ہو گئی میں نے جب اُن سے کہا کہ میرے ایک دوست کو کچھ لوگ قتل کرنے کے لئے جنگل میں لے کر گئے ہیں تو یہ اپنی موٹر نکال لائے۔ طوفان کی طرح ہم یہاں آئے ہیں۔“

میں حسن آرا کا مشکور تھا۔ اس نے ایک بار پھر میری جان بچائی تھی۔ واقعی اُس نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

”ہاں... اب تم لوگوں کو کہاں اتار دوں؟“ بھڑنگی نے پوچھا۔

”کہیں بھی اتار دو۔ اب تو ہم پٹنہ میں آ ہی گئے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح گھر بھی پہنچ جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر ایسی بات ہے تو میں گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں نہیں... ہم چلے جائیں گے۔ آپ ہمیں سبزی باغ تک پہنچا دیں وہاں سے ہم تانگہ لے لیں گے۔“

”تانگہ ہی لینا ہے تو سامنے بابو کوئی کا علاقہ ہے وہاں سے لے لو۔ ریل کے انتظار میں وہاں تانگے والے کھڑے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ریل سے آئے والے زیادہ پیسہ دیتے ہیں۔“

”یہ صحیح کہا۔ بس ہمیں اتار دیں۔“

اس نے اپنی سرکس والی موٹر روک دی۔ ہم نیچے اتر آئیں۔ وہ سیدھا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی ہم بھی آگے بڑھنے لگے۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ ہمیں ایسا لگا جیسے کوئی موٹر ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ اس کی رفتار بہت سست تھی اسی لیے میں چونک گیا تھا۔ میں نے یہ بات حسن آرا کو بتائی تو اس نے بھی تصدیق کر دی کہ اتنی سست رفتاری سے موٹر کے آنے کا مطلب ہے کہ وہ ہم پر نظر رکھ کر چل رہی ہے۔

”دعا کرو کہ کوئی تانگہ مل جائے ورنہ خواہ مخواہ ہاتھ پیر چلانا پڑے گا۔“ تبھی میری نظر داہنی جانب والی سڑک سے آنے والی ایک موٹر پر پڑی جو اب اسی سڑک پر آگئی تھی۔

میں نے اور حسن آرا نے بے اختیار پلٹ کر اس جانب دیکھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ نیم تاریک دھندلکے میں وہ دو روشن ستارے اب بھی موجود تھے جنہیں میں نے بزرگی کی گاڑی سے بھی دیکھا تھا۔ اور اب وہ پہلے سے کہیں واضح تر ہو چکے تھے۔ اسی لمحے اچانک دائیں طرف سے کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس ہم پر پڑیں۔

میں نے حسن آرا کا ہاتھ چھوڑا اور سڑک کے پیچوں بیچ آ کر زور زور سے ہاتھ لہرانے لگا۔ وہ ہیڈ لائٹس مجھ سے چند گز کے فاصلے پر آ کر رک گئیں۔ میں نے حسن آرا کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے اس گاڑی کی جانب لپکا۔

یہ ایک اونچا اور بھاری بھر کم ٹرک تھا۔ ڈرائیور یا شاید اس کے ساتھی نے جو بھاری چہرے والا ایک ادھیڑ سا آدمی تھا اس نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور خشونت بھری آواز میں کچھ کہنے لگا۔ وہ بنگالی زبان میں بات کر رہا تھا۔ یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔

”ہمارا تانگہ والا بھاگ گیا ہے۔“ آپ ہمیں بٹھالیں؟“ میں نے چلا کر کہا۔ وہ شخص الجھن بھری نظروں سے کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا شاید میری بات پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ میرا مقصد سمجھ گیا ہوگا۔

”مگر تم ہو کون اور اس وقت رات میں یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ڈرائیور نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ اس کے لہجے سے اور اس کے چہرے سے شک کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ہم دونوں سیر کے لیے بمبئی سے آئے ہیں۔“ میں نے کسی توقف یا ہچکچاہٹ کے بغیر کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتا میں نے دونوں ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”باہر بہت سخت سردی ہے آپ گاڑی میں سوار ہونے کی اجازت دے دیں۔“

”آ جاؤ۔“ اس شخص نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ کہا اور اگلے ہی لمحے دروازہ کھول دیا۔ میں نے سہارا دے کر پہلے حسن آرا کو گاڑی میں سوار کرایا پھر پھرتی سے خود بھی اوپر پہنچ گیا۔ ٹرک کا یہ اگلا حصہ خاصا کشادہ اور گرم تھا۔

اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس میں دو افراد ہیں وہ شخص جو ہم سے باتیں کرتا رہا تھا ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرک کا ڈرائیور اس شخص کی نسبت کم عمر تھا اور عجیب ہولناک نگاہوں سے میرا اور حسن آرا کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید وہ ہمیں لڑکی سمجھ رہا تھا۔

اگلی دونوں نشستوں کے پیچھے ایک لمبی کاؤچ نما سیٹ تھی۔ ادھیڑ عمر شخص نے ہمیں اس سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا اور اس کے ساتھ ہی ٹرک

دوبارہ حرکت میں آ گیا۔ میری نظریں بے اختیار بائیں جانب والی کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ وہ روشن نقطے جو ہمیں دھند میں جھلملاتے دکھائی دیے تھے اب بھی موجود ہیں یا نہیں مگر کھڑکی کے شیشے اس حد تک دھندلائے ہوئے تھے کہ باہر کی کوئی چیز دیکھنا ممکن نہ تھا۔

”اتنی رات گئے تم دونوں اس اجاڑ غیر آباد جگہ پر کیا لینے آئے تھے؟“ یہ سوال ڈرائیور نے اردو میں پوچھا اور میں نے محسوس کیا کہ اپنے ادھیڑ عمر ساتھی کی نسبت اس کی اردو خاصی بہتر تھی۔

”یہاں ایک بہت قدیم حویلی ہے سوہویں صدی کی۔“ میں نے فوراً بات بنائی۔ ”ہم دونوں اس کی سیر کے لیے آئے تھے مگر پھر بارش شروع ہو گئی۔ ہم بہت دیر تک بارش کے رکنے کا انتظار کرتے رہے مگر پھر بالآخر واپسی کے لیے نکلنا پڑا لیکن بد قسمتی سے کچھ ہی دور جا کر ہمارا تانگے والا ہمیں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔“

”ہوں۔“ ڈرائیور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پنشن میں تم دونوں کس جگہ جاؤ گے میرا مطلب ہے کس سرائے میں ٹھہرے ہو ہو سکتا ہے ہم اس کے قریب سے گزریں۔“

”ہم پچھم دروازے جائیں گے۔“ میں تیزی سے بولا۔ ”مگر آپ ہمیں شہر کے شروع میں کسی ایسی جگہ اتار دیں جہاں سے ہمیں سواری مل جائے۔“

”ہوں۔“ ڈرائیور نے پہلے کی طرح سر ہلاتے ہوئے نیچی آواز میں کہا اور اپنے سامنے لگے ہوئے آئینے میں ایک بار پھر رال پکاتی نظروں سے حسن آرا کی جانب دیکھا۔

مجھے اس کی ان ہولناک نظروں سے اور اس کے سوالوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ اس سے کہوں اپنی نگاہیں سامنے سڑک پر مرکوز رکھے اور مزید کوئی سوال نہ پوچھے مگر میں ایسا نہ کر سکا اور نہ ہی میری یہ خواہش پوری ہو سکی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اگلا سوال کیا۔ ”تم دونوں بہنیں ہو یا.....“

”ہم دونوں سہیلیاں ہیں۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ دراصل میں حسن آرا کے بارے میں ڈرائیور کے مفالطے کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی وقت بیک ویو مرر سے منعکس ہونے والی روشنی ایک ٹائپ کو میرے چہرے پر پڑی تو میں نے بے اختیار اس آئینے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ٹرک کے اس غیر معمولی طور پر لمبو ترے سے آئینے میں مجھے پیچھے سے آنے والی کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں اگرچہ کافی دور معلوم ہو رہی تھیں مگر انتہائی تیزی سے وہ ہر لمحے قریب تر آتی جا رہی تھیں۔

خطرے کی مخصوص سنسنی نے میرے وجود کے اندر سر اٹھایا۔ اسی وقت غالباً ٹرک کے ڈرائیور نے بھی ان روشنیوں کو دیکھ لیا۔ اپنی جانب کے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے وہ اونچی آواز میں بولا۔

”یہ کون احمق ہے اس قدر تیز رفتاری سے چلا آ رہا ہے۔ یوں جیسے ہمارے تعاقب میں آ رہا ہو۔“

ڈرائیور کی اس بات نے میری تشویش کو کچھ اور بڑھا دیا۔ ”تم رفتار کچھ اور تیز نہیں کر سکتے؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”کیوں؟“ ڈرائیور نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ ”کہیں یہ گاڑی تمہارے تعاقب میں تو نہیں آرہی؟“

”نہیں! ہاں شاید میرا مطلب ہے ممکن ہے ایسا ہی ہو۔“ میں ڈرائیور کے اس غیر متوقع سوال پر ذرا دیر کو گڑبڑا سا گیا۔ اسی لمحے بے اختیار میری نظر ایک بار پھر بیک ویو مرر پر پڑی پیچھے آنے والی گاڑی کی روشنیاں اب بہت قریب آچکی تھیں۔

ڈرائیور نے سامنے لگے آئینے کی طرف رخ کر کے نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کیں اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص نے اس سے مخاطب ہو کر بنگلہ میں کوئی بات کی۔ جواب میں ڈرائیور نے نیچی آواز میں کچھ کہا جسے سنتے ہی وہ ادھیڑ عمر شخص اونچی آواز میں کچھ بولنے لگا پھر گردن گھما کر اس نے میری طرف دیکھا اور غصے بھری آواز میں نہ جانے کیا کہتا رہا۔

”آپ کے یہ ساتھی کیا کہہ رہے ہیں؟“ میں نے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”یہ کہہ رہے ہیں کہ تم دونوں فوراً گاڑی سے اتر جاؤ۔ ہم کسی جھگڑے یا کسی مشکل میں گرفتار نہیں ہونا چاہتے۔“ ڈرائیور نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھی کا خیال ہے کہ تم دونوں کوئی جرم کر کے بھاگی ہو اور اب پولیس تمہیں گرفتار کرنے کے لیے آرہی ہے۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”بات اصل میں یہ ہے کہ جس جگہ ہم سیر کے لیے گئے تھے وہاں چند غنڈوں نے ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم دونوں بڑی مشکلوں سے ان کے چنگل سے نکل کر بھاگے ہیں۔ مگر ان غنڈوں نے شاید ہمیں آپ کے ٹرک میں سوار ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ کیا آپ اس مصیبت میں ہم دونوں کی مدد نہیں کریں گے؟“

ڈرائیور میری یہ بات سن کر چند ثانیے گوگو کی کیفیت میں رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بنگلہ میں اپنے ادھیڑ عمر ساتھی سے کچھ کہنے لگا لیکن ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کا ساتھی اونچی آواز میں نہ جانے کیا کہنے لگا اور ہاتھوں سے کبھی ہماری طرف اور کبھی باہر کی جانب اشارہ کرنے لگا۔ ”شہا کرو۔“ ڈرائیور نے کندھے اچکائے اور میری طرف رخ کر کے بولا۔ ”میں تو آپ دونوں کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر میرا ساتھی نہیں مانتا۔ اس کا کہنا ہے کہ پہلے ہی ہم بہت زیادہ لیٹ ہیں اب ہم مزید ایک منٹ.....“

ڈرائیور اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا اور اس کی نظریں سامنے سڑک پر مرکوز تھیں اور خوف اور پریشانی کا تاثر اس کے چہرے پر گویا منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر سامنے کی طرف دیکھا تو چند سیکنڈ کے لیے خوف کی ایک لہر میرے وجود میں بھی اترتی چلی گئی۔ ہمارے ٹرک سے تقریباً تیس گز آگے ایک بڑے سائز کی موٹر سڑک کے پیچوں بیچ یوں ترچھی کھڑی تھی کہ ٹرک کا آگے بڑھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ موٹر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ہمارے ٹرک کو روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

میری نظر بے اختیار بیک ویو مرر کی طرف گئی مگر وہ آئینہ تاریک ہو چکا تھا۔ بلاشبہ یہ وہی موٹر تھی جو چند سیکنڈ پہلے تک ہمارے ٹرک کے پیچھے آرہی تھی۔ جب ہم باتوں میں منہمک تھے اس دوران وہ موٹر ہمارے برابر سے نکل کر آگے چلی گئی تھی اور اب وہ ہمارا راستہ روک چکے تھے۔ ایسی موٹر میں عام استعمال میں کم ہی نظر آتی تھیں۔ یہ فوج کے استعمال میں رہتی تھیں۔

ٹرک ڈرائیور نے موٹر کو دیکھتے ہی بریک پر پاؤں رکھ دیا تھا پھر بھی ٹرک کچھ دور تک پھسلتا چلا گیا۔ ہیڈ لائٹس میں نے دیکھا کہ سامنے کھڑی ہوئی موٹر کے دروازے سے درمیانے قد کا ایک تو مند شخص اور ایک طویل قامت شخص جس کے ہاتھ میں جدید طرز کی ایک سیاہ بندوق نظر آرہی تھی باہر آیا۔

یہ منظر حسن آرا بھی دیکھ رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے وجود میں ایک عجیب سا نو مولود جذبہ ایک ولولہ انگیز عزم گویا میرے روئیں رولتا اور پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ انوکھا احساس میرے لیے کچھ ایسا بہت نامانوس بھی نہیں تھا۔ اپنی اس نئی زندگی میں جب بھی مجھے ایسے کسی خطرے کا سامنا کرنا پڑا ہر بار یہ انوکھا احساس میرے دل و ذہن کو اور میرے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ اس کیفیت میں میرا ذہن غیر معمولی طور پر تیزی سے کام کرنے لگتا تھا اور طاقت و توانائی جیسے میرے جسم کے اندر سے اور میرے ہر عضو سے ایٹنے لگتی تھی۔

باہر جانے کے ارادے سے میں اپنی سیٹ سے اٹھنے لگا تو اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے میں خود کو ان غنڈوں کے حوالے کر رہی ہوں لیکن مہربانی کر کے ایک احسان مجھ پر کریں کہ میری سہیلی کو بچھتم دروازے تک پہنچادیں اور.....“ میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ حسن آرا تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میری بازو کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے کر بولا۔ ”نہیں میں تمہارے بغیر ہرگز کہیں نہیں جاؤں گی ہم دونوں ساتھ ہی باہر نکلیں گے۔“

میں نے پلٹ کر حسن آرا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عزم کی چمک تھی۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھپک کر کہا۔ ”ہمت نہ کھونا۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ وہ سب ہتھیار جو کچھ دیر پہلے میں نے چھپنے تھے میری جیبوں میں موجود تھے۔ دلائی طمنچہ ساز میں بڑا تھا اور اسے ہاتھ میں لے کر نکلتا تو وہ فوراً نظر آ جاتا تاہم خنجر ساز میں کافی چھوٹا تھا اور بے آسانی چھپایا جاسکتا تھا۔

میں نے وہ خنجر جیب سے نکالا اور اسے اپنی آستین میں اس طرح اڑس لیا کہ اس کا دستہ میری آستین کے اندر چھپا ہوا تھا جبکہ اس کی نوک میری ہتھیلی پر تھی۔ میں نے اپنی انگلیاں اس نوک پر جمائیں اور دوسرے ہاتھ سے حسن آرا کا بازو تھام کر ٹرک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد میں اور حسن آرا اس ٹرک سے چند گز آگے سڑک کے درمیان سے اس موٹر کی طرف بڑھ رہے تھے جو ہم سے چند گز آگے سڑک کے درمیان کھڑی تھی۔ ٹھکنا نو دار داب موٹر کے سامنے کھڑا تھا اور اپنے دائیں ہاتھ میں طمنچہ تھامے اس کا رخ ہماری طرف کیے ہوئے تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ ابھی تک موٹر کے پچھلے دروازے کے قریب کھڑا تھا مگر اس کے طمنچہ کی نال بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

”اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھاؤ۔“ اس نے اونچی درشت آواز میں کہا اور پھر تسخرا نہ انداز میں ہنستے ہوئے قدرے دھیمے انداز میں بولا۔ ”اے او بھجڑے تو تو یوں آرہا ہے جیسے اپنی محبوبہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی پارک میں چہل قدمی کر رہا ہے۔ تیزی سے قدم بڑھا ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

میں نے حسن آرا کا ہاتھ چھوڑا اور دونوں بازو اس طرح اوپر اٹھائے کہ میری ایک انگلی اب بھی خنجر کی نوک پر جمی ہوئی تھی۔ حسن آرا نے بھی اپنے ہاتھ اوپر اٹھالیے اور بالاعتماد انداز سے چلتے ہوئے ہم دونوں بالآخر اس موٹر کے قریب پہنچ گئے۔

ٹرک کی تیز ہیڈ لائٹس سیدھی ٹھکنے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ فاتحانہ ہی نہیں حقارت آمیز بھی تھی۔ طیش کی ایک آتشیں لہر میرے اعصاب کو سلگاتی چلی گئی۔

”بس کرو کب تک یہ بچکانہ آنکھ بھولی کھیلتے رہو گے۔“ ٹھکنے نے اپنے طمنچہ کی نوک سے میری کپٹی پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں تم خود کو ہماری نظروں سے چھپا سکو۔“

”فضول باتیں چھوڑو اس لڑکی کو جانے دو۔“ میں نے اعتماد سے حسن آرا کو لڑکی کہا۔

”تمہاری تاکید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یقیناً ایسا ہی کریں گے مگر ابھی نہیں دو تین روز کے بعد۔“

”دو تین روز بعد کیوں؟“ میں نے تیزی سے بولا۔

”ہیں ہماری کچھ انتظامی مجبوریاں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا پھر ایک لمحے کو توقف کے بعد معنی خیزی سے مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”مگر تم فکر مت کرو ان دو تین دنوں کے دوران تم دونوں کو ہم ایک ہی جگہ پر رکھیں گے۔ دیکھو ہمیں تمہارا کس قدر خیال ہے اس مہربانی پر تمہیں ہمارا شکر یہ ادا کرنا چاہیے۔“

”مگر مجھے تمہاری اس مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر ایک بار پھر معنی خیزی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور کچھ کہنے کے ارادے سے اس نے منہ کھولا مگر اسی لمحے ٹرک کے ہارن کی آواز گونجی اور ہم سب پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ادھیڑ عمر شخص ٹرک کی کھڑکی سے سر باہر نکالے زور زور سے ہاتھ ہلاتا تھا اور اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

”اوکے اوکے۔“ نو وارد نے اپنا بایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے چلا کر کہا اور پھر موٹر کے ڈرائیور کی طرف رخ کر کے بولا۔ ”موٹر کو ایک طرف کر لو۔ اس کو بہت جلدی ہے پہلے اسے گزر جانے دو۔“

”نہیں سرا“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے مودبانہ لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی موٹر حرکت میں آ گئی۔ چند گز ریس کرنے کے بعد اس نے موٹر سڑک کے کنارے اس طرح لاکھڑی کی کہ میں اور حسن آرا اب موٹر کے سامنے نہیں بلکہ اس کے اگلے دروازے کے بالکل پاس کھڑے تھے جبکہ طویل قامت بندوق بردار چند قدم پیچھے ہم پر نشانے لیے کھڑا تھا۔ موٹر کی اس مختصر سی حرکت کے دوران میں نے دیکھ لیا تھا کہ ڈرائیور کے سوا موٹر کے اندر کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔

موٹر جیسے ہی سڑک کے کنارے آ کر رکی دیو پیکل ٹرک حرکت میں آیا اور ہمارے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا اگرچہ اس دوران بندوق بردار کی توجہ زیادہ تر مجھ پر مرکوز رہی تھی مگر جب ٹرک گرج دار آواز کے ساتھ ہمارے پاس سے گزر کر آگے گیا تو محض چند سیکنڈ کے لیے ان دونوں نے

گردن گھما کر اس ٹرک کی طرف دیکھا، میرا ذہن اور میری آنکھیں جو خطرے کے ان لمحات میں غیر معمولی طور پر مستعد اور نگران تھیں، غفلت کے اسی مختصر ترین وقفے کی منتظر تھیں۔

جیسے ہی دونوں نے اپنا رخ دوسری جانب کیا، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے اپنی آستین میں چھپا ہوا خنجر مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھاما اور اس کے ہاتھ پر وار کیا جس میں اس نے طنچہ تمام رکھا تھا اور جو میرے چہرے کے بالکل قریب تھا۔ معلوم نہیں یہ میرے اندازے کی غلطی تھی کہ عین وقت پر اس نے اپنے بازو کو خفیف سی حرکت دی تھی۔ میرے خنجر کی نوک اس کی کلائی میں پوست ہونے کی بجائے اس کی کھال کو چھیلی چلی گئی۔ اسی لمحے میں نے نہایت سرعت سے اپنے بائیں ہاتھ کو نیچے جھکایا تاکہ طنچہ اس کے ہاتھ سے چھین سکوں لیکن اس سے پہلے کہ میرا وہ ہاتھ طنچہ تک پہنچ سکتا، اس نے تکلیف کی شدت سے اپنے ہاتھ کو زور سے جھکا اور طنچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے جا گرا۔ ”حسن آرا، فوراً یہ طنچہ اٹھا لو“ میں نے اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

حسن آرا جو اس کو یوں اچانک تکلیف سے سسکاریاں بھرتے اور ہاتھ جھٹکتے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا تھا، میری آواز سن کر نیچے پڑے ہوئے طنچہ دیکھا اور اسے اٹھانے کے لیے جھکا مگر اس کا ہاتھ ابھی طنچہ تک نہیں پہنچا تھا کہ فضا میں فائر کا زوردار دھماکا ہوا اور وہ اچھل کر بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔

فائر اس طویل قامت شخص نے کیا تھا جو بندوق تانے کھڑا تھا۔ بندوق کی گولی حسن آرا کے پیروں کے بالکل قریب جا دھنسی تھی اور میں نے دیکھا کہ اس بندوق بردار کی انگلی دوبارہ ٹریگر پر سرسرا نے لگی تھی۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے میرے پاس بہت مختصر وقت تھا۔ میں نے خنجر کی نوک فوراً ٹھکنے کی گردن پر رکھ دی جو ابھی تک بری طرح ہاتھ جھٹک رہا تھا اور مغلظات بک رہا تھا۔ وہ میری اس غیر متوقع حرکت پر ایک لمحے کو بوکھلا کر رہ گیا۔ میں نے فوراً ہی طنچہ نکالا اور پھر وہ ہاتھ اس کی گردن میں گھما کر طنچہ کی نال اس کی بائیں کپٹی سے لگا دی۔

”بندوق پھینک دو۔“ میں نے طویل قامت شخص کی جانب دیکھتے ہوئے واضح آواز میں کہا۔ ”ورنہ اس خنجر کے پھل تمہارے پاس کی شبہ رگ میں اتر جائے گا اور طنچہ کی گولی اس کپٹی میں۔“

یہ صورت حال اس بندوق بردار کے لیے بھی قطعی غیر متوقع تھی۔ کچھ دیر تک وہ شش و پنج کے عالم میں نال کو تیزی سے دائیں بائیں حرکت دیتا رہا، جیسے فائر کرنے کے لیے کسی موزوں زاویے کی تلاش میں ہو مگر وہ دوبارہ فائر نہ کر سکا۔

”تم نے سنا نہیں۔“ میں نے دوبارہ چلا کر کہا۔ ”بندوق نیچے ڈال دو فوراً ورنہ اس طنچہ کی ساری گولیاں ابھی تمہارے اس رنگ لیڈر کے سر میں اتار دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن میں چھوئی اور طنچہ کے ٹریگر پر دانستہ اپنی انگلی کو حرکت دی۔

نو وارد کے حلق سے بے اختیار ایک سسکاری سی بلند ہوئی۔ میں تیسری بار طویل قامت شخص کو وارننگ دینے والا تھا مگر اس سے پہلے ہی اس نے ہچکچاتے ہوئے بندوق پھینک دی۔

”حسن آرا آگے بڑھو، بندوق اٹھا کر اس لمبے کے پیچھے کھڑی ہو جاؤ مگر اس طرح کہ بندوق کی نال اس بد معاش کی کمر سے لگائے رکھنا اگر

کوئی حرکت کرنے کی کوشش کرے تو بے دھڑک فائر کر دینا۔“ میں نے اپنی توجہ طویل قامت شخص کی جانب رکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

حسن آرا آگے بڑھتے ہوئے ہچکچار ہاتھ اور اس کی یہ ہچکچاہٹ کچھ ایسی بے سبب بھی نہیں تھی۔ ”آگے بڑھو اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرو۔“ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ”یہ ہم دونوں کی زندگیوں کا سوال ہے اگر ہم نے دیر کر دی یا ہمت یا بیٹھے تو ان بد معاشوں کے اور ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ جلدی کرو شاہاں۔“

میری یہ بات سن کر حسن آرا تیزی سے آگے بڑھا اور بندوق اٹھا کر اس طویل قامت شخص کے پیچھے چلا گیا۔ میں پوری طرح حسن آرا کی جانب متوجہ تھا اس دوران دوسرے ”ٹھک ٹھک“ کی نہایت مدھم سی آواز میری کانوں تک پہنچی اور پھر جیسے کسی نے سرسراتی ہوئی آواز میں آہستگی سے کچھ کہا۔

یہ سنتے ہی میں نے فوراً ٹھکنے کی طرف دیکھا وہ اپنا پاؤں پیچھے کیے غالباً تیسری بار موٹر کے اگلے حصے پر ٹھوکر لگانے کو تھا اور یہ سرگوشی بھی بلاشبہ اسی نے کی تھی۔ میرے لیے یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ وہ کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے بے اختیار اس تیسرے شخص کی جانب دیکھا جو ابھی تک موٹر کے اندر موجود تھا وہ اپنے پاس کا اشارہ سمجھ چکا تھا اور ڈیش بورڈ پر رکھی بندوق اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے موٹر کا اگلا دروازہ کھول رہا تھا۔

اس نئے خطرے نے چند ثانیوں کے لیے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس تیسرے شخص کو کیسے روکا جائے اگر میں خود آگے بڑھ کر مزاحمت کی کوشش کرتا تو لازمی طور پر میری توجہ ٹھکنے کی طرف سے ہٹ جاتی اور وہ تو شاید ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں تھا وہ بلاشبہ میری اس غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا اور اگر میں حسن آرا کو اس کا نشانہ لینے کی ہدایت کرتا تو طویل قامت شخص ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر حسن آرا پر قابو پالیتا۔

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور اپنے دماغ سے رجوع کرنے کی کوشش کی میری یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی جیسا کہ پہلے بھی خطرات کے موقع پر کئی بار مجھے تجربہ ہو چکا تھا ’نسیان کے اندھیروں میں گم الفانسو کا پڑھایا ہوا سبق جیسے میرے شعور میں تازہ ہو گیا۔

”جب کبھی ایسا موقع آئے کہ تمہیں بیک وقت دو دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑے تو اس صورت حال سے نمٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دو اسے جو تمہارے نزدیک تر ہو فوری طور پر کچھ دیر کے لیے ناکارہ کر دو۔“ یہ الفاظ ماضی کی اندھی گہرائیوں سے آرہی تھی اور میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ”اگر تمہارے پاس کوئی طنچہ یا بندوق ہو تو اس شخص کے کسی ایسے عضو کو نشانہ بناؤ کہ وہ ہلاک بھی نہ ہو اور کچھ دیر کے لیے ناکارہ ہو جائے۔“

میری تمام تر توجہ اس آواز پر مرکوز تھی مگر میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ موٹر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص موٹر کا دروازہ کھول چکا تھا اور اب باہر نکلنے والا تھا۔

مزید کسی سوچ و بچار کا کوئی موقع نہ تھا میں نے ٹھکنے کی جانب دیکھا۔ وہ گردن موڑے اپنے اسی ساتھی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں دبے پنجر کی نوک اس کے حلق سے ہٹا کر اس کی گردن کے وسط میں ایک جھٹکے سے چوتھائی انچ کے قریب گوشت میں پیوست کی اور پھر فوراً ہی اس کے کان کی لوتک جلد کو کاٹنا چلا گیا۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہوا اور میرے ہاتھ اور آستین کو بھگوتا چلا گیا۔ اس کے حلق سے نکلنے

والی چیخ میری توقع سے کہیں زیادہ کرب ناک اور اونچی تھی۔ وہ تازہ ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپ کر موٹر کے بونٹ سے لکرایا اور پھر نیچے گر گیا۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر تیزی سے موٹر کے اگلے دروازے کی جانب لپکا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص اپنا دایاں بازو جس میں اس نے بندوق تھام رکھی تھی دروازے سے باہر نکال چکا تھا مگر ٹھٹھنے کی دلدوز چیخیں سن کر وہ چند ثانیوں کے لیے ٹھٹھک کر رہ گیا تھا اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی پیش قدمی کرتا میں دروازے کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ داہنے ہاتھ سے دروازے کے ہینڈل کو تھام کر میں نے ذرا سا پیچھے کی طرف کھینچا اور پھر فوراً ہی اتنی طاقت سے اس شخص کے بازو پر دے مارا کہ مجھے یقین تھا اس ضرب سے اس کی کلائی کی دو تین ہڈیاں ضرور چکنا چور ہو گئی ہوں گی۔

اس شخص کے حلق سے بلند ہونے والی چیخ بھی میرے شکار کی چیخوں سے کم دلدوز اور کرب ناک نہ تھی۔ تکلیف کی شدت سے وہ بار بار اپنا سر ہیڈ ریسٹ سے ٹکرا رہا تھا مگر میں نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنا دباؤ کم نہیں ہونے دیا۔ اس کے برعکس میں نے اپنے ہاتھوں کے علاوہ اپنے گھٹنے کو بھی موٹر کے دروازے کے ساتھ لگایا اور پوری طاقت سے اندر کی جانب دھکیلنے لگا۔

اس شخص کی چیخیں پہلے سے بھی زیادہ بلند تھیں اور بندوق اس کی بے اختیار اکڑ جانے والی انگلیوں سے پھسل کر باہر آ گری۔ میں نے دروازے پر اپنا دباؤ بدستور برقرار رکھتے ہوئے بائیں ہاتھ میں تھاما ہوا طمچہ جیب میں ڈالا اور پھر اسی ہاتھ سے نیچے پڑی ہوئی بندوق اٹھالی لیکن ابھی میں سیدھا کھڑا نہیں ہو پایا تھا کہ فضا میں ایک تیسری چیخ گونجی۔ یہ حسن آرا کی چیخ تھی میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ طویل قامت شخص اس کے ہاتھ سے بندوق چھیننے کی کوشش کر رہا تھا اس نے بندوق کی نال کو اپنے بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا دونوں ہاتھ بندوق کے دستے پر جمائے اپنی جانب کھینچ رہا تھا مگر طویل قامت شخص نے اس کے بال اپنے دوسرے ہاتھ کی گرفت میں لے رکھے تھے اور انہیں بار بار جھٹکے دے رہا تھا۔ وہی حسن آرا جو کچھ وقت پہلے قہر و غضب کا نشان بنا ہوا تھا اور جوش انتقام میں ہر کیولیس جیسا بن گیا تھا اب صرف لمبے لمبے ہال دشمن کی پکڑ میں آ جانے سے بے بس سا ہو گیا تھا اور خود کو چھڑانے اور بندوق بچانے کی سعی کر رہا تھا۔

شدید طیش کی ایک لہر میرے روئیں روئیں میں دوڑ گئی۔ میں نے بندوق فوراً اپنے دائیں ہاتھ میں منتقل کی اور طویل قامت شخص کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس شخص کے داہنے گھٹنے میں لگی۔ ایک غیر انسانی سی کراہ اس شخص کے حلق سے بلند ہوئی اور وہ الٹ کر کمر کے بل پیچھے کی طرف جا گرا لیکن اس کے ساتھ ہی حسن آرا بھی اس طرح آگے کی طرف گرا کہ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

میری توجہ حسن آرا کی جانب مبذول ہوئی تو موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے شخص نے پھرتی سے اپنا بازو اندر کھینچ لیا اور پھر دوسرے ہاتھ سے فوراً دروازہ اندر سے لاک کر لیا اضطراب اور تناؤ کی اس کیفیت میں بھی میں اس شخص کی اس بچکانہ حرکت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے والے کیوتر کی مانند اس شخص نے اضطرابی حرکت شاید خود کو محفوظ کرنے کے لیے کی تھی حالانکہ موٹر کے دوسری جانب کے دونوں دروازے چوٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے جھک کر اس شخص کی طرف دیکھا مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا اس کے چہرے پر شدید اذیت کا تاثر تھا اور وہ دونوں آنکھیں سختی سے بند کیے بار بار اپنے بازو کو حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا جس انداز سے اس کا وہ بازو خفیف سی حرکت کر رہا تھا اسے دیکھ کر میرا یہ اندازہ مزید قوی ہو گیا کہ اس کی کلائی کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہوں گی۔

اس شخص کی طرف سے مطمئن ہو کر میں حسن آرا کی جانب لپکا مگر جیسے میں نے اپنا دایاں پاؤں اٹھایا، نیچے سے کسی ہاتھ نے میرے ٹخنے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے فوراً سر جھکا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ یہ وہ ٹھگنا تھا جو بری طرح زخمی ہونے کے باوجود میری ٹانگ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے جکڑے مجھے نیچے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر فوراً ہی میں نے اپنا پاؤں دوبارہ مضبوطی سے نیچے نہ جما لیا ہوتا تو یقیناً منہ کے بل جا گرتا۔ معلوم نہیں یہ میرے لاشعور میں دبا برسوں پرانا کوئی انتقام کا جذبہ تھا یا یہ احساس کہ اس شخص نے حسن آرا پر تشدد کیا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون اچانک کھولنے لگا اور میرے اعصاب پر ریگیتی اور سلگتی چنگاریاں بھڑک کر شعلوں کی مانند جل اٹھی ہوں۔

میں نے دانت پیستے ہوئے اپنا بائیں پیراٹھایا اور پوری طاقت سے ٹھگنے کے جڑے پر مارا اس کے حلق سے بلند ہونے والی آواز ایسی تھی جیسے کوئی زخمی جانور ڈکرایا ہو اس کی کٹی ہوئی گردن پہلے سے خون میں تر تھی مگر اب خون اس کے منہ سے اور اس کے نتھنوں سے بھی بہنے لگا تھا۔ ٹھگنے نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ میرے ٹخنے سے ہٹائے اور بے اختیار اپنے جڑے پر رکھ لیے۔ میں نے موٹر کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ آن کی آن میں خون میں تھڑک رہے گئے۔

لیکن میرے وجود میں بھڑکتی ہوئی آگ ٹھگنے کی یہ حالت دیکھ کر بھی سرد نہ ہوئی۔ میں اپنے دونوں پیروں سے اس کی پسلیوں پر اس کے پیٹ میں اور ٹانگوں پر پے در پے ضربیں لگاتا رہا۔ اس کے منہ سے ناک سے اور اس کی گردن سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور سرک کو دور دور تک داغ دار کر رہے تھے۔

میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکھا تو وہ گھٹنے زمین پر ٹکا کر اٹھا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے رحم کی التجا کرنے لگا۔ میں نے بندوق کے دستے سے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر ضرب لگائی اور پھر اس کے سینے پر اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ الٹ کر بہت دور جا گرا۔ میں ایک بار پھر تیزی سے اس کی طرف لپکا مگر جب میں اس کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپٹ پڑا ہے اور اس کے جسم کو رہ رہ کر جھٹکے سے لگ رہے ہیں۔

ٹھگنے کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اس پر مزید کسی تشدد کا ارادہ ترک کر دیا مگر میرے لبو میں طیش کی مدوجزرا بھی جاری تھا، میں نے پلٹ کر اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا وہ شخص جو موٹر کے اندر تھا ابھی تک اپنی سیٹ پر دبکا ہوا تھا اور سب سے ہوئے انداز سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سکڑی ہوئی آنکھوں سے اور اس کے ماتھے کی شکنوں سے شدید اذیت کا تاثر عیاں تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کی سکڑی ہوئی آنکھیں قدرے پھیل گئیں اور وہ خوف زدہ سا ہو کر کچھ اور نیچے سرک گیا۔

تب میں نے ان کی تیسرے طویل قامت ساتھی کی طرف نگاہ کی وہ ابھی تک اپنے زخمی گھٹنے کو ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ زمین پر ٹکا کر بار بار اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے چند منٹ پہلے کا وہ منظر یاد آ گیا جب حسن آرا کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھا اور اس سے بندوق چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے سر پر جا پہنچا اس کے زخمی گھٹنے سے بہنے والا خون اس کے آس پاس کی مٹی کو رنگین کر چکا تھا مگر اسے

دیکھ کر بھی میرا غصہ کم نہ ہو سکا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گیا اور اب اپنا ایک ہاتھ اٹھائے مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا مگر اس کی منت سماجت کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہو سکا۔ میں نے بائیں ہاتھ کی ٹھوک سے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو پیچھے ہٹایا اور پھر داہنے پیر سے اس کے سینے پر زور دار ضرب لگائی۔

اس کے حلق سے بلند ہونے والی کراہ بہت بلند تھی اور تکلیف کی شدت سے وہ ترپنے لگا تھا مگر اس لمحے مجھ پر گویا جنون سا طاری تھا۔ میں اپنے پیروں سے اس کے سینے پر اور اس کے پہلو میں بھی اندھا دھند ٹھوکریں مارتا چلا گیا۔ اگر حسن آرانے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے میری کمر کو اپنی گرفت میں لے کر پیچھے نہ کھینچ لیا ہوتا تو یہ سلسلہ شاید کچھ دیر اور جاری رہتا۔

میں نے پلٹ کر حسن آرا کی طرف دیکھا جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں روشنی خاصی کم تھی مگر پھر بھی مجھے ایسا لگا جیسے میں حسن آرا کے چہرے سے اور اس کی آنکھوں سے عیاں فکر مندی اور تاسف کے تاثر کو دیکھ سکتا ہوں۔ حسن آرا کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی غیظ و غضب کی وہ آتشیں لہریں جو میرے وجود کے ہر حصے میں طوفان اٹھائے ہوئے تھیں اچانک نہ جانے کہاں معدوم ہو گئیں جیسے کسی نے غصے کے دھکتے ہوئے انگاروں پر گھڑوں پانی انڈیل دیا ہو۔

مجھے واقعی نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ اچانک میں نے سر جھٹک کر آہستہ سے کہا۔ ”تم صحیح کہہ رہی ہو ہمیں جلد سے جلد یہاں سے دور جانا ہوگا“ مگر کیسے؟ بہت دیر سے کوئی گاڑی بھی یہاں سے نہیں گزری۔“

”گاڑیاں تو ایک نہیں دو آ رہی ہیں۔“ حسن آرانے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک تو بہت دور ہے ابھی“ مگر دوسری گاڑی کافی قریب آ چکی ہے۔“

میں نے رخ پھیر کر اس طرف دیکھا جدھر حسن آرانے اشارہ کیا تھا دائیں طرف سے واقعی دو گاڑیاں آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک تو اتنی دور تھی کہ اس کے ہیڈ لائٹس دو ننھے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔

یہ گاڑیاں بھی اسی طرح غیر معمولی تیز رفتاری سے ہماری جانب آرہی تھیں جیسے کچھ دیر پہلے اس جانب سے دشمنوں کی گاڑی آئی تھی۔

”کیا اس میں بھی ٹھگنے کے ساتھی سوار ہیں؟“ میں نے تشویش سے سوچا۔

آن کی آن میں وہ گاڑی ہمارے بالکل قریب پہنچی میں نے اونچی آواز میں حسن آرا سے کہا۔ ”بندوق اپنے کندھے سے لگا لو اور اس کا رخ آنے والی گاڑی کی طرف رکھو مجھے لگتا ہے یہ بھی ہمارے دشمنوں کی گاڑی ہے اپنی انگلی مضبوطی سے ٹریگر پر رکھنا اور جیسے ہی فائر کہوں گولی چلا دینا مگر کوشش کرنا کہ سامنے والے کی ٹانگوں کو یا ہاتھ کو نشانہ بناؤ۔“

میری یہ بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ تیز ہیڈ لائٹس ہم سے چند گز کے فاصلے پر آ کر ساکت ہو گئیں۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ میں نے حسن آرا کی طرف دیکھا وہ میری ہدایت کے مطابق بندوق ان ہیڈ لائٹس کی طرف تانے ہوئے تھا۔ میں نے بھی بندوق کو اپنے کندھے سے لگا لیا مگر اسی وقت تیز ہیڈ لائٹس کے پیچھے سے کسی نے چلا کر کہا۔ ”فائر مت کرنا یہ ہم ہیں الفانسو کے دوست۔“

یہ جانی پہچانی آواز تھی۔ کچھ دن پہلے گھوڑے پر سوار ہو کر ویکٹر کے ٹھکانے پر حملے کے لیے جانے والوں میں سے ایک کی۔ میرے تھے ہوئے اعصاب پر جیسے طمانیت اور آسودگی کی ٹھنڈی پھواری پڑ گئی۔ میں نے بندوق کندھے سے ہٹائی اور حسن آرا کو ساتھ آنے کا اشارہ کر دیا۔ ہم دونوں کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اندر والے گاڑی سے باہر آ چکے تھے۔

”ہمیں خبر ملنے میں دیر ہوئی۔ الفانسو صاحب کو رپورٹ دے ہی رہے تھے کہ ایک آدمی نے آ کر خبر دی کہ آپ دونوں مغرب کی طرف دشمنوں کی تلاش میں گئے ہیں۔ ہم ادھر پہنچنے کے لیے نکلے تھے کہ کچھ لوگوں نے ہمیں روک لیا اور ان میں سے کچھ لوگ ایک بڑی موٹر میں سوار ہو کر ادھر والی سڑک پر بھاگ اٹھے۔“

وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر پایا تھا کہ اچانک اس کی نظر ہمارے پیچھے سڑک کے کنارے کھڑی موٹر پر پڑی اور وہ شدید حیرت سے بولا۔ ”یہی..... یہی تو ہے وہ گاڑی مگر جو لوگ اس میں سوار تھے وہ کہاں گئے اور..... اور یہ آپ دونوں کے پاس بندوقیں کہاں سے آ گئیں؟ یہ سب کیا ہے؟“

”اس گاڑی میں تین افراد سوار تھے۔“ میں نے پلٹ کر موٹر کی طرف دیکھتے ہوئے سکون سے کہا۔ ”ان میں سے ایک جس کا بازو ٹوٹ چکا ہے، موٹر کے اندر کسی چوہے کی طرح دبکا ہوا ہے جبکہ اس کے باقی دو ساتھی شدید زخمی بلکہ نیم مردہ حالت میں باہر پڑے ہیں۔ اور یہ بندوقیں جو تم ہمارے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہو یہ بھی انہی کی ہیں۔“

”اوہ۔“ حیرت اور بے یقینی سے اس کی آنکھوں پھیل گئیں۔ ”لیکن یہ سب ہوا کیسے؟“

”یہ تفصیلات بعد میں پوچھتے رہنا ابھی تو یہ بتاؤ کہ پروگرام کیا ہے؟“ میں نے اسی پرسکون دھیمے انداز میں کہا۔

”پروگرام یہ ہے کہ ہمیں آپ دونوں کو لے کر ابھی فرنگی صاحب کی حویلی روانہ ہونا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ گاڑی کے اگلے دروازے کی طرف بڑھا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ دونوں جلدی سے گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ ہمیں اب ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔“

میں اور حسن آرا یہ سنتے ہی تیزی سے گاڑی کی کچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

وہ لوگ ہمیں لے کر الفانسو کے ہاں پہنچے اور اس نے ہمیں چھوٹے نواب کے ایک دوست کے گھر میں پہنچا دیا۔

اس گھر میں تین دروازے تھے۔ دراصل اس عمارت کے آگے اور پیچھے دوسرے کئی تھیں یعنی سامنے والا دروازہ چوک بازار میں کھلتا تھا تو پچھلا دروازہ نرائن پورہ میں اور تیسرا دروازہ برابر والی عمارت کے ایک کمرے میں۔ یہ دونوں عمارت پاس پاس بنی تھیں۔ باہر سے الگ نظر آتی تھیں مگر اندر سے اس دروازے کے ذریعے ملتی ہوئی تھیں۔ اگر ایک دروازے سے حملہ ہوتا اور ہمیں پسپائی کی ضرورت ہوتی تو ہمارے لیے دوسرے دروازے موجود تھے۔ الفانسو چوک یا نرائن پورہ والے دروازے سے نہیں آتا تھا۔ وہ اور چھوٹے نواب آنے جانے کے لیے برابر والی عمارت کو استعمال کر رہے تھے کیونکہ وہ عمارت چھوٹے نواب کے ایک دوست کی تھی۔ اسی نے برابر والی عمارت اپنے لیے حاصل کر کے ہمیں ٹھہرا دیا تھا۔ ہم اس تین اور تین یعنی چھ کمروں والے مکان میں رہے تھے۔ دن بھر نیچے کے تینوں کمرے استعمال کرتے اور رات میں اوپر کے۔

گویا ہم وہاں قید ہو کر رہ گئے تھے کیونکہ ہمیں دو طرفہ خطرے کا سامنا تھا۔ ایک طرف ویکٹر کے کارندے پاگل کتوں کی طرح ہماری نو سوگتے پھر رہے تھے تو دوسری طرف شہر کو نوال کے آدمی۔ گویا ہم ہر طرف سے گھر گئے تھے اسی لیے ہم نے خود کو محدود کر لیا تھا۔

اس مکان میں رہتے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ شام ڈھل رہی تھی کہ الفانسو آ گیا۔ حسن آرا ابھی تک گزشتہ برسوں کے حادثے کے اثر سے نکل نہیں پایا تھا۔ وہ اب بھی خاموش خاموش سا تھا۔ الفانسو نے زبردستی اُس کے اور میرے کپڑے بدلوا دیئے تھے۔ اب ہم لوگ مردانہ کپڑے پہنے لگے تھے۔ پینٹ اور بوشرٹ میں ہم پوری طرح مرد نظر آنے لگے تھے مگر چلتے ہوئے بولنے کا انداز اب تک وہی تھا۔ حسن آرا کو شیو کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی مگر مجھے ہر روز گلے پر استراچلانا پڑتا تھا لیکن اب الفانسو نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ نتیجتاً چہرے پر اچھے خاصے بال نظر آنے لگے تھے۔ ہم دونوں نے سروں کے بال بھی تراش لیے تھے۔ شام میں جب چھوٹے نواب آئے تو انہوں نے کہا۔ ”بھی شفو! تمہیں تو دیکھ کر لگتا ہی نہیں ہے کہ تم بھجورے ہو۔“

میرادل کرچی کرچی ہو گیا۔ یہ جملہ نہیں، گر ز تھا جس نے مجھے اندر تک ہلا دیا تھا۔ ہم دونوں کے ماں باپ ایک تھے۔ یہ میری بد قسمتی تھی کہ میں بھجوروں کے ہتھے چڑھ گیا اور وہ گھر میں عیش کر رہا ہے۔ اگر میری قسمت نے دھوکا نہ دیا ہوتا تو یہی آج مجھے بھائی جان کہہ رہا ہوتا مگر حالات ایسے تھے کہ میں اُسے ٹوک نہیں سکتا تھا اس لیے خاموش رہ گیا اور مسکرا کر باتوں کا رخ بدل دیا۔ ”ذہیر سارا وقت گزر گیا اور ہم کچھ نہ کر سکے اس لیے میں نے سوچا ہے اب ہمیں ویکٹر کو کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جلد سے جلد اُس کی قید سے مہنا ز کو رہا کر لینا چاہیے۔“

”آپ پروگرام ترتیب دیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“ صفدر نے دھیرے سے کہا۔

”ہمیں اُس کے دانا پور والے مکان پر ڈھاوا بولنا ہوگا۔ وہیں اُس نے مہنا ز کو رکھا ہے۔ اُس عمارت کو اُس نے قلعے کی طرح بنا رکھا ہے کہ ایک چڑیا کا بچہ بھی اندر نہیں جاسکتا اور ہمیں اُس حصار کو توڑ کر مہنا ز کو حاصل کرنا ہے۔“

”الفانسو صاحب آجائیں تو اس پر مزید غور کر لیں گے۔“ حسن آرا نے پہلی بار زبان کھولی۔

ہم باتوں میں مصروف تھے کہ اندرونی دروازہ کھلا اور الفانسو داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس نے اندر آتے ہی کہا۔ ”ارے تم دونوں کتنے بدل گئے ہو۔ اب تو تمہاری زندگی کا پچھلا عکس کہیں نظر ہی نہیں آتا۔“

”یہ ان کی نئی زندگی کی شروعات ہے۔ بے فکر ہو اب گویا یہ پیدا ہوئے ہیں اس لیے پرانی باتیں یاد نہ دلاؤ۔“ چھوٹے نواب صفدر نے کچھ دیر پہلے اپنی کہی ہوئی باتوں کا اثر میرے چہرے پر دیکھ لیا تھا شاید اسی لیے اُس نے یہ جملہ ادا کیا تھا۔

”خیر یہ بتاؤ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“ الفانسو نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے آج کل میں ویکٹر کو گھیر لینا چاہیے اس لیے کہ میرے سننے میں آیا ہے کہ وہ لندن جانے والا ہے۔“ چھوٹے نواب بولے۔

”میں نے بھی یہی سنا ہے۔ لگتا ہے اس نے کوئی اہم پروگرام ترتیب دیا ہے جس کی اجازت لینے جا رہا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے مہنا ز کو وہ آزاد کر جائے گا؟“

”نہیں..... وہ بہت بڑا عیار ہے۔ اُس نے یہاں اتنی تنگ و دو کی ایک بڑا جال بنا، وہ اپنی محنت پر پانی نہیں پھیرے گا۔ یہاں کے تمام کام اسی طرح چلتے رہیں گے تاکہ اگر اُسے ناکامی ملے تو بھی وہ نقصان میں نہ رہے اور یہاں لوٹ کر تمام نقصانات پورے کر لے۔ اسی قسم کا ایک گھڑاک اُس نے چین میں بھی پھیلا یا تھا۔ سینکڑوں افراد کو اُس نے مروا دیا تھا تب کہیں جا کر اُس نے وہاں کی بساط لیٹی تھی۔ یہاں تو ابھی کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ ابھی تو وہ تانے بانے ہی بن رہا ہے پھر کیسے وہ اس علاقے کو یوں ہی چھوڑ دے گا۔ میرا تو خیال ہے کامیابی حاصل کرنے کے بعد بھی وہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔“ الفانسو نے پوری تقریر کر دی تھی۔

”وانا پورا لے مکان میں اُس نے کیا کیا تیاری کر رکھی ہے تمہیں پتا ہے؟“ چھوٹے نواب نے پوچھا۔
 ”کتنی ہی تیاری کیوں نہ کی ہو مگر ہم وہاں دھاوا بولیں گے ہی بولیں گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
 ”میں اور الفانسو دونوں ویکٹر کی نظروں میں ہیں مگر اب جو تمہاری نئی شکل نکلی ہے اس میں تمہیں شاید ہی کوئی پہچان سکے اس لیے میرا خیال ہے کہ تم ایک بار جا کر اُس عمارت کا جائزہ لے آؤ۔“ چھوٹے نواب نے مجھ سے کہا۔
 ”تمہارا کیا خیال ہے وہ مجھے با آسانی اندر جانے دیں گے؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”اگر اندر جا سکو تو بہت اچھا ورنہ باہر سے ہی اندر کے حالات معلوم کر لینا۔“ الفانسو نے کہا۔
 ”آج کا کام کل پر نہ ڈال۔ اس مثل کے مصداق میں آج ہی اُس حویلی کا جائزہ لے آتا ہوں۔ شام کا وقت ہی مناسب ہے ورنہ کل

شام کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”بہت اچھے بھی بہت اچھے.....!“ حسن آرا بولا۔

”اچھا تو میں چلا۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”مگر یاد رہے وہاں کی پہاڑیاں بھول بھلتیاں ہیں۔“

”جی مجھے معلوم ہے۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔“

”اچھا بھائی جاؤ مگر ہتھیار ساتھ لے کر جانا۔ مقابلہ بھی ہو سکتا ہے۔“

میں نے ایک طنزچہ دو دوستی بم اور ایک تیز دھار چاقو رکھ لیا۔

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ حسن آرا بولا۔

”نہیں میں اکیلے جاؤں گا۔ اور مردانہ کپڑوں میں جاؤں گا۔“

”مردانہ کپڑوں میں تو خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ زنانہ کپڑوں میں یہ بچت ہے کہ مقابلہ مغالطہ میں رہتا ہے۔“

”تجربہ میں ہرج کیا ہے۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مجھے تیاری جو کرنا تھی۔

☆.....☆

دانا پور پہنچا تو شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں ٹہلتے ہوئے اُس عمارت کے سامنے سے گزرا اور چہل قدمی کے انداز میں عمارت کی پشت پر پہنچ گیا۔ ادھر دور دور تک پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں اُن کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے دو تین آدمی باتیں کر رہے ہیں۔ اُس ویران علاقے میں کوئی کہیں چھپ کر بیٹھا ہے کیونکہ کھڑا ہوتا تو نظر آ جاتا۔ پہاڑیاں اتنی بڑی تو تھیں نہیں کہ اُن کے پیچھے کھڑا شخص نظر نہ آئے۔ یہ کون لوگ ہیں یہ جاننے کے لیے میں نے آہستہ قدموں سے ادھر بڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ آگے بڑھا تو مجھے صحیح اندازہ ہوا کہ آواز کا مخرج کہاں ہے؟ میں دبے قدموں ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔

وہ ایک غار تھا۔ ایسی پہاڑیوں میں غار نہیں ہوتے بنائے جاتے ہیں۔ یقیناً وہ کسی سرنگ کا دہانہ تھا۔ اُسی سے آواز آرہی تھی۔ یہ کون لوگ ہیں یہ دیکھنے کے لیے میں آگے بڑھا تھا کہ ایک کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اُس نے مجھے آواز دے کر روکنا چاہا مگر میں نے اُن کے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ لیا تھا اسی لیے وہاں سے بھاگا تھا کہ اُن میں سے ایک نے فارز کر دیا۔

فارز ہوتے ہی میں نے خود کو زمین پر گر لیا تھا۔

ان کی تعداد چودہ تھی اور میں اکیلا ان کے درمیان میں گھر گیا تھا۔ چاروں طرف سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں لیکن ابھی تک میں محفوظ تھا۔ دراصل ان کو میری صحیح پوزیشن نہیں معلوم تھی وہ بس ایک دائرے میں گولیاں برسا رہے تھے۔

میں نے جواب میں ایک گولی بھی نہیں چلائی تھی۔ میں گولی چلائے بغیر ہی ان لوگوں کے زرخے سے نکل جانے کی فکر میں تھا۔ گولی چلانے سے دشمن کو میری صحیح پوزیشن معلوم ہو جاتی۔ دوسرے یہ کہ مجھے گولی چلانے میں کوئی فائدہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے پاس صرف چودہ رائفونڈ تھے۔ مقابل بھی چودہ تھے لیکن اس قسم کے مقابلے میں چودہ رائفونڈ کوئی اہمیت نہیں رکھتے جب دشمن کی پوزیشن محفوظ ہو۔

یہ معرکہ ایک پہاڑی پر ہو رہا تھا جس کی ڈھلانیں خود رو گھاس اور جھاڑیوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ میں ان جھاڑیوں سے اب تک دور ہی دور تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ دشمن کی زیادہ تر گولیاں جھاڑیوں پر برس رہی تھیں۔ شاید ان لوگوں کے خیال کے مطابق میں نے خود کو کسی جھاڑی میں چھپا رکھا تھا۔

میں اوندھا لینا آہستہ آہستہ ایک طرف سرک رہا تھا۔ میرے پاس دو بم بھی تھے مگر میں نے انہیں بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ میری دانست میں ان کا استعمال بھی بیکار ہی ثابت ہوتا۔ دشمن منتشر پوزیشن میں تھا۔ ایسی صورت میں ایک بم زیادہ سے زیادہ دو کو ہلاک کرتا۔ میرا خیال تھا کہ بم کا یہ استعمال گھائے کا سودا ہوتا اسی لیے میں اپنے ان دونوں دستی بموں کو ایسے وقت کے لیے بچا رکھنا چاہتا تھا جب ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا۔

میں بس آہستہ آہستہ ایک طرف سرکتا رہا۔ میں نے دشمن کی پوزیشن تاڑ لی تھی اور اب میں جس طرف بڑھ رہا تھا وہاں دو مسلح افراد کے درمیان خلا تھا۔

گولیاں بدستور چل رہی تھیں۔ جب میں ان کے زرخے سے نکل گیا تو اچانک انہیں محسوس آئی۔ انہوں نے فارنگ بند کر دی۔ میں نے جو ان سے کچھ ہی فاصلے پر تھا ایک آواز سنی۔ ”وہ ختم ہو گیا ہوگا اتنی شدید فارنگ سے بچ نہیں سکتا۔“

”لیکن اگر اس کے گولی لگتی تو اس کی چیخ سنائی دیتی۔“

”ضروری نہیں ہے۔“ پہلی آواز آئی۔

”ہم سے اب تک حماقت ہی ہوتی رہتی ہے۔“ ایک اور آواز سنائی دی۔ ”ہمیں بڑھ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔“

”تاکہ وہ ہمیں آسانی سے نشانہ بنا سکتا۔“

”اس کے پاس طمنچہ نہیں ہوگا اگر ہوتا تو اس نے ایک آدھ گولی تو چلائی ہوتی۔“

”بات تو واقعی معقول ہے۔ وہ خالی ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔“

”بس تو پھر اب ہمیں بڑھنا چاہیے۔“

میرے لیے سنہری موقع تھا۔ جتنی دیر وہ یہاں الجھے رہتے اتنی دیر میں ان سے بہت دور نکل کر محفوظ ہو جاتا لیکن ایسا کرنا میری فطرت کے خلاف ہوتا۔ خطرات سے کھیل کر ہی اب مجھے لذت حاصل ہونے لگی تھی۔

ان میں سے کئی نے نارچیں جلائی تھیں اور ان کی روشنی میں مجھے تلاش کیا جا رہا تھا۔ میں ایک ٹیکرے کی اوٹ سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ میں اس وقت کا منتظر جب سب یکجا ہو جاتے۔

ذرا ہی دیر میں ان کو پتا چل گیا کہ ان کا شکار ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

”ہماری پناہ گاہ اس کی نظر میں آچکی ہے اس لیے اب ہم یہاں محفوظ نہیں رہ سکتے۔“ ایک آواز آئی۔

”جتنی جلدی ممکن ہو ہمیں اپنی پناہ گاہ چھوڑ دینا چاہیے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

”تم لوگ خود کو بھی کہیں نہیں لے جاسکتے دوستو!“ اچانک میں نے بلند آواز میں کہا۔

وہ لوگ اچھل پڑے۔

”اوہ! پکڑو اسے۔“ ایک آدمی چیخا۔

دوسرے ہی ثانیے وہ سب میری طرف دوڑ پڑے تھے۔ چونکہ ان کی دانست میں میں غیر مسلح تھا اس لیے انہوں نے اپنی حفاظت کے خیال سے آڑے کر بڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بے تحاشا میری طرف بڑھے تھے۔

میں نے ایک ہلکا سا تہقہ لگایا جس میں بلا کی سفاکی تھی پھر میں نے بڑی پھرتی سے ایک دستی بم ان لوگوں کی طرف اچھال دیا۔ دستی بم کو فضا سے اپنی طرف آتے دیکھ کر ان میں سے کئی ایک کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ کچھ چیخیں ایسی بھی تھیں جو دھماکے میں دب گئیں۔ اسی وقت میں نے دوسرا بم بھی ان لوگوں کی طرف پھینک مارا تھا اور خود پھرتی سے پوری طرح ٹیکرے کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

دوسرا دھماکا سنائی دیا اور میرے ہونٹوں پر نظر آنے والی مسکراہٹ کی زہریلی سی ٹیکرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ شاید دو چار ہی

لوگ بچ سکے ہوں گے کیونکہ وہ جھنڈ کی شکل میں بڑھے تھے۔ جو بچے ہوں گے ان کی حالت بھی اچھی نہیں ہونا چاہیے تھی۔ میرا یہ خیال ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ جب میں نے ٹکڑے کی اوٹ سے نکل کر جانچ پڑتال کی تو پتا چلا کہ بیشتر کے جسم کے چھترے اڑ گئے تھے۔ پانچ زخمی تھے۔ ان میں سے تین کی حالت ایسی تھی کہ وہ ہرگز جانبر نہ ہو سکتے۔ باقی دو ٹھیک ہو سکتے تھے لیکن میں نے ان پانچوں کے جسم میں ایک ایک گولی اتار دی تاکہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔

میں نے چاروں طرف بکھری ہوئی لاشوں پر اپنی سی نظر ڈالی اور پھر میں نے وہاں کی تلاشی لینا شروع کی۔ وہاں صرف ایک کیروسین لیپ جل رہا تھا جس کی روشنی وہاں کے لیے ناکافی تھی۔ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا گیا۔ جتنا آگے بڑھتا اتنی ہی طویل سرنگ نظر آتی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سرنگ اس عمارت تک جاتی ہوگی۔

اب زیادہ آگے جانا وقت کا زیاں تھا اس لیے میں لوٹ کر وہاں پر آ گیا۔ کیا مجھے واپسی کا سفر شروع کر دینا چاہیے؟ میں اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ مجھے ایک آدمی دور سے آتا نظر آیا۔ میں پھرتی سے زمیں پر لیٹ گیا۔ مگر آنکھیں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔ اس شخص کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یہاں کے چپے سے واقف ہے اسی لیے تو وہ سیدھا ادھر ہی بڑتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ اس کے تمام ساتھی موت کی نیند سو چکے ہیں اور اب اس کی باری ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا کہ میں اس سے خوف کھاتا۔ تبھی میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ اس نے ہاتھ میں ایک تھیلا پکڑ رکھا تھا۔ پکڑے کے تھیلے میں کیا ہو سکتا ہے میں اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں دستی بم بھی ہو سکتا ہے اور طمنچے بھی۔

اس خیال کے آتے ہی میں ہوشیار ہو گیا اور مزید اندر کی طرف کھسک آیا۔ اندر کی طرف ایک ایسا کونا تھا جہاں میں دبک جاتا تو پہلی نظر میں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا جب تک کے آنے والا بہت قریب نہ آ جائے۔

اس کونے میں آ جانے کی وجہ سے اب میں آنے والے کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ ابھی وہ اتنی دور تھا کہ اس کے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں دم سادھے اس کا منتظر تھا۔

آنے والا خطرہ دوسرے بے پرواہ مدھم سروں میں سیٹی بجاتا بڑی بے پروائی سے چلا آ رہا تھا۔ انتظار میرے لیے صبر آزماتا لہذا ایک ٹھنڈا سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ میں غار کے دہانے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ باہر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

پھر وہ شخص بالکل قریب آ گیا۔ میں نے بڑی تیزی سے دیوار سے چپک کر خود کو چھپانے کی کوشش کی مگر آنے والے نے داخل ہوتے ہی مجھے دیکھ لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسلحہ نکالتا۔ میں نے اسے ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔

نو وارد نے ایک طمنچہ اپنے سینے کی طرف اٹھا دیکھ کر شاید اسی میں بہتری سمجھی ہوگی کہ ہاتھ اٹھا دے۔

”تنت..... تم کون ہو؟ ابھی جو دھماکے سنائی دیئے تھے کیا وہ تم ہی نے کیے تھے؟“ وہ ہکھلایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔“ میں نے اسے تمسخرانہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تمہارے جسم پر وردی بھی نہیں ہے۔“ نووارد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر نظر دوڑاتا ہوا بولا۔ ”یہاں میرے ساتھی تھے وہ کہاں ہیں؟“

میرے اندازے کے مطابق یہ آدمی بھی ویکٹر کا لڑکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے ختم کرنے سے پہلے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں چند قدم بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم ویکٹر کے آدمی ہو لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارا تعلق اس ٹولی سے نہیں جو یہاں تھی۔ مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ اگر تم نے میرے اس سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تمہیں وہیں پہنچا دوں گا جہاں تمہارے ساتھیوں کو پہنچا چکا ہوں۔ وہ چودہ تھے اور میں اکیلا لیکن وہ سب جہنم واصل ہو چکے ہیں اور میں تمہارے سامنے زندہ کھڑا ہوں۔ یہ بتانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ تم کسی چالاکی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش میں اپنی موت کو دعوت نہ دے بیٹھنا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ بلا چون و چرا میرے سوالوں کا جواب دیتے چلے جاؤ۔“

”لیکن اس سے پہلے تم طمنچہ پھینک کر ہاتھ اٹھا دو۔“ ایک آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر دہانے کی طرف دیکھا۔ دو بندوق کی نالیں جھانک رہی تھیں لیکن بندوق والے پوری طرح سامنے نہیں آئے تھے۔ پتا نہیں یہ دونوں کس طرف سے آئے کہ مجھے نظر ہی نہیں آئے۔ لگتا ہے مجھے دھوکا دینے کے لیے ایک سامنے سے آیا اور باقی پہاڑ کے اوپر سے آئے ہیں۔ جہاں سے بھی آئے ہوں مگر اس وقت تو میں ان کے رحم و کرم پر تھا۔ بازی پلٹ گئی تھی۔ اب انہیں سامنے لانے کی ضرورت تھی۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ غالباً وہ اس وقت سامنے آتے جب میں طمنچہ پھینک کر ہاتھ اٹھا چکا ہوتا۔ نوارد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک استہزائی سی لکیر چمکی تھی۔ وہ اس وقت مجھ سے بہت کم فاصلے پر تھا اور اس نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ بھی نیچے گرا دیے تھے۔

میں نے چشم زدن میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے برقی سرعت سے جست لگا کر نووارد کی آڑ لے لینا چاہیے۔ اس کے بعد میں ان دونوں بندوق برداروں سے اچھی طرح نمٹ سکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے فیصلے پر عمل کرتا پے درپے دو گولیاں چلیں دروازے کی طرف سے کراہیں سنائی دیں اور پھر دونوں گنیں اڑھکتی نظر آئیں۔

میں نے بھی تیزی دکھادی۔ چپتے کی طرح اچھلا تھا اور اپنے قریب کھڑے شخص کی گردن کے گرد اپنے بازو ہانک کر دیئے۔ یہ مشکل ایک منٹ بعد میرے شکار کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور اس کا بے جان جسم میرے قدموں پر پڑا تھا۔ باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ غالباً دونوں ہی گن والے ٹھنڈے ہو چکے تھے مگر یہ جواب طلب بات تھی کہ انہیں ٹھنڈا کرنے والا کون تھا۔

میں نے لپک کر اپنا گرا ہوا طمنچہ اٹھایا اور چونکنا نظروں سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک مکمل خاموشی چھائی رہی اور پھر میں باہر کی طرف بڑھا۔ میں نے سوچا تھا کہ گن والوں کو ختم کرنے والا اس کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ میں نے باہر جھانکا۔ اندھیرے کے باوجود گن والوں کی لاشیں کچھ فاصلے پر پڑی دکھائی دے رہی تھیں مگر ان کے علاوہ قرب و جوار میں کسی کا وجود محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے اپنی جیب سے نارچ نکالی اور روشن کر کے ہاتھ غار سے باہر کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر باہر کوئی دشمن موجود ہے تو فوراً فائر کر دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب میں

نے نارنج کی روشنی لاشوں پر پھینکی اور پھر دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ذہن میں کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ ایک لاش کے قریب غالباً اسی کے خون میں انگلی ڈبو کر زمین پر لکھا گیا تھا۔ بھاگو! میں باہر نکل آیا اور نارنج کی روشنی چاروں طرف پھینکنے لگا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور تیز رفتاری سے نیچے کی جانب چل پڑا۔ ابھی میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک تانگہ کھڑا نظر آیا۔ اس وقت اور بیابان میں تانگہ؟ میں اسی پر غور کرتا ہوا ادھر بڑھنے لگا۔ اس وقت میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ جس طرح دشمن نے مجھے مغالطے میں رکھنے کے لیے دو طرف سے اوپر غار میں آنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بھی ان کی کوئی چال ہو سکتی ہے۔ تانگے کو دیکھ کر میں ادھر ہی جاتا اور وہ اپنی کمین گاہ سے مجھے نشانہ بنا لیتے۔

مگر جب میں نزدیک پہنچا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ حسن بانو تھا۔ اس نے تانگے کی آڑ سے نکل کر کہا۔ ”من بہن ٹو کتنا ہی کوشش کر لے۔ مگر میرے بغیر تیرا ہر اقدام ادھورا رہے گا۔ اصل کامیابی کے لیے میری ضرورت پڑے گی ہی۔ اب یہی دیکھ اس غار میں جہاں ٹو بیٹھی تھی اس کے اوپر بھی ایک غار تھا جہاں کئی لوگ تھے اسی لیے میں نے فائر کرنے کے بعد بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ یہاں بھی زیادہ دیر کھڑے رہنا خطرناک ہے۔ یقیناً اوپر والے غار میں جو لوگ ہیں وہ دھماکے کی وجہ سے پوری طرح ہوشیار ہو گئے ہیں اور اب بھی ہم پر نظر رکائے ہوئے ہوں گے اور ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔“

”مگر یہ تانگے والا کہاں گیا؟“

”تیرے ساتھ رہ کر برادری سے الگ کام بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ تانگہ میں خود چلا کر لائی ہوں۔“

”اگر تانگہ تم چلا کر لائی ہو تو ہم ایک چکر لگا کر آتے ہیں۔ یعنی ہم میدان چھوڑیں گے نہیں واپس آکر ان سے نہیں گے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ارے تو کہے گی تو میں موت کے منہ میں بھی چھلانگ لگا دوں گی ٹو فکر ہی نہ کر۔“ حسن آرانے ماہر کو چوان کی طرح گھوڑے کو چابک لگاتے ہوئے کہا۔

گھوڑا آگے بڑھنے لگا۔ کافی دور جانے کے بعد حسن آرانے جیسے ہی تانگہ موڑا سامنے سے ایک موٹر گاڑی نے ہمارا راستہ روک لیا۔ میں نے اس گاڑی کا جائزہ لیا۔ اس میں صرف دو آدمی تھے۔

”اے بھجورے کی دم نیچے اتر۔“ ان میں سے ایک نے نیچے اتر کر حکم دیا۔

”بہن یہ تو خطرناک لگتا ہے۔“ حسن آرانے نسبتاً بلند آواز میں کہا جیسے ڈر گیا ہو۔

”گتے نہیں ہیں۔ ہم لوگ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ سیدھے شرافت سے نیچے اتر آؤ ورنہ آنتیں باہر نکال دوں گا۔“ اس نے اکڑ کر کہا۔

دوسرے والے کے ہاتھ میں انگریزی طینچہ تھا۔ چاقو سے نمٹنا آسان تھا اور طینچے سے حالات کے مطابق ہی ٹکرایا جاسکتا تھا۔ میں نے آنکھوں سے حسن آرا کو اشارہ کیا۔

”نیچے جا کر اڑی دینا ہے۔“ میں نے بھجروں کے مخصوص زبان میں کہا اور نیچے اتر آیا۔

”چل گاڑی میں بیٹھ۔ ایسی موٹر میں قسمت والے بیٹھتے ہیں۔“ اس نے ڈانٹنے کے انداز میں حکم دیا۔

پہلے تانگے سے میں اتر اٹھا پھر حسن آرا۔ ہم دونوں شرافت کے مرقع بن کر موٹر میں بیٹھ گئے۔

موٹر دوڑنے لگی پھر جب رکی تو سامنے ایک بڑی سی حویلی تھی۔ وہ لوگ ہمیں لے کر اندر پہنچے۔ اندر پہنچ کر اس نے کہا۔ ”تم لوگ انتظار کرو ابھی صاحب آتے ہیں تو تمہارا فیصلہ کیا جائے گا۔“

وہ باتوں کے درمیان میرے بہت نزدیک آ گیا تھا۔ مجھے کسی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی۔ میں نے اسے زور کا دھکا دیا اور اس کے ہاتھ سے طمچہ چھین کر باہر کی سمت دوڑ لگا دی۔ تبھی زوردار فائر کی آواز گونجی اور میں دبک گیا۔

وہ دھماکا دروازے کی آڑ میں کھڑے شخص کے طمچے کا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی یا اس شخص کا نشانہ کچا تھا کہ گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بلاؤز کی آستین پر جلنے کا نشان ثبت ہو گیا تھا۔ بازو سے رسنے والا خون میری پسلیوں پر پھیلتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس پر توجہ دینے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے طمچہ کی نال سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ سنسناتی ہوئی گولی نکلی اور سیدھے جا کر اس کے طمچہ چھٹک کر دور جا گرا۔ وہ اضطرابی طور پر اسے اٹھانے لپکا تھا کہ میں نے دوسرا فائر کیا۔ یہ فائر بھی نشانے پر لگا اور طمچہ مزید آگے پھسل گیا۔ ناچ راگ کی محفل سے نکل کر اس دنیا میں آتے ہی میرے لئے طمچہ کھلو نا بن گیا تھا۔ ہر روز اس سے کھیلتا۔ گولی و بارود کے اس کھیل کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ میرا نشانہ حد سے زیادہ پختہ ہو گیا تھا جس کا ایک ثبوت سامنے تھا۔ میں نے طمچے کو انگلیوں میں نچاتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں چاہتا تو یہ گولیاں تمہارے سینے میں بھی اتر سکتی تھیں مگر میں خون خرابہ پسند نہیں کرتا۔“

”مگر میں پسند کرتا ہوں۔“ کہنے کے ساتھ اوپر والے نے گولی چلا دی تھی۔ اگر میں اتفاقی طور پر ایک سیکنڈ پہلے اپنی جگہ سے نہ ہٹ جاتا تو وہ گولی میرے سر میں دھنس جاتی۔ اب میں دوطرفہ حملے کی زد میں پر تھا۔ گوکہ آگے والے کے پاس اب طمچہ نہیں تھا مگر کسی اور چیز سے تو وار کر سکتا تھا۔ میں پوری طرح ہوشیار تھا کہ اوپر سے پھر فائر ہوا اور میں بندر کی طرح اچھل کر داہنی جانب ہٹ گیا اس دوران میں آگے والے کو موقع مل گیا اور وہ دوڑتا ہوا بڑی ٹیبل کے پیچھے چھپ گیا۔ اوپر والا اب بھی جھروکے میں جما ہوا تھا۔ اسی کی جانب سے زیادہ خطرہ تھا، وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب تک فائر بھی نہیں ہوا تھا پھر بھی میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ فائر نہ ہونے کی ایک وجہ طمچہ خالی ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دل ہی دل میں اس کے فائر ز گنے اس نے کل پانچ فائر کیے تھے۔ آخری گولی اب بھی اس کے طمچے میں موجود ہوگی۔ میں اس آخری گولی کے انتظار میں بڑے سے آرائشی کھبے کی آڑ میں کھڑا تھا ”دھم“ کی آواز آئی۔ میں سرعت سے پلٹا وہ جھروکے سے سیڑھیوں کی طرف آ گیا تھا اور سیڑھیوں سے اترنے کی بجائے وقت بچانے کے لیے کود گیا تھا پھر وہ دوڑتا ہوا میرے سر پر پہنچ گیا۔ سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ میں نے نال کا رخ اس کی طرف کر کے گھوڑا دبا دیا مگر طمچے سے گولی نکلنے کی بجائے کلک کی آواز نکل کر رہ گئی۔ گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ یہ ہلکی سی آواز اس شخص نے بھی سن لی تھی۔ بصارت و سماعت ذہن و دل پر اثر ڈالتی ہے۔ دل میں خوف اور دماغ میں فکر پیدا کرتی ہے۔ کلک کی آواز نے اس شخص کے چہرے سے خوف کے آثار مٹا دیئے تھے۔

جب خوف مٹ جائے تو بھیگی بلی بھی شیر بن جاتی ہے۔ وہ دونوں بھی شیر بن گئے تھے اور بے خوفی میں میری جانب بڑھ رہے تھے۔ جھروکے والے شخص نے طنز جیب میں رکھ لیا تھا شاید میرا اندازہ غلط تھا اور اس کے طنز کی گولیاں بھی ختم ہو چکی تھیں یا پھر آخری بار اسے آزمانے کے لیے اس نے محفوظ رکھ لیا تھا۔ وہ دونوں دو اطراف سے میری جانب بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ٹھٹھنے قد کا تھا اور دوسرا طویل القامت۔ ان کے چہروں سے ہویہ تھا کہ وہ مجھے پس کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔

”یہاں آنے والے اپنے پیروں پر چل کر آتے ہیں مگر بھجوانے کا کام ہمیں انجام دینا پڑتا ہے۔“ یہ کہہ کر ٹھٹھنے نے مجھ پر چھلانگ لگادی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اچھل کود کا ماہر ہے۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ اڑتا ہوا اپنے ساتھی سے ٹکرایا اور اسے ساتھ لیتا ہوا نیچے گر پڑا۔

”ارے واہ! کیا اڑان بھری ہے۔ ذرا پھر ایک بار کوشش تو کرنا۔“ میں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

وہ جھلا کر کھڑا ہوا اور قلابازیاں کھاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ یہ انداز خاصا خطرناک تھا۔ وہ جسم کو نیچے تلے انداز میں گھماتا ہوا تیر کی طرح آ رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے ہٹ جانے میں ہی عافیت سمجھی اور وہ اپنے زور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کا یہ داؤ بھی خالی گیا تھا۔ فن حرب کے ماہروں کے مثل۔ الفانسو کا کہنا ہے کہ لڑائی کی وقت دماغ کو پرسکون رکھو ورنہ سکون ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں نے اسی بات پر عمل کرتے ہوئے اسے اشتعال دلانے کی کوشش کی۔ ”بیٹے! کسی اچھے استاد سے داؤ بیچ سیکھ لیتے۔ ابھی بھی موقع ہے میرے شاگرد بن جاؤ۔“

تبھی میری کمر پر لات پڑی اور ٹھٹھنے کی آواز آئی۔ ”اور یہ لات کیسی ہے بیچرے محترم!“

میں کسی زخمی سانپ کی طرح پلٹا اور داہنے ہاتھ کا مکا اس کے سینے اور گھٹنے سے داہنی ران پر وار کیا۔ وہ کراہتا ہوا الٹ گیا۔ میں نے اس پر سے توجہ ہٹا کر لمبے قد والے کی طرف رخ کر لیا۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو میں چاروں خانے چت گر جاتا۔ وہ ہوا میں اپنے جسم کو گردش دیتے ہوئے میری طرف آیا تھا۔ میں برقی سرعت سے داہنی جانب ہٹ گیا تھا۔ وہ اپنے ہی ساتھی پر جا پڑا تھا۔ اب انہیں موقع دینا خطرے کو بلانا تھا۔ میں نے ان پر چھلانگ لگادی۔ وہ دونوں بھی کم پھر تیلے نہیں تھے۔ دونوں ہی بیک وقت مخالف سمت میں سرک گئے تھے۔ میں فرش پر اوندھے منہ گرا لیکن ابھی میں اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ٹھٹھنے قد والے نے میری کمر پر لات جمادی۔ کمبخت کی لات اتنی زبردست تھی کہ میں کراہ اٹھا۔ اس نے پھر وار کرنا چاہا تھا کہ میں نے خود کو بچانے کے لیے داہنی جانب سرکنے کی کوشش کی مگر میری کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ لمبے قد والے نے فوراً آگے بڑھ کر ٹھوک ماری تھی۔ میں پھر ٹھٹھنے قد والے کے قدموں میں آ گیا تھا۔ اس نے لات مارنے کے لیے پیر اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کے پیر کو پکڑ لیا اور زوردار جھٹکا دیا تو وہ اوندھے منہ آگرا۔ کھڑے ہوتے ہی میں نے پیر سیدھا کر کے جسم کو گردش دی۔ میری کھڑی لات لمبے شخص کی کمر پر پڑی اور وہ بھی الٹ گیا۔

اب بازی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے باری باری دونوں کی دھنائی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں لہو لہان ہو چکے تھے۔ میں آخری داؤ آزمانے والا تھا۔ میرا آخری داؤ کھڑی ہتھیلی کا گدی پر وار تھا۔ اس کے بعد دونوں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ میں نے ٹھٹھنے کو کار سے پکڑ کر اٹھایا ہی تھا کہ ایک دھماکا ہوا اور سنسناتی ہوئی گولی میرے سر پر سے گزر گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک لڑکی طنز تانے کھڑی تھی۔ ”بہت ہو

چکا۔ اب ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔

جیتی ہوئی بازی پلٹ گئی تھی۔ میں نے پوری طاقت سے ٹھکنے کو فرش پر پٹکا۔ اس کا چہرہ زمین سے ٹکرایا۔ وہ چیخ اٹھا۔ اس کی ناک کا بھرتا بن گیا تھا۔ چہرہ خون سے بھر گیا تھا۔ منہ سے بھی خون بہنے لگا تھا۔

”خبردار اب اگر حرکت کی تو گولی سینے کے پار ہوگی۔“ لڑکی نے چیخ کر کہا۔

میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کہ میں ہاتھ اٹھا دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے ہاتھ کھڑا کرتے دیکھ کر طویل القامت آگے بڑھا اور پوری قوت سے میرے سینے پر سر سے ٹکر ماری۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر پیروں نے ساتھ نہ دیا اور میں الٹ گیا۔ میرا سر فرش سے ٹکرایا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پل بھر کے لیے اندھیرے کی چادر تن گئی تھی۔ میں دونوں ہاتھ کو فیک کر پھر کھڑا ہونے لگا۔ تبھی اس کمینے نے لات چلا دی۔ میں دوبارہ گر پڑا۔ میرے نچلے ہونٹ میں جلن ہو رہی تھی۔ شاید وہ پھٹ گیا تھا۔ اتنا تشدد کا میں اس وقت سوچ بھی نہیں سکتا تھا جب میں محض ایک ناپچنے والا تھا مگر اب میں الفانسو کی شاگری میں آ کر فولاد بن چکا تھا۔ اس لیے ذرا بھی خوف خود پر طاری ہونے نہیں دیا اور نہ ورد کو محسوس کیا۔

میں نے اٹنے ہاتھ کی پشت سے ہونٹ کو پونچھا اور جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ وہ پھر دوڑتا ہوا میری جانب لپکا۔ ایک بار میں نے موقع گنوا دیا تھا۔ اس بار میں اس سے لپٹ گیا۔ اس کی آڑ لے کر میں نے کہا۔ ”لڑکی پستول پھینک دو ورنہ اس کی گردن کی ہڈی توڑ دوں گا۔“

”یہ میرا باپ یا بھائی نہیں ہے۔ میں اس پر بھی گولی چلا سکتی ہوں۔“ کہہ کر اس نے واقعی گولی چلا دی۔

اس شخص کی موت کا وقت نہیں تھا۔ نشانہ پھر چوک گیا۔ اتنی دیر میں دھکیلتے ہوئے میں اسے لڑکی کے قریب لے آیا تھا۔ اب ہمارے درمیان صرف چند فٹ کی دوری باقی تھی۔ میری نظریں لڑکی کی انگلیوں پر ٹکی ہوئی تھیں وہ دباؤ بڑھاتی کہ میں نے ایک فرسودہ ساحر بہ آزمایا۔ اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، نہیں، اس پر نہیں۔“

وہ میری اس چال میں آگئی اور پھرتی سے پیچھے مڑی۔ وہاں کوئی ہوتا تو اسے نظر آتا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس شخص کو دھکا دے کر لڑکی پر جا پڑا۔ ایک ہی جھٹکے میں اس کا طنچہ میں نے چھین لیا پھر اسی طنچے کی نال اس کی گردن سے لگا کر بولا۔ ”ہاں اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔“

اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تب میں نے کہا۔ ”اب یہ بھی بتاؤ کہ مہناز کو کہاں رکھا ہے؟ جلدی بتاؤ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

”بتاتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے یہ طنچہ تو ہٹالو۔“

میں نے طنچہ ہٹانے کے بجائے دباؤ میں اضافہ کر دیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اگر ایک منٹ میں جواب نہیں ملتا تو گولی نرخرے کے پار ہوگی۔“

”پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“

”مہناز کہاں ہے؟“

”اس کا علم صرف ویکٹر کو ہے۔ وہ بہت سارے معاملے میں ہم سے مشورہ تک نہیں کرتا۔ مہناز کے بارے میں تو سختی سے منع کیا ہے کہ اس معاملے میں کوئی نہ بولے۔ اس کام کی بھنگ اس نے سرکار کو بھی لگنے نہیں دی ہے۔“

”جب تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو پھر تم لوگوں کا جینا بیکار ہے۔“ کہہ کر میں نے اس کی گدی پر طمچے کا دستہ مارا۔ وہ تورا کر گر پڑی۔ اب میں نے تشدد کرنے والے پر نظر ڈالی۔ اس پر گولی چلی تھی۔ وہ موت کے منہ سے نکلا تھا۔ اس پر ابھی تک سکتہ طاری تھا۔ یا شاید حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس پر اسی کی ساتھی نے گولی چلائی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری مجرم جس نے تمہیں مارنے کی کوشش کی تھی تمہارے قدموں میں پڑی ہے اپنا بدلہ خود لو۔“

اتنا کہہ کر میں مڑ گیا۔ وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور ہال سے باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا، باہر آیا اور دروازے کو باہر سے بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ پھر میں رکا نہیں آگے بڑھتا چلا گیا۔

باہر نکلتے ہی میری نظر سفید ”گھوڑوں والی بگھی“ پر پڑی۔ کوچوان کی سیٹ پر نور محمد بیٹھا تھا۔ شاید وہ میرا ہی منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بگھی آگے بڑھا دی۔ نزدیک پہنچتے ہی میں بگھی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ بگھی چل پڑی۔ نہ اس نے منزل کے بارے میں سوال کیا اور نہ میں نے اسے کچھ بتایا۔ بگھی دوڑتی رہی کچھ دیر بعد رکی تو میں نے دیکھا کہ وہ الفانسو کا نیا بنگلا ہے۔ میں نے پھر بھی کچھ نہ پوچھا اور نیچے اتر گیا۔ آگے آگے نور محمد اور پیچھے پیچھے میں۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ بڑے کمرے میں الفانسو بیٹھا تھا۔

”مبارک ہو کہ تم کامیاب لوٹے۔“ الفانسو نے کہا۔

”ہوں!“ میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

”تم زخمی ہو؟“ اس نے میرے بازو پر خون کا دھبا اور چلنے کا نشان دیکھ کر پوچھا۔

”گولی لگی نہیں صرف چھو کر نکلی ہے۔“ میں نے بازو پر ہاتھ پھیر کر آستین کو درست کیا۔

”معرکہ سر کر کے آئے ہو۔ جاؤ آرام کرو۔“ اس نے کہا۔

”آرام کی ابھی ضرورت محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ اگر چاہیں تو ویکٹر کے نئے گھر کے بارے میں کچھ اور بتادیں۔“

”یعنی تم نے سوچ لیا ہے کہ اس کے گھر میں گھس کر پھر ایک بار اس پر حملہ کرو گے۔“

”ہاں!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کے حفاظتی انتظام کے بارے میں کیا کیا جانتے ہو؟“

میرے علم میں جتنی بھی باتیں تھیں میں نے بتادیں۔ سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔

”تمہاری معلومات ادھوری ہیں۔ اس نے اپنے نئے بنگلے کو قلعہ بنا دیا ہے۔ مسلح افراد کے علاوہ بھی خفیہ حفاظتی انتظام ہے۔ اس عمارت کا تیس فیصد حصہ ایسا ہے جہاں فرش اور دیواروں میں باریک باریک تاریکچے ہوئے ہیں جنہیں بغور دیکھنے کے بعد ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ویکٹر کے

کمرے میں ایک ایسا خفیہ بٹن ہے جسے دباتے ہی ان تاروں میں کرنٹ دوڑ جاتا ہے۔ یہ بجلی روشنی پھیلانے کے لیے ایجاد ہوئی ہے مگر اس سے لوگ تخریب کاری بھی کر لیتے ہیں۔ ویکٹر نے بجلی سے ایسا ہی کام لیا ہے اور یہ بجلی شہر کے کسی پاور ہاؤس سے نہیں لیا جاتا ہے بلکہ خفیہ تہ خانے میں نصب بجلی پیدا کرنے والی مشین سے سپلائی کیا جاتا ہے۔ اگر کسی طرح ان تاروں کے جال سے کوئی بچ نکلنے کی کوشش کرے تو بھی نظر میں آجائے گا۔ کیوں کہ ہر کمرے میں خفیہ جھروکا ہے جس کے ذریعے عمارت کے ایک ایک گوشے پر اس کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں، نظر رکھے ہوئے ہیں اور ان کا رابطہ تمام رکھوالوں سے ہے۔“

”ایسا کڑا حفاظتی نظام تو ملکہ وکٹوریہ کا بھی نہیں ہے۔ کہیں تم میرا حوصلہ پست کرنے کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو؟“

”ویکٹر وزیراعظم یا سلطان ہوتا تو ایسا انتظام کبھی نہ کرتا۔ وہ خصوصی طور پر غنڈا گردی کرنے کے لیے آیا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ لندن کا نامی گرامی غنڈا تھا۔ اس نے وہاں کے ایک بڑے گینگ سے ٹکری اور کئی غنڈوں کو جان سے مار دیا۔ جب اس گینگ کے لوگ اس کے دشمن بن گئے۔ اس کی جان لینے کے لیے حملے پر حملہ کرنے لگے تو وہ اپنے جرائم سے تائب ہو کر یہاں بھاگ آیا۔ ہند میں لندن کے امراء آنا پسند نہیں کرتے اسی لیے ایسے انگریزوں کو جو یہاں آ جاتے ہیں انہیں خصوصی مراعت دی جاتی ہے وہ اسے مل رہی ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنی فطرت بدل کر آرام کی زندگی گزارتا مگر وہ ایک ساتھ حکومت برطانیہ اور مقامی حکومت کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ غنڈا تھا اور اس کے دشمن بھی اسی حساب سے تھے۔ وہ دشمن اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی آچکے ہیں اور اس پر فتح پانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ کہیں بھی کوئی اسے موت کی نیند سلا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ خود موت نہ بنے تو بے کار ہے۔ اس میرے خیال میں ایسا انتظام غلط نہیں ہے۔“ الفانسو نے ویکٹر کی پوری تاریخ بیان کر دی۔

”ہوں!“ میں نے پرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔

”اب تم ہی بتاؤ کہ موت کے منہ میں کون ہاتھ ڈالے گا؟ کون اس کے اس قلعہ میں جائے گا۔ اس لیے کہ اب وہ باہر بہت کم نکل رہا ہے اور اسے باہر لانا ضروری ہے۔“ الفانسو نے باری باری سب پر نظر ڈالی۔

”اچھا یہ بتائیں کہ وہ باہر کن وجوہات کی بناء پر نکلتا ہے؟“

”جہاں تک میرے علم میں ہے کہ اب وہ باہر بھی آتا ہے جب کوئی اہم معاملہ سامنے ہو اور اس کے بندے کنٹرول کرنے میں کامیاب نہ ہو رہے ہوں۔“

میں خاموش رہا۔

”اس وقت اس پر ہاتھ ڈالنا واقعی بہت دشوار ہے۔“ حسن آرا بولا۔

”کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے۔ ابھی کافی وقت ہے۔ اچھی طرح غور کرو۔ شاید کوئی راستہ نظر آجائے۔“ پھر اس نے جو کچھ کہا وہ حیرت میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی تھا۔

اب تک ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ ویکٹر اکیلا ہے مگر الفانسو کی اطلاع کے مطابق اس کے پیچھے دو بڑے زمیندار بھی ہیں جو اسے رقم فراہم

کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بھانوپرتاپ دو بے تھا اور دوسرا اندر جیت کمار جیسووال تھا جو آدھے شہر کا اکیلے مالک تھا۔ پچاس سے زائد اس نے دکانیں کھول رکھی تھیں اس کے علاوہ سودی کاروبار بھی تھا۔ اس پاس کے گاؤں کے ہزاروں لوگ اس کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ دونوں اس کی مدد اس لیے کر رہے تھے کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو ایک کا دس لوٹاتا۔ حوض میں پانی آنے کا راستہ کھلا ہو تو وہ کبھی خالی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ہم نے ویکٹر سے انتقام لینے کے لیے آسان حل بھی سوچا کہ اس کی سپلائی لائن منقطع کر دی جائے۔ یہ جملہ الفانسو کا تھا۔ ہم یہاں اسی پر غور کرنے کے لیے بیٹھے تھے۔ میرے ساتھ نور بیگم اور حسن آرا بھی تھا۔

”اندر جیت کمار جیسووال کی تمام دکانوں میں آگ لگا دی جائے۔“ حسن آرا نے مشورہ دیا۔

”ہم جنگل میں نہیں شہر میں رہتے ہیں۔ اس کی تمام دکانیں شہر میں بازاروں کے بیچ میں ہے اور ایک دو نہیں پچاس سے زائد ہی ہوں گی۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔“ الفانسو بولا۔

”پھر اسے کیسے اس کی اوقات بتائیں؟“

”بہت آسان ہے۔ بس میں نے سوچ لیا ہے۔“ الفانسو بولا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں جیسے اس نے فتح کا راستہ دیکھ لیا ہو۔ انتخاب بھی کر لیا ہو۔ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم موت سے کتنا ڈرتی ہو؟“

”موت سب کا مقدر ہے۔“ میں نے بے خوفی سے جواب دیا۔

”اگر میں کہوں تمہیں نواب صاحب کے خاندان کی خاطر موت کو گلے لگانا ہے تو کیا لاو گی؟“

”بالکل! کیونکہ ہر انسان کو مرنا ہے۔ آج مرے یا کل۔ اس لیے میں چاہوں گی کہ مجھے جو موت ملے وہ اپنی مثال آپ ہو۔ لوگ اچھے الفاظ میں یاد کریں۔“

”ہاں وہ موت ایسی ہی ہو گی بولو تیار ہو؟“

”بالکل!“

’الفانسو نے ابھی تک اپنا پروگرام نہیں بتایا تھا۔ میں بھی گویا آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کی انگلی تھامے بڑھ رہا تھا۔ اب سب اسی پر منحصر تھا۔ وہ کرنا کیا چاہتا تھا اس کا مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا صرف اتنا احساس تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھانے والا ہے۔

پھر وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ میں وہیں صوفے پر بیٹھا رہ گیا۔ میں سوچتا رہا۔ وقت گزرتا تھا۔ گھڑی کی بڑی سوئی نے چار بار بار ہندسے کو کراس کیا لیکن میں کسی بھی نتیجے پر پہنچ نہ سکا۔

”میں تو کچھ بھی نہیں سوچ پایا۔ کسی بھی نتیجے پر پہنچ نہ سکا۔“ الفانسو نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”جی!“ میں نے چونک کر کہا۔

”تم نے ویکٹر کے بارے میں کچھ سوچا؟“

میں نے سر اٹھا کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی پھر بولا۔ ”اس کی قلعہ نما حویلی میں داخلے کی کوشش موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔“
 ”بالکل جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا ہوگا۔ اگر میرے قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے تو موت کے منہ میں جانے کا خطرہ اٹھانا ہی پڑے گا۔“ الفانسو کی آنکھیں سکر گئیں۔

”اتنے کڑے پہرے مضبوط حفاظتی نظام کے باوجود اندر داخل ہونے کا رسک لو گے؟“ حسن آرا بولا۔
 الفانسو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں!“
 ”کس بل بوتے پر؟“ میں نے پوچھا۔

”عقل کے بل بوتے پر اپنے منصوبے کے بھروسے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔
 ”منصوبہ کیا ہے۔ ذرا میں بھی سنوں۔“
 ”وقت آنے پر بتا دوں گا۔“ اس نے کہا۔

”اگر مناسب سمجھو تو ابھی بتا دو تا کہ میں بھی کوئی مشورہ دے سکوں۔“
 ”ویکٹر ایک ایسا پیڑ ہے جس کی جڑیں بہت گہرائی تک پھیلی ہیں۔ اس مضبوط پیڑ کو ختم کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے ظاہری حصے کو قطع کریں۔ پیڑ کا ظاہری حصہ اس کی ڈالیاں ہیں جو اسے سہارا دیتی ہیں۔ بیلنس برابر رکھتی ہیں۔ اس کے بیلنس کو طاقت کے توازن کو برقرار رکھا ہے ویاں شیکھرا اور دو بے نے۔ ان کے مرتے ہی اس کا توازن بھی بگڑ جائے گا۔ وہ اس صدمے سے ابھر بھی نہ پائے گا کہ ہم اس کے ان اڈوں پر حملہ کر دیں گے جو ہماری نظروں میں ہیں۔ تب ویکٹر پاگل ہوا ٹھکے گا باہر نکل آئے گا اور ہمیں آخری وار کرنے کا موقع مل جائے گا۔“
 ”وہ آخری وار کیا ہوگا؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”یہ ابھی نہیں موقع آنے پر ہی بتاؤں گا۔“

”میں یہ جنگ صرف اس لیے لڑ رہا ہوں کہ نواب صاحب کی بیٹی کو آزاد کرالوں۔“
 ”شاباش میرے شیر! تم واقعی میرے خوابوں کی تعبیر ہو مگر تم اپنے وطن اس سر زمین کے لیے کیوں نہیں لڑتے۔“ الفانسو نے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا۔
 ”آزادی کی جنگ لڑنے والے لڑ رہے ہیں۔ جب وطن آواز دے گا ہم بھی لبیک کہیں گے۔ فی الحال تو ہم صرف مہناز کو ڈھونڈنے میں لگے ہیں۔“

”وہ تو ہمارا بھی کام ہے مگر..... یہ بتاؤ ابھی میں نے جو ویکٹر کو باہر لانے کے بارے میں کہا اس بارے میں کچھ سوچا؟“
 ”جی... منصوبہ بنا رہا ہوں۔ ہر رخ سے غور کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے کچھ وقت تو دیں۔“
 ”اچھی بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی جو منصوبہ بناؤ گے یقیناً اعلیٰ ہوگا، میرے تمام بندوں کو پینڈل کرو۔ میں انہیں تمہاری تابعداری کا حکم دے رہا ہوں۔“

”نہیں! آپ اپنے بندوں کو صرف اتنا حکم دے دیں کہ وہ ان تمام اڈوں پر ٹوٹ پڑیں جو ان کی نظروں میں ہیں پھر شیکھر اور دو بے کو گھیر لیں۔ صرف ویکٹر میرا شکار ہے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ الفانسو بولا۔

☆.....☆

میں حسن آرا کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ مختار آ گیا۔ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ”شکو جی اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں واپس جا رہا ہوں؟“

”کیوں بھی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ جو حسن آرا ہے نایہ مجھے کسی کو کاٹنے بھی نہیں دیتی۔ میرے دانت میں درد ہونے لگا ہے۔“ اس کی بات پر میں اپنی ہنسی روک نہ سکا۔

”تم کاٹنا چاہتے ہو نا تو بہت جلد تمہیں موقع ملے گا۔ بس تھوڑا انتظار کر لو۔“ میں نے ہنستے ہوئے تسلی دی۔

اسی وقت الفانسو آ گیا۔ اسے دیکھ کر مختار بولا۔ ”ولایتی صاحب آپ مجھے کب لے جائیں گے؟“

”کہاں؟“ الفانسو بات کی تہ تک پہنچ نہیں پایا اسی لیے حیرت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”بات اتنی ہے کہ حسن آرا اسے کاٹنے کے لیے شکار نہیں دے رہی ہے۔ اس کے دانت میں درد ہونے لگا ہے۔“ میں نے دہائی آنکھ بند کر کے کہا۔

الفانسو نے قہقہہ لگایا پھر بولا۔ ”میں اس کے لیے ایک موقع لے کر آیا ہوں۔“

”اچھا! مختار خوش ہو کر بولا۔

”شکو! تمہارے کہنے پر ہم نے ویکٹر کے دوستوں کے تجارتی مراکز پر حملہ شروع کر دیا ہے۔ دو بے تمہارے حصے میں آیا ہے۔“ الفانسو مجھ سے مخاطب تھا۔

”بے چارہ دو بے! اپنی بیٹی کو ہی دشمن بنا بیٹھا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”مجھے پتا ہے۔۔۔۔۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ اپنی بیٹی کو کسی ارب پتی سے بیاہ دے مگر بیٹی نے پسند کیا تو کسے؟ اپنے ہی ایک نوکر کو۔ وہ اس کے پیار میں بہت آگے جا چکی تھی اسی لیے دو بے نے اسے مروا دیا۔“

”اب بیٹی بغاوت پر آمادہ ہے۔“

”اس کا تمہیں فائدہ اٹھالینا چاہیے۔ اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تم نکل پڑو تو بہتر ہے۔“

”ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

☆.....☆

دن کے دو بج رہے تھے۔ وہ کوئی سنان سڑک بھی نہ تھی۔ تانگے گھیاں، موٹریں آ جا رہی تھیں۔ کسی بھی لمحے دیکھ لئے جانے کا خطرہ تھا مگر میں خطروں سے کھیلنے لگا تھا۔ دو بے کی حویلی کی عقی دیوار کے پار کود گیا۔ احاطے کے اندر پہنچ کر کچھ دیر تک کروٹا کی باڑ کے عقب میں دم سادھے لیٹا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں مسلح سپاہیوں کے گھر ہیں۔ میں ان کی مستعدی کا جائزہ لے رہا تھا۔ پہلے حویلی کی بائیں سمت سے ایک سپاہی دار نمودار ہوا پھر دائیں جانب سے دونوں ایک دوسرے کو کراس کرتے ہوئے گزر گئے۔ میں وہیں دبکا ہوا ان کے آنے کا وقت نوٹ کرنے لگا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ منٹ کے بعد سامنے والے حصے سے عقی حصے میں آتے تھے۔ پھر میں نے حویلی کے عقبی حصے کا جائزہ لیا۔ ایک دروازہ بالکل سامنے تھا داخلے کے لیے جو بند تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ میں تقریباً پندرہ منٹ وہیں چھپا رہا۔ ان پندرہ منٹوں میں دونوں سپاہیوں نے دس بارہ چکر لگائے تھے۔ ہر بار میری نگاہیں ان کی جیبوں پر مرکوز ہو جاتیں۔ جیبوں کے ابھار اشارہ دے رہے تھے کہ ان کے پاس طمچے ہیں۔ ابھی تک انہوں نے کروٹا کی باڑ کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ شاید وہ بہت زیادہ مطمئن تھے ورنہ اگر تھوڑا سا آگے آ کر دیکھ لیتے تو میں انہیں نظر آ جاتا کیوں کہ کروٹا کی باڑ زیادہ گھنی نہیں تھی۔ میں کروٹ کے بل لیٹا سوچ رہا تھا کہ اندر کیسے جایا جاسکتا ہے۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے اور سپاہیوں نے ہر ڈیڑھ منٹ پر عقی حصے میں آ جاتے تھے۔ اگر میں ان کے مڑتے ہی دوڑ لگا دیتا تو بھی اندر پہنچ نہ پاتا۔ دروازہ یا کھڑکی کھولنے کے لیے کم سے کم دو منٹ کی ضرورت تھی جبکہ وہ ڈیڑھ منٹ میں سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ اگر میں چاہتا تو آسانی سے ان پر قابو پا لیتا۔ انہیں بے ہوش کر کے یہیں کہیں ڈال دیتا مگر یہ اپنے پیروں پر کھٹائی مارنے کے مترادف تھا۔ سامنے والے حصے میں بھی سپاہیوں کے گھر تھے۔ یہ دونوں وقت پر نہ پہنچتے تو انہیں شک ہو جاتا اور وہ ان کی تلاش میں عقی حصے کی طرف آ جاتے۔ اس طرح کام ہونے سے پہلے ہی انہیں میری موجودگی کا احساس ہو جاتا۔ مجھے ہر حال میں آج دو بے کو ختم کرنا تھا کیوں کہ دیال اور شیکھر کو ختم کرنے کے لیے الفانسو نے دو پارٹیاں روانہ کر دی تھیں۔ انہیں ہر حال میں کامیاب ہونا تھا۔ اگر میں ناکامیاب لوٹتا تو جگ ہنسائی ہوتی۔ اپنی عزت بچانے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈنا تھا۔

ابھی اندر جانے کا راستہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اوپر کی منزل سے کسی نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ وہ چہرہ صرف لمحہ بھر کے لیے نظر آیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ انادی تھی۔ دو بے کی بیٹی۔ مجھے یقین تھا اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ میں ابھی باڑ کے درمیان لیٹا اوپر دیکھ ہی رہا تھا کہ وہی چہرہ پھر نظر آیا۔ اس بار میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ واقعی انادی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے وہیں لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں کامیاب لوٹوں گا مگر تبھی دل نے کہا۔ ”ایسا بھی ہو سکتا ہے اس کا ارادہ بدل گیا ہو۔ دو بے آخر کو اس کا باپ تھا۔ ایک بیٹی کیسے اپنے باپ کو مروانے پر آمادہ ہو جاتی۔ وہ مجھے دھوکے سے اپنے باپ کا قیدی بھی بنا سکتی ہے۔“

وقت بڑی سست روی سے گزر رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد پچھلا دروازہ کھلا۔ ادھ کھلے دروازے سے انادی کا چہرہ نظر آیا پھر غائب ہو گیا۔ سپاہیوں نے دار آئے اور گزر گئے۔ میدان صاف ہوتے ہی میں اٹھا اور تیر کی طرح دروازے میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے پیچھے انادی کھڑی تھی، اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر سرگوشی میں بولی۔ ”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“ میں اس کے ساتھ اوپر کی منزل پر پہنچا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ کمرہ بطور خواب گاہ استعمال ہوتا ہوگا۔ بستر پر

زنانہ شب خوابی کا لباس رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ انادی کا کمر ہے۔ انادی نے اندر سے دروازے کی چٹختی لگا دی پھر مڑ کر مجھ سے بولی۔ ”مجھے پہچان گئے ہو؟“

”ہاں! مجھے معلوم ہے تم دو بے کی بیٹی ہو۔“

”جب مجھے جان گئے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ دشمنی کی وجہ کیا ہے؟“

”ہاں! تمہارے باپ نے تمہارے محبوب کو قتل کروا دیا ہے۔“

”وہ میرا محبوب ہی نہیں میرا پتی بھی تھا۔ ہم نے خفیہ شادی کر لی تھی۔ صرف دنیا کو بتانے کے لیے شادی کا اعلان کرنے والے تھے کیوں کہ ہمارے پیار کی نشانی میرے اندر کروٹیں بدلنے لگی تھی۔“ اس کا لہجہ تیز اور آنکھیں بھرا آئی تھیں۔ وہ جذبات بھری آواز میں بول رہی تھی۔ ”میرے پیار کی نشانی کو اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی میرے ظالم باپ نے یتیم کر دیا۔ وہ چھری جو باپ کے حکم سے میرے شوہر کے سینے میں دھنسی تھی اس کا درد مجھے آج بھی اپنے سینے میں محسوس ہوتا ہے۔ مجھے تڑپا رہا ہے۔ اس درد سے تبھی چھٹکارا ملے گا جب میرے باپ کو اس کے کیے کی سزا ملے گی۔“

میں خاموش رہا۔ وہ جذبات کی لہروں میں بہتی، سسکتی رہی، غصے کا اظہار کرتی رہی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ بولتی رہے۔ دل میں چھپا درد آنکھوں کے راستے بہہ جائے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے اس کے ذہن کا رخ بدلنے کے لیے پوچھا۔ ”تم نے مجھے کب دیکھا تھا؟ کیا اس وقت جب میں کروٹا کی جھاڑیوں کے پیچھے ہوا تھا؟“

”نہیں میں نے تمہیں تبھی دیکھ لیا تھا جب تم دیوار پھاند رہے تھے۔ اس وقت میں کھڑکی میں ہی کھڑی تھی۔ تمہیں دیکھتے ہی میں پیچھے ہٹ گئی تھی تاکہ پہرے داروں پر نظر رکھ سکوں۔ یہ دیکھ سکوں کہ کہیں کسی گارڈ نے تمہیں دیکھ تو نہیں لیا۔ اب بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”اپنا وعدہ پورا کرنے۔“

”اچھا! میرے باپ کو تڑپا تڑپا کے مارنے آئے ہونا۔“

”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”میں تو اعتراض کرنے کے قابل ہی نہیں رہی البتہ تمہاری مدد ضرور کر سکتی ہوں۔“

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو جاؤ! میرا باپ نیچے والے کمرے میں ہے اور شاید اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔“

”کامیابی کی دعا کرنا۔“ کہتا ہوا میں نیچے اترتا چلا گیا۔

سیڑھیاں طے کر کے میں نیچے پہنچا۔ سامنے ہی بڑا سا ہال تھا جس کے آدھے حصے کو بلجیم والے شیشے کی دیوار کھڑی کر کے ایک کمرہ بنادیا گیا تھا۔ میں پھرتی سے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی دو بے کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”تم!“

”ہاں میں!“ میں نے مسکرا کر سر دلچے میں کہا اور جیب سے چاقو نکال لیا۔

”تم..... تم اندر کیسے آئے؟“ اس نے پوچھا۔

”جب گھر میں میرے جعفر ہو تو راستہ خود ہی نکل آتا ہے۔“ میں نے چاقو کو نچاتے ہوئے کہا۔

”تم..... تم انادی کے بارے میں کہہ رہے ہو؟“

”ہاں!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا پھر بولا۔ ”ایک بار پھر تم میرے سامنے ہوؤ دو بار میں نے چھوڑ دیا تھا مگر اب معاف نہیں کروں گا۔“

”اس سے پہلے دونوں بار حالات ایسے تھے کہ میں چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکا مگر اس بار تم خود میرے جال میں پھنس گئے ہو۔ یہاں چپے

چپے پر میرے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔“

”مگر تمہیں اپنے آدمیوں پر اتنا ہی بھروسہ ہے تو انہیں بلاؤ۔ مدد طلب کرو۔ سنو دو بے! تم اب تک بے وقوفوں کی جنت میں ہو۔ سب

کچھ وہی ہے۔ حالات نہیں بدلے صرف جگہ بدل گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے دو بار موت تمہیں چھو کر گزر گئی تھی لیکن اس بار ایسا نہیں ہوگا۔

اس بار تمہاری جان لے کر.....“

”اس کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟“ دو بے نے میری بات کاٹی۔ ”تم یہاں سے سلامت نکل نہیں پاؤ گے۔ میرے آدمی تمہیں چھلنی کر دیں گے۔“

”بعد میں کیا ہوتا ہے۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے کہا۔ ”کیوں کہ تب تم مر چکے ہو گے اور مرنے سے پہلے

ایک بات اور جان لو۔ آج تمہاری بادشاہت کا سیاہ ترین دن ہے۔ آج کے دن تم اپنے جاٹاروں، مال اور لٹے ہوئے گوداموں کو کھودو گے۔“

”یہ تم کرو گے تم؟“ دو بے نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”میں تو صرف تم سے نمٹنے آیا ہوں۔ باقی کام میرے آدمی کریں گے جو اس وقت آدھا کام ختم بھی کر چکے ہوں گے۔ تمام خفیہ گودام

آگ کی لپٹوں میں گھرے ہوں گے۔ تمہاری بادشاہت فقیری میں بدلنے والی ہے۔“

”خبر دلچسپ ہے مگر تمہارے آدمی کہاں سے پیدا ہو گئے؟ کیا ہند بھر کے بھجوروں کو جمع کر لیا ہے۔“ دو بے نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

میں جواب میں کچھ کہتا کہ میری بولتی بند ہو گئی۔ گردن کے پچھلے حصے پر لوہے کی ٹھنڈک نے اشارہ کر دیا تھا کہ کسی نے چھری کی نوک رکھ

دی ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ دو بے اتنا زیادہ کیوں بول رہا تھا۔ وہ مجھے باتوں میں الجھا رہا تھا۔ میرا چہرہ اس کی طرف تھا اس لیے

میں پیچھے سے آنے والے کو دیکھ نہ سکا۔ دو بے نے اسے دیکھ لیا تھا اور مجھے باتوں میں اس طرح پھنسا لیا کہ میں اپنی حفاظت سے غافل ہو گیا۔

”حرکت نہ کرنا ورنہ گردن میں سوراخ ہو جائے گا۔“ عقب سے آواز آئی۔

میں نے آواز پہچان لی۔ وہ آواز شیکھر کی تھی۔

میں نے چاقو کو اپنے جوتوں کے قریب گرا کر ہاتھ اٹھا دیے۔ پانسہ پلٹ چکا تھا۔ شکاری خود شکار ہونے والا ہے میں یہی کچھ سوچ رہا

تھا کہ دو بے نے کہا۔ ”سنو شیکھر! یہ کیا کہتا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اس کے آدمی ہمارے اڈوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ آگ لگا رہے ہیں ہمارے گوداموں

کو دکاؤں کو۔“

”یہ کچھ رہا ہے۔ ہمارے آدھے سے زیادہ گودام راکھ کا ڈھیر بن چکے ہیں۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ خود میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر آیا ہوں۔ راستے میں دوبار مجھ پر قاتلانہ حملے ہوئے اگر تازہ مک لالنے کی جلدی نہ ہوتی تو میں یہاں کبھی نہ آتا۔ جتنی جلدی ممکن ہو میرے ساتھ نکل چلو ورنہ ویکٹر ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اپنی شکست کا بدلہ لینا ضروری ہے۔“

”تب پھر سوچنا کیا اسے ختم کرو اور نکل چلو۔“ دو بے نے مشورہ دیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اب وقت گنوانا نہیں چاہتے ہیں۔ ان کی چھری میرے سینے میں دھنسنے اس سے پہلے ہی مجھے کوئی قدم اٹھالینا چاہئے۔ آخری کوشش کے طور پر میں کوئی قدم اٹھاتا کہ پورا کمر ادھماکے سے لرز اٹھا۔ شیکھر منہ کے بل سلوموشن میں گر رہا تھا کہ میں نے دیکھا اس کی گردن میں سوراخ ہے جس سے خون ابل رہا ہے۔ اس کے عقب میں انادی طمنچہ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے کھڑی تھی۔ نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس بے وقوف لڑکی نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ اگر شیکھر ذرا سا بھی ابل جاتا تو وہ گولی میرے سر میں لگتی۔ میں نے مڑ کر دو بے پر نظر ڈالی۔ اس پر تو گویا سکتہ سا چھا گیا تھا۔ وہ ایک ٹک بٹی کو دیکھے جا رہا تھا۔

”انادی! ادھماکا پہرے داروں کو متوجہ کر چکا ہو گا تم دروازے پر مورچہ سنبھالو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

میری چیخ پر انادی واپس بھاگی دو بے کا سکتہ ٹوٹ گیا۔

”کمینی! ذلیل! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ کہہ کر وہ بٹی کی طرف دوڑا۔ میں نے پھرتی سے اپنی دہنی ٹانگ اٹھادی۔ وہ الجھ کر گرا۔ میں نے موقع ضائع کیے بغیر اس کی کمر پر کھڑی لات چلا دی۔ وہ قلابازی کھا کر دور جا گرا۔ میں نے اپنی جگہ سے اچھال بھری اور اس کے سر پر سوار ہو گیا۔ میرے جوتے کی ایڑی اس کے منہ پر پڑی تھی۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے۔ چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ اس کی چیخ اور دھماکا ایک ساتھ گونجا تھا۔ ایک پہرے دار دوڑتا ہوا آیا اور اب سینہ پکڑے رکوع کی حالت میں تھا۔ انادی نے دوسری گولی چلا دی۔ پہرے دار کی کھوپڑی میں سوراخ ہو گیا۔ میں نے ادھر سے نظر ہٹا کر دو بے کو دیکھا۔ وہ مجھے متوجہ نہ پا کر آہستہ آہستہ سرکتا ہوا ادھر بڑھ رہا تھا جہاں میرا چاقو پڑا تھا۔ میں نے مزید ایک لات اس کے سینے پر ماری۔ وہ الٹ کر پیچھے جا پڑا۔ میرے جوتے کی نوک خون سے بھر گئی تھی۔ میں نے نظر جوتے پر ڈالی اور پھر لات چلا دی۔ اس بار بھی دو بے نے گھٹی گھٹی چیخ ماری تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کالر کو پکڑ کر سیدھا کیا۔ اسی وقت پھر دھماکا ہوا۔ گولی میرے سر پر سے گزری تھی پھر تو دھماکوں کا سلسلہ سا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ انادی نے ایک ہاتھ میں طمنچہ اور دوسرے ہاتھ میں دوسرا طمنچہ پکڑ رکھا تھا۔ کچھ گولیاں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ شاید وہ طمنچہ میں گولیاں بھر رہی تھی کہ پہرے دار آ گیا جو اس وقت آڑ میں کھڑا فائر کر رہا تھا۔ انادی اس کے لیے کافی تھی۔ میں نے پوری توجہ دو بے پر مرکوز کر دی۔ دو بے کے ہاتھ پیڑ ڈھیلے ہو چکے تھے، میں اسے کھڑا کر کے دونوں ہتھیلیوں سے اس کی دونوں طرف کی ہتھیلی پر وار کیا۔ کڑکڑ کی آواز ابھری۔ اس کی چیخ بڑی دووناک تھی۔ میں نے آخری وار اس کی گردن کے پچھلے حصے پر کیا۔ کٹ کی آواز کے ساتھ اس کی گردن ایسے جھول گئی جیسے وہ بڑکا بنا ہو۔ اسے زمین پر پٹخ کر میں نے انادی کی طرف دیکھا۔ فائرنگ میں شدت آگئی تھی۔ میں اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتا کہ وہ چیخ کر بولی۔ ”تم کھڑکی سے کود کر نکل جاؤ، میں انہیں سنبھالتی ہوں۔“

”نہیں انادی! میں تمہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

”میری پروا مت کرو۔ میں تو اسی دن مر گئی تھی جب مجھ سے میری زندگی کا سہارا چھینا گیا تھا۔ وقت کم ہے پہرے دار زیادہ ہیں۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے میرا محبوب آواز دے رہا ہے۔ مجھے کئی گولیاں لگ چکی ہیں۔ تمہیں قسم ہے تم چلے جاؤ۔ چلے جاؤ پلیز چلے جاؤ۔“

انادی کی التجا پر میں نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ پہرے دار مصرف تھے۔ میں سیدھے دروازے کی طرف دوڑنا چلا گیا۔ سامنے ہی یوکلایٹس کا پیڑ تھا۔ میں اس کے چکنے تنے پر بندر کی سی پھرتی سے چڑھا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اندر سے گولیوں کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ راہ چلتے لوگ ٹھنک گئے تھے۔ مجھے کودتے دیکھ وہ سب چونکے تھے۔ یہ میری قسمت تھی یا اتفاق کہ مجھے سامنے ہی ایک خالی بگھی نظر آ گئی۔ کوچوان سے کچھ کہے بغیر میں نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ کوچوان کچھ زیادہ ہی غظند تھا۔ اس نے بگھی بڑھادی۔ کچھ دور آنے کے بعد میری نظر درمیانی کھڑکی سے کوچوان پر پڑی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے کوچوان کو پہچان لیا تھا۔ وہ شیرا تھا۔ وہی کوچوان جس کا دعویٰ تھا کہ وہ مسلمان ہے اور صرف مسلمان ہونے کے ناتے میری مدد کر رہا ہے۔ بغیر کسی لالچ کے اتنی دل جمعی سے ساتھ دینا ہر نازک وقت پر مدد کے لیے موجود رہنا مجھے شبہ کر رہا تھا۔ میں نے شیرا سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”آپ کا انتظار۔“ اس نے مسکرا کر آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس بنگلے میں ہوں۔“ میں نے پوچھا۔

”اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ آپ پر نظر پڑ گئی۔ کسی شریف آدمی کو دن دھاڑے کسی کے گھر کی دیوار پھاندتے دیکھ لے تو اسے حیرت ہوتی ہی ہے۔ مجھے بھی ہوئی اور میں اس انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ اندر جب دھوم دھڑکا ہوگا تو آپ کو میری بگھی کی ضرورت پڑے گی۔“

”بہت خوب! تو تم خاتم طائی بن رہے ہو۔ خیر مجھے یہیں اتار دو۔“ میں نے بگھی رکوا دی۔ نیچے اتر کر اسیہ ادا کیا اور بڑھتا چلا گیا۔

الفانسو کی حویلی میں پہنچتے ہی میری خوشی دوگنی ہو گئی۔ میرے دونوں ہاتھ نور بیگم اور حسن آرا دہاں موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نور بیگم بازو پھیلا کر آگے بڑھا۔ تم تو ہیرو بن گئے۔ الفانسو نے تمہارے بارے میں جو کچھ بتایا ہے اسے سن کر تو ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے معرکہ آرائی کی قسم کھالی ہے۔ قسم سے تم تو بارسکوپ کے ہیرو کی طرح ہر کام میں آگے آگے ہو۔“

”اگر الگ ہو تو مجھے بھی ایک بات کہنی ہے۔“ حسن آرا نے کہا تو نور جو مجھ سے کسی جو تک کی طرح لپٹ گیا تھا الگ ہوتے ہوئے بولا۔

”لو بولو لیکن ذرا زور سے بولنا تا کہ میں بھی سن سکوں۔“

”مجھے یہی کہنا تھا۔“ کہہ کر وہ بھی بخٹگیر ہو گیا مجھے بھینچتے ہوئے بولا۔ ”کچھ کہنے کی بات اس لیے کہی ہے کہ تم نے میرے یار پر قبضہ کر لیا

تھا۔ اسی کو تو سیاست کہتے ہیں۔“

”سیاست کی ایسی کی تہیسی چلو الگ ہو۔“ نور نے اسے مصنوعی غصے سے کھینچتے ہوئے کہا۔ ”میری جان اتنے دنوں بعد مجھ سے ملی ہے اور تم

مجھے صحیح طور پر ملنے بھی نہیں دے رہے ہو۔“

”بھئی! مان لیا اللہ نے تمہیں دوست دیئے ہیں تو بالکل کھرے۔“ الفانسو نے کہا۔

”ہم لوگ ایسے ہی ہیں دوستی ہو یا دشمنی دونوں ہی زور پر ہوتی ہے۔ دنیا دکھاوے کی دوستی نہیں ہوتی۔“ کہہ کر میں نے ”اماں“ کہا اور نور بیگم کو دو بارہ سینے سے لگا لیا۔

”اگر آپ لوگ اچھی طرح مل چکے ہیں تو اب ذرا مجھے مبارک باد دینے دیں۔ ان کی کوششوں سے آج ہم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ جیسوئل کی کمرٹوٹ چکی ہے۔“ الفانسو نے ڈرامائی انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

”ہاں! کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے نور کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے آرام سے بیٹھ تو جائیں۔“

”میں الفانسو کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔“ ہاں بتاؤ! جیسوئل کا کتنا نقصان ہوا؟“

”میں نے کہاناں اس کی سلطنت کا تہائی حصہ ختم ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ اپنے قلعہ نما مکان میں بیٹھا بیچ و تاب کھا رہا ہوگا۔“

”شیکھر کو گھیرنے کی ذمہ داری تو تمہاری تھی پھر وہ دو بے کی حویلی کیسے پہنچ گیا؟“ میں نے الفانسو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”ہم دیال کو ختم کرنے کے بعد شیکھر کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہاں زوردار مقابلہ ہوا۔ اس کے پہرے داروں نے ہمیں الجھا لیا تھا اور وہ عقبی دیوار پھانڈ کر فرار ہو گیا۔ ہم نے تمام پہرے داروں کو واصل جہنم کیا پھر اس کی تلاش میں دو بے کے بنگلے پر پہنچے۔ وہاں بھی جم کر مقابلہ ہوا۔ پہرے داروں سے شمشیر کے بعد اندر داخل ہوئے تو دو بے شیکھر اور نادادی کا مردہ جسم ملا۔“

”وہ اپنی کوٹھی سے فرار ہو کر دو بے کی مدد لینے آیا تھا۔ اگر میں وہاں موجود نہ ہوتا وہ اسے لے کر ویکٹر کے پاس جا چکا ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”ویکٹر کے پاس پہنچ کے بھی اسے مایوسی ہوتی کیونکہ ابھی ابھی وہاں سے اطلاع ملی ہے کہ ہمارے آدمیوں نے اس کے اڈوں کو بھی تباہ کر دیا ہے۔“ الفانسو نے کہا۔

”ہاں جو تم نے چاہا وہ پورا ہو گیا۔ اب آرام کرو۔“ کہہ کر وہ اٹھ گیا اس کے جانے کے بعد میں نور بیگم اور حسن آر کے ساتھ اس کمرے میں آ گیا جسے ایک بار پہلے بھی استعمال کر چکا تھا۔

☆.....☆

ہم سب الفانسو کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ میں نے اپنا منصوبہ بتانے سے پہلے سب پر نظر ڈالی پھر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”محترم! ہم سب ایک بڑا جوا کھیلیں گے۔ یہ زندگی کا جوا ہوگا۔ اسے کھیلنے کے بعد یا تو ویکٹر نہیں یا ہم نہیں۔“

”اس جوئے کی شروعات کہاں سے ہوگی؟“ الفانسو نے پوچھا۔

”ویکٹر کی حویلی سے۔ لیکن اس جوئے میں آپ بھی شریک ہوں گے۔ یہ موت کا کھیل ہے اس کھیل میں وہ کامیاب ہو سکتا ہے جو بے جگر ہو۔ آپ کے ساتھیوں میں بھی ایسے بے شمار بندے ہوں گے جو موت کو کھیل سمجھتے ہیں لیکن یہ لڑائی کچھ ایسی ہے جس میں آپ کا شامل ہونا ضروری ہے۔ آپ نے کبھی شطرنج کھیلی ہے؟ بساط پر سپاہی، فیل، اسپ، وزیر بادشاہ وغیرہ سجایا جاتا ہے۔ سپاہی سپاہی کو مارتا ہے۔ وزیر وزیر کو۔ یہ کھیل

بھی مہروں کا نہیں دُریوں کا ہے۔ مہروں کو تب لایا جاتا ہے جب کسی ملک کو فتح کرنا ہو اور وزیر تہ میدان میں آتا ہے جب بادشاہ کا تخت چھیننا ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں۔“

”میں میدان میں آنے کو تیار ہوں۔“ الفانسو نے جلدی سے کہا۔

میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر کہا۔ ”آپ حسن آرا کو دیکھ کر غمی ہوئی کا نقشہ بتائیں۔ اسے بھی ایک اہم کام انجام دینا ہے۔ یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔ ہم تینوں ایک ساتھ اندر داخل ہوں گے۔“

”اور میں مجھے کیوں بھول رہے ہو؟“ نور بیگم نے پوچھا۔

”اماں! جنگ لڑتے وقت فوج کا ایک بڑا حصہ ریزرو میں رکھا جاتا ہے۔ آپ کا کام بعد میں شروع ہوگا۔ پہلے پورا منصوبہ سنیں۔ ہاں محترم الفانسو! آپ اسے اندر کا حفاظتی انتظام سمجھائیں۔“

الفانسو نے حفاظتی انتظامات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد حسن آرا نے کہا۔ ”یہ تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ناقابلِ تسخیر قلعہ ہو۔ ہم اندر کیسے داخل ہوں گے؟“

”دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جو قابلِ تسخیر نہ ہو۔ صرف حوصلہ ہونا ضروری ہے۔ ہم آج رات میں ہی اس قلعہ کو ڈھا دینے کے لیے اندر داخل ہوں گے۔“

”اس قلعہ نما عمارت میں داخل ہونے کی بات کہہ رہے ہو تو یقیناً تم نے اندر جانے کا کوئی خفیہ راستہ دریافت کر لیا ہوگا۔“ الفانسو نے کہا۔

”ہم کسی بھی خفیہ راستہ سے داخل ہوں چھپ نہیں سکتے۔ سب کی نظریں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔ پہرے دار ہمیں دیکھیں گے۔“

”اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اندر داخل ہو جائیں گے؟“ حسن آرا نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے بیگ کو اٹھایا۔ اس کو کھول کر میں نے فرش پر پچھی چاندنی پر بھلا دیا۔ ”آپ سب جانتے ہیں کہ جب تلواروں سے جنگ ہوتی تھی تو لوگ خود اور زرہ بکتر پہنتے تھے۔ لندن سے ایک نیا لباس آیا ہے جسے بلٹ پروف جیکٹ کہا جاتا ہے۔ اس جیکٹ کے سینے اور پیٹ پر اصلی فولاد کی چادر کے ٹکڑے استعمال ہوئے ہیں جو حرکت کرنے میں آڑے آتے ہیں۔ یہ بھی بلٹ پروف جیکٹ ہے مگر اسے آسانی سے پہنا جاسکتا ہے۔ اس کپڑے میں ایسے اسٹیل وائر استعمال کیے گئے ہیں جو آگ اور بارود کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ چاقو بھی استعمال کیا جائے تو اس کپڑے کے پار نہیں ہو سکتا۔ اس میں لچک بھی ہے اور مضبوطی بھی، ہم مسلمان تعداد میں بہت بڑی طاقت ہیں مگر ہمیں مٹھی بھر انگریز انگلیوں پر نچار ہے ہیں۔ ہماری دماغی صلاحیت پوری طاقت آپس میں دست و گریباں ہونے کے لیے وقف ہے جبکہ انگریز اپنی دماغی صلاحیت کا صحیح استعمال کر رہے ہیں، وہ نت نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایجاد بھی انہی کی ہے جو ہم پر یعنی اس قوم پر آزمایا رہے ہیں جس نے سائنس کی نئی تشریحات دنیا کو دی تھیں۔ جو کبھی علم و عقل میں سب سے آگے تھے اس جیکٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پہن کر انسان بہت آسانی سے حرکت کر سکتا ہے۔ گولیوں سے بچ سکتا ہے لیکن وہاں تک کا حصہ محفوظ رہتا ہے جہاں تک پیر ہن ہے۔ اس لیے اضافی کپڑا بھی لایا ہوں جس کا

ڈھال باندھا جائے گا۔ یہ باریک تاروں سے بنا کپڑا چھین پیدا ضرور کرتا ہے مگر زندگی کو محفوظ رکھتا ہے۔“

اس کپڑے کے ذریعے ہم گولیوں سے تو محفوظ ہو جائیں گے لیکن الیکٹرک شارٹ سے کیسے بچیں گے؟“ الفانسو نے پوچھا۔

”الیکٹرک شارٹ کا پتہ لگانا تو معمولی بات ہے۔ ہائی سرکٹ پر کام کرنے والوں کی یہ عینک لے کر آیا ہوں اسے لگا کر بہ آسانی دیکھ لیں گے۔“ کہہ کر میں نے بریف کیس سے گول شیشوں والا کورنگی عینک نکال کر انہیں دیا پھر الیکٹرک وائر کو سرکٹ میں لگا کر سیٹ آن کیا اور بولا۔ ”خالی آنکھ سے کچھ نظر نہیں آئے گا مگر آپ اسے لگا کر دیکھیں۔“

الفانسو نے عینک لگایا اور چیخ کر بولا ”واہ اس چشمے کی وجہ سے نگہ تار سرخ انگارے سے بھر ا دکھائی دے رہا ہے۔“

”ذرا میں بھی دیکھوں۔“ حسن آرانے کہا۔

اس نے عینک بڑھا دی۔ حسن آرانے عینک سے نگے تار کو دیکھا پھر اسے اتار کر تعریفی لہجے میں بولا۔ ”اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ ویکٹر کو گردن سے پکڑ کر ہم باہر کھینچ لائیں گے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ہم کامیاب ہو جائیں گے؟“ میں نے الفانسو سے پوچھا۔

”کامیاب! میاں میرا تو خیال ہے کہ ناکامی کا سوال نہیں ہے۔“

”نہیں! کامیابی اور ناکامی کا آدھا آدھا شبہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں! دونوں باتوں کا برابر کا اندازہ ہے۔“ حسن آرانے تائید کی۔

”اگر ہم میں سے کوئی مر گیا تو.....؟“ میں نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ الفانسو نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس جنگ میں اگر میں مارا گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا مہناز بانو بھی اس کے قبضے میں رہ جائے گی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

کہا۔ ”اگر آپ مر گئے تو مجھے فرق پڑے گا۔ میں آپ کی طاقت پر کھیل رہا ہوں۔ آپ کے بعد آپ کے آدمی میرے اشارے پر نہیں چلیں گے۔

میں اکیلا رہ جاؤں گا اور ویکٹر پوری قوت سے مجھ پر چڑھ دوڑے گا۔“

کافی دیر تک الفانسو خاموش رہا۔ سر جھکا کر کچھ سوچتا رہا پھر گردن نیچی کر کے بولا۔ ”تمہارا کہنا ٹھیک ہے! میرے مشن کی باگ ڈور

تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“ پھر وہ اپنے ساتھی سے بولا۔ ”تم اور تمام ساتھی اس کے اشارے پر چلیں گے۔ جو میری حیثیت ہے میرے بعد وہی

حیثیت اس کی ہوگی۔ میرے بعد اگر یہ مشن کو مکمل کرنے سے گریز کریں پھر بھی ان کا ساتھ دو گے۔“

”آج رات ہم پوری تیاری کے ساتھ ویکٹر کی قلعہ نما حویلی میں گھس جائیں گے۔“ میں نے کہا اور ان سب کے چہروں پر نظر ڈالی۔

ہر ایک کے چہرے پر جوش تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ کدم کنواں میں واقع ویکٹر کی نئی قلعہ نما حویلی سے سوگز دوری پر میرے ساتھ حسن آرا اور الفانسو کھڑے تھے۔ میری آنکھیں لوہے کے بڑے سے گیٹ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس سلاخوں والے گیٹ کے اندر کا منظر بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ کئی پہرے دار ادھر سے ادھر گشت کر رہے تھے۔ سب کے سب مسلح تھے۔ شاید اتنی مستعدی جی سوال کے اڈوں کی تباہی کے بعد کا نتیجہ تھی۔ میں نے مڑ کر اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ سبھی کے چہرے پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس طرح چہرے اور سر کو ڈھانپ رکھا تھا کہ ایک انچ بھی خالی نہ تھا۔ دیکھنے کے لیے انہوں نے تھوڑی تھوڑی جگہ کھلی چھوڑی تھی جسے کور کرنے کے لیے آڑی پٹی کی طرح اوپر سے بھی کپڑے لپیٹے تھے اگر وہ کپڑا عام قینچی سے کٹ سکتا تو وہ نقاب بنا لیتے مگر باریک تاروں سے بنا کپڑا جس پر پٹا نہیں کیسی کیمیکل کی تہیں جمی ہوئی تھیں اتنا مضبوط تھا کہ اس پر قینچی چل ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے باریک بینی سے ان سب کا جائزہ لیا پھر میں نے الفانسو سے کہا۔ ”سامنے سے اندر داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے اس لیے ہمیں عقبی حصے کی طرف سے کوشش کرنا ہوگی۔ ادھر ایک پیڑ ہے۔ اس پیڑ کے ذریعے نوکروں کی کھولی کی چھت پر اتریں گے پھر وہاں سے سیدھے برآمدے کی طرف۔“

”ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔“ کہہ کر الفانسو عقبی سمت بڑھتا چلا گیا۔

”اس خیال میں مت رہیں کہ ادھر سے ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے۔ یقیناً خفیہ جگہ پر بیٹھا پہرے دار ہمیں دیکھ لے گا۔ وہ راستہ ہم نے صرف اس لیے منتخب کیا ہے کہ مزاحمت کا سامنا کچھ دیر میں ہوگا۔“ کہہ کر میں نے بھی قدم بڑھا دیا۔

ہم سب اس پیڑ پر چڑھ کر کھولی کی چھت پر اترنا ہی چاہتے تھے کہ میری نظر چھت پر پڑی اور میں نے سب کو روک دیا۔ اگر ہماری آنکھوں پر خاص قسم کے چشمے نہ ہوتے تو حادثہ یقینی تھا۔ چھت پر باریک سے تین تار ایک فٹ کی بلندی سے گزر رہے تھے۔ تاریں اتنی باریک تھیں کہ ایک نظر میں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ چشمے کی وجہ سے ہمیں ان میں دوڑتی بجلی نظر آ گئی تھی۔ اندھیرے میں وہ تاریں انگارہ سی دکھتی نظر آرہی تھیں۔ اس وقت تک اے سی کرنٹ ایجاد ہوا نہیں تھا۔ ڈی سی کرنٹ ہوتا تھا جو جھکمار کر دور پھینک دیتا تھا۔ کسی کے بھی جسم کا کوئی حصہ تار سے مس ہوتا تو وہ اچھل کر دور جا گرتا اور پہرے دار اسے چھاپ لیتے۔

”ان سے بچ کر۔“ میں نے دلی آواز میں کہا۔

میرے کہنے پر سب ہوشیار ہو گئے۔ نہایت احتیاط کے ساتھ ان تاروں کو پھلانگ کر ہم چھت کے درمیان میں پہنچے۔ سب کے پیروں میں نفیس قسم کے برساتی لونگ بوٹ تھے۔ بالکل ایسے جنہیں ”برساتی جوتے“ بھی کہا جاتا ہے۔ ربڑ کے جوتے الیکٹرک شاک سے تو محفوظ رکھتے ہی ہیں آواز بھی پیدا نہیں کرتے اس لیے میں نے اس قسم کے جوتوں کو ترجیح دی تھی۔ یکے بعد دیگر ہم چھت سے لٹک کر نیچے اترے۔ ابھی ہم نے نیچے قدم رکھے ہی تھے کہ ہمارے استقبال میں پہرے داروں کی بندوقیں گرج اٹھیں، دھائیں دھائیں، کئی گولیاں ہمارے جسم سے ٹکرائیں اور ہمیں اس بلٹ پروف کپڑوں کی اہمیت سے آگاہ کر گئیں۔ گولیوں کے ٹکرانے سے ہمیں خاصی چوٹ لگی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے غلیل سے کسی نے پتھر مارا ہو۔

”رکنا نہیں دوڑتے چلو۔“ الفانسو نے چیخ کر کہا۔

ہم دوڑتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھے۔ اس درمیان میں کئی پہرے دار آگے آئے جنہیں ہمارے ٹمچوں سے نکلی ہوئی گولیوں نے

روک دیا۔ کتنے زخمی ہوئے، کتنے مرے یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے برآمدے میں پہنچ گئے، ہمارا پیچھا کرنے والے بھی برآمدے تک پہنچے تھے مگر جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے وہ سب رک گئے۔ مجھے یاد آ گیا کہ ویکٹر کا حکم تھا کسی بھی حالت میں باہر کے پہرے دار اندر نہ آئیں۔ اندر کی حفاظت کے لیے دوسرے پہرے دار تھے۔ کئی لمحے اسی طرح گزر گئے۔ ہم سب کھڑے لمبی لمبی سانس لیتے رہے۔ حسن آرانے اپنے دونوں ٹمچوں کو پھر سے لوڈ کیا۔ الفانسو نے بھی یہی کیا۔ میں نے سب سے کم گولیاں چلائی تھیں پھر بھی خالی خانوں کو بھر دیا۔ ہم آگے بڑھنے کو تیار تھے۔

”اندر والے پہرے دار ہمیں دیکھ رہے ہوں گے۔“ الفانسو نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”سنجھل کر بولنا، ہماری زبان سے نکلا ایک ایک لفظ اندر پہنچ رہا ہوگا۔“

میں نے کھوجتی نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ہم پچاس فٹ لمبی راہداری میں کھڑے تھے۔ راہداری کے آخری سرے پر دائیں اور بائیں جانے کے راستے تھے۔ اس کے علاوہ خاموش دیواریں تھیں، کمروں کا دروازہ ابھی نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ دوسری طرف ہو۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ الفانسو نے کہا۔

”لگتا ہے وہ لوگ ابھی اسی فکر میں ہوں گے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہے۔ ورنہ ہم انہیں نظر آ ہی رہے ہوں گے۔“

”تم نے ٹھیک کہا، میرا خیال بھی یہی ہے کہ ابھی وہ ہمارے اگلے قدم کے منتظر ہیں۔“ میں نے کہا۔ میری نظریں ایک ایک گوشے کا جائزہ لے رہی تھیں، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ایسی کون سی جگہ ہے جہاں سے دیکھا جا رہا ہے مگر مجھے ابھی تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی تھی۔

”وقت برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آگے بڑھو۔“ الفانسو نے کہا۔

تجلی میری نظر داہنی جانب کی دیوار پر پڑی اور میں نے کہا۔ ”ہوشیار کرنٹ آن ہو چکا ہے۔“ دیوار پر لگے پتھر کے جوڑوں میں باریک باریک تاریں گزر رہی تھیں۔ جو عینک کی وجہ سے سرخ نظر آ رہی تھیں یہی کچھ فرش میں جڑے پتھروں میں بھی نظر آیا۔

”نہایت احتیاط کے ساتھ پنچوں پر وزن ڈال کر آگے بڑھو۔ ذرا سی بے احتیاطی گرفتار کرادے گی۔ میرا خیال ہے بہت طاقت کا کرنٹ گزر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

ہم سب نہایت ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ایک کے بعد ایک سنگ مرمر کے ٹکڑوں پر پیہر رکھتے ہوئے چیونٹی کی رفتار سے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ بالآخر ہم گلیارے کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ ہم مڑنے ہی والے تھے کہ نہایت تیز آواز میں دیوار کے اندر فٹ لاؤڈ اسپیکر سے آواز ابھری۔ ”ویل کم میرے دشمن نمبر ایک الفانسو۔ ہاں، میرے دشمن نمبر دو تمہیں کس نام سے پکاروں؟ بھجوا کہوں یا شنو کہوں؟ تم کیا سمجھ رہے ہو میں نے تمہیں پہچانا نہیں ہے؟ یہ سچ ہے کہ اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا اس لیے اس دھوکے میں تھا کہ تم بھی الفانسو فیملی کے ہو مگر جیسے ہی تم سروینٹ کو اثر کی چھت پر چڑھے تھے میں نے تمہیں پہچان لیا۔ ویسے فکر کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے دشمنوں کو سسکا سکا کر مارنے میں ثانی نہیں رکھتا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے میرے داہنے ہاتھ دو بے کو بہت اذیت دی ہے میں بھی وہ قرض اتارنا چاہتا ہوں۔“

”بولتے بولتے وہ رک گیا۔“

گلیارے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی کہ دل میں خوف پیدا کر دے۔ ہم سب ہمہ تن گوش تھے کہ وہی آواز پھر سنائی دی۔ ”تم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ جس مقام تک پہنچنے کے لیے میں نے ایک عرصہ گزارا، اسے تم نے کچھ گھنٹوں میں ختم کر دیا۔ میری کمر توڑنے کی پوری کوشش کر لی ہے۔ مجھے معذور بنانے کے لیے میرے اہم بندوں کو تم نے ختم کر دیا۔ میرے فیما نسرجی سوال کے گوداموں کو آگ لگا کر تم نے مجھے کروڑوں کا نقصان پہنچایا ہے۔ میں تمہارا ریشہ ریشہ الگ کروں گا۔ نواب صفدر کی بہن جواب تک محفوظ ہے اسے تمہاری نظروں کے سامنے اذیت دے دے کر ہلاک کروں گا۔ تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ برصغیر کی آنے والی نسلیں بھی میرا نام سن کر کانپ اٹھیں گی لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں تمہاری مہمانداری کروں گا۔ جس طرح بلی چوہے کو مارنے سے پہلے اسے بھاگنے دوڑنے کا بھرپور موقع دیتی ہے اسی طرح میں بھی تمہیں خوب موقع دوں گا۔ تم نے دلدل میں پیر رکھ تو دیا ہے اب اپنے ڈوبنے کا بھی مزہ لو۔“

”برائی خواہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو اچھائی سے شکست کھانا اس کا مقدر ہے۔ تم پوری کوشش کر لو مگر میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ ویسے تم لوگوں کا یہاں آنا مجھے راحت بخشنے کا سبب بن رہا ہے ورنہ نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی پڑتی۔ آخر کو بدلہ لینا بھی ضروری ہے ناں۔“

”چلو بھی! اسے ہمارا انتظار ہے۔ کیوں بے چارے کو انتظار کی سولی پر لٹکائے ہوئے ہو۔“ حسن آرا نے کہا۔

”اسے انتظار ہے مگر ہمیں نہیں۔“ کہہ کر میں نے انگڑائی لی پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ”آپ سب اسی طرح نہایت احتیاط سے آگے بڑھیں۔“

”مجھے معلوم ہے تم لوگوں نے جو عینک لگا رکھی ہے۔ یہ اسی کا کمال ہے کہ تمہیں وہ تمام تاریں نظر آ رہی ہیں جن میں کرنٹ ہے۔ خدا نا بود کرے فرانسیسی کتے ڈیگال کو جوان عینکوں کو بیچ رہا ہے۔“

ہم میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ ہماری خاموشی پر اس نے پھر کہا۔ ”کیا بات ہے میرے قابل احترام مہمان ہم سے ناراض ہیں کیا؟ کوئی بھی بولنے پر رضا مند نہیں ہے۔ کیا چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے ہو۔“ ویکٹر کی آواز میں ہنسی بھی شامل تھی۔

کسی نے جواب نہیں دیا۔

”وائیں مڑیں یا بائیں؟“ الفانسو نے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”بائیں!“ میں نے دونوں جانب کا جائزہ لے کر کہا۔

وہ اسی طرف مڑ گئے۔ اس کے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے حسن آرا وغیرہ۔

”صحیح راستے پر مڑے ہو۔“ ویکٹر کی کھٹکتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔ ”دائیں جانب مڑتے تو میں خود تمہیں آواز دے کر روک لیتا۔ تم لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہو اور دائیں راہ داری پھر تمہیں باہر کی کھلی فضا میں پہنچا دیتی۔ میں بائیں جانب ہوں۔ آگے بڑھتے رہو۔“

”کذاب کی اولاد بھونکے ہی جا رہا ہے، چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔“ حسن آرا بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

ہم چاروں آگے بڑھتے رہے۔ سب کے قدم بچے تلے اٹھ رہے تھے۔ کچھ دور جاتے ہی ہم ٹھٹھک گئے۔ آگے کرنٹ کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً چھ فٹ لمبائی میں پورا گلپارا گھرا ہوا تھا۔ اس طرح سے تاروں کا جال بچھایا گیا تھا کہ ان کی درمیانی جگہ میں ایڑی تک رکھی نہیں جاسکتی تھی۔ آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب کیا کیا جائے ہم کھڑے ہو کر یہی سوچنے لگے۔ ہر چہرے پر بس یہی ایک سوال تھا۔

”تم جواں مردوں کے لیے لانگ جمپ لگانا کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں ہے، مجھے فکر ہے تو بس اس موٹے ہیڈروے حسن آرا کی۔ یہ بے چارہ کیسے پار کرے گا۔“ ویکٹر نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”اس کھیل میں اب مجھے مزہ آنے لگا ہے۔“

میری نگاہیں الفانسو کی جانب اٹھ گئیں۔

”چھ فٹ لمبی چھلانگ لگانا ناممکن تو نہیں ہے۔“ الفانسو نے چپکتے ہوئے جال پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”پہلے میں پار کرتا ہوں۔“ میں نے حسن آرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بعد میں الفانسو اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم سنبھال لیں گے۔“

میں نے اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگائی۔ وہ چھ فٹ کی دوری سمٹ گئی۔ میں نے دوسری جانب پہنچ کر حسن آرا کی طرف دیکھا۔ ذرا سی بے احتیاطی بڑے حادثے کو جنم دے سکتی تھی۔ اگر اس کا پکڑا بھی ان تاروں سے چھوٹا تو وہ پل بھر میں اچھل اچھل کر مر جاتا۔ بجلی کا یہی تو کمال ہوتا ہے کہ جاندار کو ایک پل میں اچھال دیتا ہے۔ تبھی حسن آرا نے چھلانگ لگائی۔ اور اس نے اس دوری کو پار کر لیا۔ وہ تقریباً سات فٹ کی دوری پر گر رہا تھا۔

”واہ! بہت خوب ابھی تک جان باقی ہے۔“ ویکٹر کی طنزیہ آواز سنائی دی۔ ”لگتا ہے یہ ہیڈرا میرے حضور پیش ہو کر رہے گا۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا پنڈے میں جوانوں کا قحط پڑ گیا ہے جو ہیڈروے میدان میں آگئے ہیں۔“

”یہ تو دنیا دکھاوے کو ہیڈروے بنے ہیں مگر تم اصلی ہیڈروے ہو اسی لیے چھپے بیٹھے ہو۔“ الفانسو نے تیز آواز میں جواب دیا۔

”اور زور سے بھونکو... ہم جانتے ہیں کتاب پاگل ہو جائے تو اپنے آقا کو بھی کاٹ لیتا ہے۔ تم بھی پاگل ہو چکے ہو۔ تم وہی ہونا جو کبھی ہمارا جھوٹا کھایا کرتے تھے۔“ ویکٹر اس بار کھل کر ہنسا۔

”اس کتے سے بھی بچ کر رہنا۔ کہیں تمہیں کاٹ ہی نہ لے لیکن تم بچو گے کیسے؟ کیوں کہ تمہارا زرخہ تو میں خود ادھیڑوں گا۔“ حسن آرا نے تلملا کر جواب دیا۔

”خوب! تو تمہاری زبان میں بھی خارش ہونے لگی۔“ ویکٹر کا لہجہ پھر طنزیہ ہو گیا۔

”بھونک لو۔ جتنا جی چاہے بھونک لو پھر موقع نہیں ملے گا۔“ حسن آرا نے پھر چوٹ کی۔

”بہت موقع ہے۔ آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔“

بحث کو فضول سمجھ کر ہم نے قدم آگے بڑھا دیے۔ فرش اور دیواریں بالکل صاف تھیں۔ لگتا تھا اب آگے کرنٹ کا جال نہیں ہے۔ ہم بے فکر ہو کر آگے بڑھنے لگے۔ اس گلپارے کے آخر میں پھر دورا سے آگئے تھے۔ دونوں میں قطار سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ تمام کمروں کے

دروازے اندر سے بند تھے۔ وہ دونوں رک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں سوال تھا کہ اب کس طرف مڑنا چاہیے۔ ہم ابھی کھڑے ہوئے راستے کا انتخاب کر رہی رہے تھے کہ ویکٹر کی آواز سنائی دی۔ ”واپسی کے بارے میں مت سوچنا۔ واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ جن راستوں سے تم لوگ آئے ہو اب وہ اس طرح بند کر دیے گئے ہیں کہ تم خود پہچان نہیں پاؤ گے کہ یہاں سے گزرنے تھے۔ سامنے ہی قطار میں کمرے ہیں جس میں دل چاہے داخل ہو جاؤ۔ ہر کمرے میں بستر موجود ہے۔ دل بھر کر آرام کرو۔“

”ہم آرام کرنے کے لیے نہیں آئے تم سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔“

”غصہ نہیں، تم لوگ میرے مہمان ہو اور مہمان کا میزبان کی مرضی پر چلنا فرض ہے، ابھی بہت وقت باقی ہے۔ یوں بھی یہ وقت ملاقات کا نہیں آرام کا ہے۔ جو کچھ کہنا ہے صبح کے لیے بچا کر رکھو اب صبح ہی ملاقات ہوگی۔“

”ہم صبح نہیں ابھی ملاقات کریں گے۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اب صبح ہونے میں دیر ہی کتنی ہے پھر مجھے تم لوگوں کی تملہاٹ سے بھی تو لطف انداز ہونا ہے۔“

”ہمیں جلدی ہے۔ ہم فوراً تم تک پہنچنا چاہتے ہیں۔“

”اگر پہنچ سکتے ہو تو پہنچ جاؤ ورنہ آرام کرو۔ آخر ان کمروں کا کچھ تو مصروف نکلے۔ تمہاری بوٹیاں کرنے سے پہلے میں تمہیں آرام دینا چاہتا ہوں۔ آخر کو قربانی کے جانوروں کا کھلا پلا کر مونٹا تازہ بھی کرنا چاہیے ناں اسی لیے کہہ رہا ہوں آرام کر لو۔ اچھا شب بخیر صبح ملاقات ہوگی۔“

آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ اب اتنی خاموشی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو بم کا دھماکا محسوس ہوتی۔ اس خاموش ماحول میں ہم ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز بھی صاف سن رہے تھے۔

”اب کیا ارادہ ہے؟“ الفانسو نے پوچھا۔

”ایک اینٹ پر دوسری دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ اس مقولے پر عمل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں۔ ایک ایک کمرے کی تلاشی لیں کسی میں تو وہ ملے گا۔“ میں نے کہا۔

میرا حکم پاتے ہی سب اسے ڈھونڈنے کی جستجو میں لگ گئے۔ ایک کے بعد ایک کمروں کو کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔ حسن آرا کمروں کو گنتا جا رہا تھا۔ دراصل ہم یہی چاہتے تھے کہ ایک بھی کمرہ نہ پائے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ نچلی منزل کے بعد ہم اوپر کی منزل پر آئے پھر تیسری منزل کے کمروں کو بھی دیکھ لیا۔ اس منزل کے آخری کمرے کی تلاشی لینے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”حسن آرا! تم نے اچھی طرح دیکھا ہے ناں۔“

”حسن آرا کے چہرے پر ٹھکن تھی۔ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دیکھنے میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ اس آخری کمرے کے بعد اب ایک بھی کمرہ نہیں بچتا۔“

”میرا خیال ہے کہ ویکٹر نے کچھ نئے کمرے بھی بنوائے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تعمیر ہی لگ رہی ہے۔“

”تمہارا خیال درست ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ویکٹر نے اس عمارت کو خریدنے کے بعد اندر ہی اندر بہت ساری تبدیلی کروائی ہے

لیکن تبدیلی کی نوعیت کیا ہے یہ کسی کو نہیں پتا۔ کہتے ہیں اس نے جن مزدوروں سے کام کروایا تھا انہیں پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ سننے میں یہ بھی آیا تھا کہ انہیں ویکٹر نے قتل کروادیا ہے تاکہ اندر کاراز کوئی جان نہ سکے۔“ الفانسو نے کہا۔

”مجھے یاد آگیا۔ اس نے ایک بجلی پیدا کرنے والی مشین بنوائی تھی۔ یقیناً وہ اس وقت کسی تہ خانے میں ہے جہاں تو وہ مشین اب تک نظر نہیں آئی۔ اب ہمیں تہ خانے کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔“ میری آواز اب بھی سرگوشی سے بلند نہ تھی۔

”تو آؤ! ہم سب نیچے چلتے ہیں۔“

ہم سب سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگے۔ اب ہم نجلی منزل کے کمروں کا معائنہ پھر سے کر رہے تھے، اس بار ہم اس زاویے سے دیکھ رہے تھے کہ شاید کہیں ایسا کوئی نشان مل جائے جس سے ثابت ہو کہ وہاں تہ خانہ بھی ہے۔ کافی دیر کی تلاش نے بھی ہمیں امید کی کرن نہ دکھائی۔

”اب اس تلاش کو ادھورا ہی چھوڑ دیا جائے۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”کیوں؟ واپس چلنے کا ارادہ ہے کیا؟“ الفانسو نے پوچھا۔

”شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ویکٹر نے پھرے داروں کو خصوصی ہدایات جاری نہیں کی ہوں گی؟ اب تک ان کی تعداد بھی بڑھادی ہوگی۔ وہ خود بھی اب پوری ہوشیاری کے ساتھ پھرے پر بیٹھے ہوں گے۔ سب کی بندوقوں کا رخ دروازے کی سمت ہوگا۔ جیسے ہی ہم باہر نکلیں گے وہ سب ٹوٹ پڑیں گے۔ اب بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ویکٹر پر قابو پالیں۔“ میں نے تیز لہجے میں کیا۔

”کوئی راستہ بھی تو پتاؤ؟“ حسن آرانے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ہم اس وقت میدان جنگ میں ہیں۔ عقل مند دشمن مقابل کو تھکا دینے کو پوری کوشش کرتا ہے۔ تھکا ہوا دشمن ترنوال ہوتا ہے۔ عقلندی کا تقاضا ہے کہ ہم خود کو تازہ دم رکھیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تازہ دم رہنے کے لیے نیند ضروری ہے۔ ایسا کرتے ہیں انہی کمروں میں سے ایک کا انتخاب کر کے کچھ دیر سو لیتے ہیں۔“

”سویا ہوا انسان مردے کے برابر ہوتا ہے۔“ الفانسو نے ہنس کر کہا۔

”ہم سب سوئیں گے ضرور مگر قسطوں میں۔ دو آدمی سوئیں گے ایک آدمی پہرا دے گا۔ دو گھنٹے بعد وہ اٹھا دے گا تب جاگنے والا نیند پوری کرے گا۔“

ٹھیک ہے اسی کمرے میں سو جاتے ہیں۔ یہاں ایک ہی بیڈ ہے اسی پر دو آدمی سو لیتے ہیں۔“ الفانسو نے کہا۔

”الفانسو! آپ جاگیں گے۔“ یہ کہہ کر میں نے بستر پر لیٹ کر بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

☆.....☆

بہت گہری نیند آئی ہوگی۔“

حسن آرا کے جڑے بھنچ گئے۔ غصے کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”الفانسو کہاں ہے؟“

”یہیں کمروں کے جال میں الجھا ہوا بھٹک رہا ہے بے چارہ!“

”گولی کس نے چلائی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”الفانسو نے..... ہم اپنے مہمانوں کی گولیوں سے میزبانی نہیں کرتے۔“ آواز میں ہنسی کی جھلک تھی۔ ”آپ لوگوں کو بھوک لگی ہوگی۔

واپس پلٹئے۔ اگلے کوریڈور میں ٹرائی آپ کی منتظر ہے۔ جائیے۔“

میں نے حسن آرا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔ ”تم سامنے کیوں نہیں آتے؟“

”ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بلاوے پر آتے تو بات کچھ اور تھی۔ باتیں تو ہو ہی رہی ہیں۔ ضرورت سمجھوں گا تو بلا لوں گا۔“

”کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے پہلے ہی ہم اس تہ خانے کو ڈھونڈ لیں جہاں تمہارا کنٹرول روم ہے جہاں تم خود چھپے ہوئے ہو۔“

”کوشش کر کے دیکھ لو اگر تم نے تہ خانہ ڈھونڈ لیا تو ویکٹر تمہارا غلام ہو جائے گا، جاؤ ناشتا کر لو۔ کھاپی کر تلاش کرنا۔ بھوکے پیٹ تو دل ہی

نہیں لگے گا۔“

میں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے گلیارے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ حسن آرا بھی میرے ساتھ تھا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ الفانسو کہاں ہے؟“ میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

”میں نے بتایا تو ہے وہ ایک کوریڈور سے دوسرے کوریڈور کی جانب بھاگ رہا ہے۔ وہ بھٹک کر رہ گیا ہے۔ اسے بلانا چاہتے ہو تو

آوازیں دو وہ آوازیں کے سہارے چلا آئے گا۔“ ویکٹر کی آواز آئی۔

باتوں کے درمیان بھی ہم چلتے رہے تھے۔۔۔ بالآخر ہم اس کوریڈور میں پہنچ گئے جہاں ٹرائی موجود تھی۔ ٹرائی پر ناشتے کی پلیٹیں بچی ہوئی

تھیں۔ حسن آرا جلدی سے آگے بڑھا مگر نزدیک پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔

”اس میں زہر بھی ہو سکتا ہے۔“ حسن آرا نے کہا۔

”نہیں! فکر نہ کرو۔ اس میں زہر نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ویکٹر ہمیں ختم کرنا چاہتا تو کب کا ختم کر چکا ہوتا۔ وہ مزہ لے رہا ہے ہماری

بے بسی کا لطف لے رہا ہے۔“

”یہ صحیح کہہ رہا ہے۔“ آواز آئی۔

میں بھی ٹرائی کے نزدیک پہنچ گیا۔ تجھی میری نظر سامنے کی دیوار پر پڑی۔ میں نے کہا۔ ”وہ دیکھو گولی اسی کمرے میں چلی ہے گولی کا

نشان سامنے والی دیوار پر صاف نظر آرہا ہے۔“

”اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہا ہے۔ ویکٹر کا نوکر ٹرائی دھکیلتا ہوا یہاں پہنچا اس پر الفانسو کی نظر پڑ گئی۔ الفانسو نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا۔ الفانسو بھی اس کے پیچھے دوڑا اور کوریڈور کے جال میں پھنس گیا۔“

”اب کیا کریں؟“ حسن آرائے کہا۔

”اسے تلاش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ آواز کو قید نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر ویکٹر کی بات سچ ہے تو الفانسو یہیں کہیں بھٹک رہا ہے۔ ایسا کرو اسے آواز دو۔“

حسن آرائے زور سے پکارا۔ ”الفانسو!“ اس کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔ بازگشت بھی سنائی دی تھی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

”پھر پکارو۔“ میں نے کہا۔

حسن آرائے دوبارہ آواز دی۔ ابھی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ الفانسو کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ”جی!“

”پھر پکارو! اس نے تمہاری پکار سن لی ہے۔“ میں نے حسن آرائے کہا۔

حسن آرائے دوبارہ آواز دی۔ ابھی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ الفانسو کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ”جی!“

”پھر پکارو! انہوں نے تمہاری پکار سن لی ہے۔“ میں نے حسن آرائے کہا۔ اس نے پھر آواز دی۔ ابھی اس کی پکار ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ الفانسو سامنے والے کوریڈور سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ٹرائی پر رکھنا نشانہ دیکھ کر وہ رکنا نہیں فوراً شروع ہو گیا۔

ناشتا ختم کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ”ہوشیار رہنا! اتنی دیر میں میں نے جان لیا ہے کہ ہم ویکٹر کے رحم و کرم پر ہیں۔ میں نے ٹرائی لانے والے کو دیکھ لیا تھا۔ اسے پکڑنے کے لیے دوڑا تھا کہ وہ اس طرح غائب ہو گیا جیسے اس نے سلیمانی ٹوپی پہن لی ہو۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ یہاں خفیہ راستوں کا جال سا پھیلا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے ہمارے قدموں کے نیچے بھی کوئی خفیہ سرنگ ہو۔“

”اس بات سے میں متفق ہوں اس چھوٹے سے مکان کو جو باہر سے اہم نظر نہیں آتا اس نے بہت اہم بنا دیا ہے۔ لیکن یہ کہنے میں بھی عار نہیں کہ ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔“ حسن آرائے کہا۔

”نہیں ہم اس کی برابری پر ہیں۔ اگر رحم و کرم پر ہوتے تو کب کے مار دیئے جاتے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے اگر وہ مقابلے پر آئے گا تو مر بھی سکتا ہے۔ اس کی ہڈیوں میں نوجوانوں کی قوت بھی نہیں ہے اس لیے ابھی تک چھپا ہوا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آؤ میں تمہیں ایک جگہ دیکھانا چاہتا ہوں۔ بھٹکتے بھٹکتے میں وہاں پہنچ گیا تھا۔“ الفانسو نے کہا اور کوریڈور کی جانب بڑھنے لگا۔

ہم بھی اس کے ساتھ تھے۔ کوریڈور کی اس بھول بھلیوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک بڑے سے ہال میں پہنچے تھے۔ اس ہال میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ ایک پچاس فٹ کا بڑا سا ہال تھا۔ اس ہال کی مغربی سمت میں ایک اسٹیج نما چبوترہ تھا جس پر غنمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ انتہائی نفاست سے سرخ پردوں کو لگایا گیا تھا۔ چبوترے پر بھی سرخ فرش گیر پتھی ہوئی تھی۔ اسٹیج کے سامنے کل آٹھ بڑی بڑی کرسیاں نصف گولائی میں لگائی گئی تھیں جن کا رخ اسٹیج کی جانب تھا۔ اس اسٹیج کی سجاوٹ کسی دربار کا منظر پیش کر رہی تھی مگر تخت غائب تھا۔

”یہ تو کسی راجہ مہاراجا کا دربار ہے۔“ حسن آرانے کہا۔

”ایسے محل نما مکان میں دربار کا ہونا ضروری ہے۔ شاید اسی جگہ بیٹھ کر ویکٹر میٹنگ کرتا ہوگا۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”اگر ویکٹر میٹنگ کرتا ہے پھر تو اس کی کرسی کہاں گئی؟ اس کے لئے تو سب سے اعلیٰ کرسی ہونا چاہیے تھی جبکہ نیچے کرسیاں بھی ہوئی

ہیں۔ یقیناً وہ اسٹیج پر بیٹھتا ہوگا۔“ الفانسو نے کہا۔

”اسٹیج پر کرسی کا نہ ہونا بھی کھٹک رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور مجھے دیواروں پر سجے آئینے کھٹک رہے ہیں۔ خواہ مخواہ تو اس کمرے کو شیش محل کا درجہ نہیں دیا گیا ہوگا ضرور کوئی خاص بات ہے۔“

حسن آرانے کہا۔

الفانسو دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اسٹیج کے نزدیک پہنچا اور قدمچے پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ گیا۔ اسٹیج پر چڑھ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے مایوسی ہوئی ہے۔

”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ شیش محل اس بے وقوف نے عیاشی کے لیے بنوایا ہے۔“ الفانسو نے اسٹیج کے درمیان پہنچ کر کہا۔

”تم لوگ اسٹیج بنانے کی وجہ پر غور کرو۔ میں تب تک آرام کر لیتا ہوں۔“ کہہ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ ہم وقت برباد کر رہے ہیں۔“ حسن آرانے کہا۔

”تو پھر تم ہی کوئی راستہ تلاش کرو۔“

”یہ خانے کا راستہ تلاش کرنا ہی پڑے گا۔ مجھے شک نہیں یقین ہے کہ یہ خانے کا راستہ اسی کمرے میں ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر جلد پتا لگاؤ۔ ضرورت سمجھو تو دیواروں کو گرا کر راستہ ڈھونڈو۔“

”نہیں! ابتدا اسٹیج سے کرتے ہیں۔ اسے کھود کر دیکھنا پڑے گا کہ اس کے نیچے کیا ہے۔“

”تو شروع ہو جاؤ۔ کرسی اٹھا کر پلٹو ایک اینٹ نکل گئی تو باقی بھی اپنی جگہ چھوڑ دیں گی۔“ میں نے ایک کرسی اٹھائی اور اسٹیج کو جانب بڑھنے

لگا۔ ابھی میں نے قدمچے پر پہلا قدم رکھا تھا کہ زن کی آواز آئی اور زور کی جھنکار گونجی۔ چھت سے لوہے کی سلاخوں والا پنجرہ نیچے گرا۔ اس پنجرے نے

پورے اسٹیج کو گھر لیا تھا۔ الفانسو اس پنجرے میں قید ہو کے رہ گیا تھا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کسی کی دبی دبی سی چیخ سنائی دی۔ میں

نے پلٹ کر دیکھا۔ حسن آرا جس کرسی پر بیٹھا تھا اس میں سے شکنجے سے نکل کر اسے جکڑ چکے تھے۔ وہ آواز ہونے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

”کیوں اب پتا چلا کہ یہ اسٹیج کیوں بنا ہے؟ یہ کرسیاں کیوں رکھی ہیں۔“ ایک تیز کھر کھراتی ہوئی سی آواز گونجی۔

”یہ..... یہ ویکٹر کی آواز ہے۔“ الفانسو نے پنجرے کی سلاخوں کو پکڑ کر کہا۔ ”رات بھر ہم سے جو باتیں کرتا رہا ہے وہ کوئی اور تھا۔“

”ہاں! میری جان وہ میں نہیں تھا۔“ وہی کھر کھراتی آواز گونجی۔ ”میں بے وقت ایک لفظ بھی نہیں بولتا۔ آرام کے وقت آرام کام کے

وقت کام یہی میرا اصول ہے۔“

”یہ بھی اچھا ہوا کہ تمہارے دھوکے میں کوئی اور ہمارا شکار نہیں بنا۔“ الفانسو نے دانت چیس کر کہا۔ غصہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ وہ بے بسی محسوس کر رہا ہوگا اسی لیے اس طرح ابال کھا رہا تھا۔

”تم مجھے کیا سمجھتے ہو ایک میجر کو میرے مقابلے میں لا کر مجھے شکست دے دو گے۔ میں تو کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ تم اندر ہی اندر سازش تیار کر رہے ہو۔ انگلشیہ دولت و امارات سے جلن تم پر نگالیوں کی سرشت میں رچ بس گئی ہے اس لئے تم لوگ کھوکھلے نعروں کے ساتھ لوگوں کو اکسارہے ہو۔ حرام کی دولت میں بڑی کشش ہے۔ اچھے اچھوں کا ایمان خرید لیتی ہے۔ تم آزاد وطن کی دہائی دیتے رہو۔ میں دولت کی چمک دکھا کر سب کو توڑ لوں گا۔ یہ ہندوستانی تو ازل سے بکتے رہے ہیں۔ تم دیکھ بھی نہ سکو گے کہ میں نے کس طرح ان سب کو بے وقوف بنایا کیونکہ تمہاری پھیلی سے زندگی کی لکیر مٹانے والا ہوں۔“

”جو صاحب ایمان ہوتے ہیں وہ دنیاوی چمک کو ٹھوکر مار دیتے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تمہیں ایسی لاتعداد مثالیں ملیں گی۔“ میں نے الفانسو کی حمایت میں چیخ کر کہا۔

”وقت پر وہ بھی دیکھ لیں گے۔ تم نے تو میرے اڈوں کو تباہ کر کے سمجھ لیا تھا کہ میں ٹوٹ گیا ہوں..... میرے بندوں کو ختم کر کے تم نے سمجھا تھا کہ میرا مورال لو ہو جائے گا..... بے وقوف آدمی! یہ بندے تو یہاں کے ہیں جو میرے لیے تن ڈھا پنے کے پڑے ہیں۔ پھٹ گئے تو پھینک دیئے۔ دو دن میں سب کچھ پہلے جیسا ہی کر لوں گا۔ سارا سیٹ آپ پھر سے بنا لوں گا۔ توڑ پھوڑ خون خرابہ میرے لیے معمولی بات ہے۔ تمہاری اوجھی حرکتوں سے کمپنی راج کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تم معمولی سے مہرے ہو۔ تمہاری حکومت تک کو میں چکر دے سکتا ہوں، اسی لیے تمہیں اتنی ڈھیل دے رہا تھا۔ اب جب ہتھے چڑھ گئے ہو تو مزہ بھی چکھ لو، بھلے ہی اتنے سالوں بعد میرے ہتھے چڑھے ہو۔“

”غلط! میں تمہارے ہتھے چڑھا نہیں خود آیا ہوں۔ تمہارے بل سے تمہیں کھینچ کر باہر لانے کے لیے آیا ہوں۔“

”یہ جو ہے کا بل نہیں شیر کی کچھار ہے۔“ ویکٹر کی ہنسی موت کی چاپ تھی۔ عجیب سی کھر کھراتی ہنسی تھی۔ ”اس حد تک بے وقوفی کی بات کرو گے مجھے معلوم نہ تھا۔ کسی چھوٹے بچے کو شیر کے سامنے بیٹھا دیا جائے تو وہ خوش ہوگا۔ قہقہے لگائے گا۔ اس سے کھیلنے کی کوشش کرے گا کیونکہ اس بچے کو کیا معلوم کہ شیر کی دہشت کیا ہوتی ہے۔ بچے میں سمجھداری نہیں ہوتی اس لئے وہ شیر سے نہیں ڈرتا۔ سمجھدار انسان کو معلوم ہے شیر شیر ہوتا ہے۔ اس کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ اگر گیا تو وہ اسے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ تم بھی اس نا سمجھ بچے کی طرح ہو جسے یہ علم نہیں ہے کہ شیر کا خوف کیا ہوتا ہے۔ ایسی بے وقوفی کرنے والے کی تعریف نہیں کرنا چاہیے۔ سمجھے!“

”تم اور شیر!“ الفانسو نے قہقہہ لگایا۔ ”شیر کبھی دم دبا کر گیڈر کی طرح دیکتا نہیں ہے بلکہ دھاڑتا ہوا باہر نکل آتا ہے۔ تم تو ایسے گیڈر ہو جسے غلطی سے شیر کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے اور تم خوش ہو رہے ہو۔ ہمت ہے تو سامنے آ کر دکھاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں خود کو گیڈر اور تمہیں شیر مان لیتا ہوں۔ ہم انگریز عقل کو ترجیح دیتے ہیں سمجھے۔“

”یہ پنجرہ کب بٹے گا؟“ الفانسو نے پنجرے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”یہ موت کا پنجرہ ہے اور جان لے کر ہی ہٹے گا۔ تم مر چکے ہو الفانسو! موت تمہاری قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔“ ویکٹر کی آواز میں خونخواری بھری تھی۔ ”موت تو اسی دن تمہارا مقدر بن گئی تھی۔ جس دن تم لوگوں نے اس محل میں آنے کا پلان بنایا تھا۔ اب موت کو اتنے قریب پا کر تمہارے ہوش کیوں اڑ گئے؟ کیا آنے سے پہلے تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟“

”ہمیں معلوم تھا۔“ اس بار میں نے سیاست بھرنے لہجے میں جواب دیا۔ ”اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم موت کے جڑے میں سر دینے جا رہے ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہماری حالت ایسی ہو جائے گی۔ ہم بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ ہم تم سے ملنے آئے تھے ویکٹر تم سے تمہیں بہادری کے ساتھ سامنے آنا چاہیے تھا۔ ایسی بزدلی کا تو ہمارے ذہن میں شاید تک نہ تھا کہ تم پھندا لگا کر بیٹھے ہو گے اور ہم اس دام میں پھنس جائیں گے؟“

”جو کام بغیر سامنے آئے مکمل ہو جائے وہی اچھا ہے۔ اسے بزدلی نہیں سیاست کہتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم بہادر ہو۔ مجھے تم سے دشمنی مول نہیں لینا چاہیے تھی۔ اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو خان بہادر کا خطاب اور جاگیر کے مالک ہوتے مگر اب تو یہ پرانی بات ہو گئی ہے۔ دشمنی کا فیتہ جل چکا ہے بغیر دھما کا کیے خاموش کیسے ہوگا؟ مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا کہ تم جیسے بہادر انسان کا مجھے ساتھ نہ مل سکا۔ اب تو موت ہی تمہارا مقدر ہے۔ کل کا سورج دیکھے گا کہ تمہارے ایسے بہادر آدمی کی لاش باگی پور کے چوراہے پر پڑی ہوگی تاکہ ڈرائی انڈین دیکھ سکیں کہ ہم سے ٹکرانے والوں کا انجام کتنا بھیانک ہوتا ہے۔“

”تم کل صبح کی بات کر رہے ہو جبکہ ابھی پورا دن اور پوری رات باقی ہے۔“

”کل صبح کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ دن بھر میں تمہارا حشر کروں گا۔“

”تمہیں خود پر اتنا غرور ہے۔ یقین ہے تمہیں کہ تم ہمیں قید رکھ سکو گے۔“

”بالکل! مجھے اس کے علاوہ اور کرنا کیا ہے؟“

میں نے اس بار کچھ بولنے کی بجائے ٹمچے کا رخ پنجرے کی جانب کیا اور ٹریگر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ ٹھک ٹھک دو گولیاں پنجرے کی سلاخوں میں لگیں مگر اسے نقصان پہنچائے بغیر دونوں گولیاں اچٹ کر گئیں۔

”بے کار ہے میرے مٹی کے شیر! یہ پنجرہ عام لوہے کا نہیں ہے۔ تم چاہو تو مزید فائر کر کے دیکھ سکتے ہو لیکن سلاخوں پر ہاتھ نہ رکھ دینا۔ سلاخوں میں کرنٹ دوڑنے والا ہے۔“

میں نے بے بس نظروں سے الفانسو کو دیکھا اور حسن آرا کی طرف بڑھا۔

”ٹھہرو!“ ویکٹر کی آواز گونجی۔ ”فائر کر کے تم اس لڑکے کو آزاد کر سکتے ہو مگر گولی سے تیز کرنٹ دوڑ رہا ہے۔ ادھر لہلی پر تمہاری انگلی دہری میں نے مٹن دبا یا۔ چند سیکنڈ۔ صرف چند سیکنڈ میں اس کا جسم کوئلہ بن جائے گا اس لیے کہ یہ کرنٹ عام نہیں ہے۔ ابھی بالکل نئی ایجاد ہے۔ یہ دھکے نہیں مارتی جلا کر کوئلہ کر دیتی ہے۔ چپک کی طرح چپکا لیتی ہے۔“

ویکٹر کی آواز نے میرے دل میں بھی دہشت پیدا کر دی۔ حسن آرا کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ موت کی آہٹ کتنی دہشت ناک ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا۔ جس پر گزرتی ہے، صرف وہی جانتا ہے۔

”کچھ کرو۔ مجھے آزاد کرانے کی کوشش۔ ہو سکتا ہے یہ کھوکھلی دھمکی ہو۔“ حسن آرا کی آواز میں خوف کا عنصر بہت زیادہ تھا۔

ابھی اس کا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایک چمک سی پیدا ہوئی حسن آرا کی بھیانک چیخ گونجی اور مجھ پر سکتہ ساطاری ہو گیا۔ میرا یار بن پانی کی مچھلی کی طرح بار بار اچھل رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ اس طرح لرز رہا تھا جیسے اسے کوئی پکڑ کر جھنجھوڑ رہا ہو پلک جھپکتے میں اس کا جسم سیاہ پڑ گیا۔ میرا جگر قربان ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر الفانسو بھی پتھرا گیا۔

”میں کھوکھلی دھمکی نہیں دیتا۔“ ویکٹر کی مکروہ آواز گونجی۔ ”موت کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایک کر کے تم سب کو اسی طرح مار دوں گا۔ شنو! سب سے بھیانک موت تمہاری ہوگی۔ تم ہی نے مجھے تباہ کیا ہے۔ الفانسو جیسے کئی لوگ آجاتے تو بھی اتنی جامع پلاننگ نہیں کر پاتے۔ یہ تمہارے ہی شیطانی دماغ کی پیداوار تھی جس نے مجھے دھچکا پہنچایا ہے۔ اس کا مزہ تمہیں ضرور چکھنا ہے۔ تم ہر ایک کی موت کا منظر دیکھو۔ مجھے صرف اس کا رنج ہے کہ تمہاری موت کا منظر صرف میں دیکھوں گا۔ اب تم الفانسو کا حشر دیکھو۔“

”ٹھہرو! الفانسو نے چیخ کر کہا۔

”موت سے ڈر گئے؟“ ویکٹر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”موت برحق ہے۔ ہر ایک انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ کھرا انسان کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ ہم تو پرنگال سے یہ سوچ کے نکلے ہیں کہ ہم موت پر جاگریں گے یا موت ہم پر آگرے گی۔“ پھر اس نے مڑ کر مجھ سے کہا۔ ”تمہیں اسی ملک کی قسم ہے اپنے مشن سے پیچھے نہ ہٹنا۔ اللہ حافظ!“ کہہ کر وہ ایک دم آگے بڑھا پھر گن کی نال سلاخ کے بالکل نزدیک لے جا کر گھوڑے پر دباؤ ڈالتا چلا گیا۔ تڑن کی آواز سے ہال گونج اٹھا۔

ویکٹر کی آواز سنائی دی۔ ”ان سلاخوں پر گولیاں بے اثر ہیں۔“

دیکھ یہ سلاخیں مڑ گئی ہیں۔“ الفانسو کی آواز میں خوشی کی چمک تھی۔ ”اب میں اسے توڑ کر ہی دم لوں گا۔“ کہہ کر اس نے پھر گھوڑا دبا یا مگر افسوس میگزین خالی ہو چکا تھا۔

”چیچ چیچ! یہ کوشش بھی بے کار گئی۔ اب میرا کمال دیکھو۔“ اس مردود کی آواز کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ چھٹا کا سا ہوا اور سلاخوں کے درمیان باریک تاروں سے بنا۔ ایک جال سا آگرا۔ اس جال کے گرتے ہی الفانسو کی دردناک چیخ گونجی۔ میں نے اسپیشل لینس والے چشمے سے جال میں دوڑتی ہوئی چنگاریوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس جال میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بہادر سپوت بھی موت کی گود میں جا سویا۔ فرنگی طاقت کو سرنگوں کرنے کی قسم کھا کر ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے والا شیر مرد مر گیا۔ میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

”شنو! تجھے معلوم ہے! تجھے اس سے بھی بھیانک موت ملے گی۔“ ویکٹر کی آواز سن کر میں سکتے کے عالم سے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیسی موت ملے گی جب ملے گی تو تمہارے الفاظ کو تول لوں گا کہ تم نے سچ کہا تھا یا جھوٹ۔ میرے مرنے

میں ابھی بہت وقت باقی ہے۔“

”کوئی وقت نہیں ہے۔“ ڈکٹر کا لہجہ پُر یقین تھا۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کمراموت کا کنواں ہے۔ اس سے رہائی کی ایک ہی صورت تھی کہ میں بھی عیاری سے کام لوں۔ میں نے جھک کر حسن آرا کے طمنچے کو اٹھایا جو اس کی جیب سے نکل کر فرش پر پھسل گیا تھا پھر میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور اللہ کا نام لے کر دوڑ لگا دی۔ کمرے سے باہر آ کر میں نے ایک نظردونوں سوختہ لاشوں پر ڈالی اور اس کمرے سے دور ہوتا چلا گیا۔ گزشتہ رات کی بھاگ دوڑ نے کمروں کے اس جنگل کا جغرافیہ بتا دیا تھا۔ اب یہاں ٹھہرنا بے وقوفی تھی۔ میں نے زندگی میں سب سے بڑی غلطی کر ڈالی تھی۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ زندگی کے لالے پڑ چکے تھے۔ زندگی بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اس عمارت سے باہر نکلا جائے لیکن باہر کیسے نکلا جائے؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیوں کہ گلیاں کی اس بھول بھلیوں میں پھنس کر میں اصل راستہ بھول چکا تھا۔ تبھی ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ پہلی منزل پر بنے کمروں کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں تھیں۔ اگر میں کھڑکی سے لان میں کود جاؤں تو بچ سکتا ہوں۔ اسی سوچ پر عمل کرنے کی ٹھان لی تھی۔

اوپر پہنچ کر میں نے سامنے والے دروازے کو دھکا دیا۔ اندر جا کر میں نے دروازہ بولٹ کر دیا پھر کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ باہر گارڈز کا جھوم تھا۔ سب کی نگاہیں بلڈنگ پر جمی ہوئی تھیں۔ انہوں نے گولیوں کا انجام دیکھ لیا تھا۔ ان کی گولیاں میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکی تھیں شاید اسی لیے اب ان کے ہاتھوں میں روایتی ہتھیار تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کلہاڑا تھا تو کسی نے تلوار اٹھا رکھی تھی۔ کوئی برچھا لیے کھڑا تھا۔ آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی اب میں کیا کروں؟ کھڑکی پر کھڑا میں یہی سوچ رہا تھا کہ ویکٹر کی آواز گونجی۔ ”کیا موت سے ڈر گئے؟“

”موت میرے لیے کھیل ہے۔“

”پھر رک کیوں گئے۔ کود جاؤ۔ بے چارے پہرے داروں کی حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔“

اس وقت مجھے الفانسو کی ایک اہم بات یاد آ گئی۔ ٹریگ کے وقت وہ ایک جملہ کہا کرتا تھا ”دشمن پر حملہ میں پہل کرو گے تو جیت تمہاری ہو گی۔ اس لیے کہ جتنا ڈر وگے دشمن اتنا ڈرائے گا جب اس پر پل پڑو گے تو وہ اپنی جان بچائے گا۔ یہ وقت بھی ایسا ہی تھا۔ نیچے دشمن تعداد میں زیادہ تھے اور میں اکیلا تھا مگر مجھے ان پر فوقیت حاصل تھی۔ میرے پاس ابھی دو ہتھیار باقی تھے۔ ان کے اسلحے مجھ پر اثر نہیں کرتے مگر میرے اسلحے ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوتے۔ میں نے کمر میں اڑ سے طمنچے کو ہاتھ پھیر کر محسوس کیا پھر کمر سے لٹکے جھولے کو ٹٹولا۔ اس جھولے میں کئی ایک ہتھ گولے تھے۔ ان گولوں کو الفانسو گریڈ کہتا تھا۔ ابھی تک میں نے اسے استعمال نہیں کیا تھا مگر استعمال کا طریقہ جانتا تھا کہ اسے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ چلتے وقت الفانسو نے ایک اور بم بھی دیا تھا جس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ صرف گاڑھا دھواں پھیلاتا ہے بس میں نے اسے پہلے استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا اور پھر قدرے اونچی اونچی آواز میں بولا۔ ”تم سب اپنی موت کے در پر کھڑے ہو۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو۔ یہ ویکٹر تم لوگوں کو مروانے کے لیے میرے مقابل لایا ہے۔“

اپنی بات ختم کر کے میں نے دھواں پھیلانے والا گولا ان پر کھینچ مارا۔ ہر طرف گاڑھا گاڑھا دھواں پھیل گیا۔ میں نے اس موقع کا فائدہ

اٹھانے کے لیے کھڑکی سے کودنے کی بجائے واپس کمرے کے دروازے کی طرف بھاگا اور دوسرے کمرے کی کھڑکی سے نیچے کود گیا۔ دھمک سے سب ادھر دوڑے۔ یقیناً پہلے وہ لوگ اس طرف منتظر ہوں گے اور اب ادھر دوڑ رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں نے آخری دھونیں والا گولا پھینکا۔ ادھر بھی دھواں پھیل گیا۔ ادھر سے وہ لوگ ادھر دوڑے۔ میں یہی چاہتا تھا۔ ادھر بھی دھواں ادھر بھی دھواں۔ وہ لوگ یقیناً الجھ گئے تھے کہ میں کہاں ہوں؟ وہ اندھوں کی طرح ناک ٹوئیاں کھارہے تھے کہ میں نے اس پیڑ کی طرف دوڑ لگا دی جس کی شاخیں دیوار تک پہنچ رہی تھیں۔

”وہ بھاگ رہا ہے۔“ کوئی چیخا تھا۔ مگر میں رکا نہیں اور دوڑتا چلا گیا۔ اس پیڑ تک پہنچا تھا اور کسی بندر کی طرح اچھل کر چڑھتا چلا گیا تھا۔ وہ سب ہوشیار ہوتے کہ میں نے الیکٹریک وائر جن میں بجلی دوڑ رہی تھی پھلانگ گیا۔ اتنی اوپر سے نیچے گرا۔ چوٹ تو لگی مگر میں رکا نہیں آگے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ موٹر پر میرا پیچھا کریں گے اسی لیے میں اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا۔

سڑک پر سے اکا دکا گاڑیاں چمکڑے گلیاں وغیرہ گزر رہی تھیں۔ اچانک میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں نے ایک گزرتے ہوئے ٹرک کو ہاتھ کا اشارہ دے دیا۔ میری توقع کے بالکل برخلاف ٹرک کی رفتار دھیمی ہو گئی اور کچھ دور آگے جا کر رک گئی۔ میں نے اپنی جگہ سے تیزی سے دوڑ لگائی اور بھاگتا ہوا ٹرک کے پاس پہنچ گیا۔

”اوئے کتھے جائے گا؟“ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

”آگے روڈ پر چھوڑ دینا۔“ میں نے دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔“

”آجا آجا۔“ اس شخص نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”آجا۔“ وہ خود سر کر اندر کی طرف ہو گیا اور اس نے میرے لیے جگہ بنا دی میں جلدی سے اچک کر ٹرک کے اندر سوار ہو گیا اور دروازہ بند کر کے ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

”اوئے کدھر سے آ رہا ہے اور کدھر جائے گا؟“ ڈرائیور نے ٹرک کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بس جی موٹر میں کبھی بیٹھے نہیں۔“ میں نے مسکینی کے ساتھ جواب دیا۔ ”دل کیا سو ہاتھ اٹھا دیا۔ پیدل شہر تک جانا پڑتا ہے۔“

”اوئے شادا بھئی شادا۔“ ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کیا سڑے کی زندگی ہے عیش ہی عیش ہیں۔“ سردار ٹرک ڈرائیور نے مذاق کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ ان دنوں موٹر گاڑی چلانا سکھوں کا پیشہ تھا۔ مسلمان کم کم اس نئے پیشے میں آتے تھے۔

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ میں زیادہ باتوں سے گریز کرنا چاہتا تھا بہر حال میں ان دنوں کا واقعی بے حد ممنون تھا کہ انہوں نے اس وقت میری مدد کی تھی جبکہ مجھے مدد کی شدید ضرورت تھی میں خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے آ جاتے۔

میں باہر کے مناظر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ ایک عرصے کے بعد میں ان مناظر کو دیکھ رہا تھا اور دل میں جیتے ہوئے دنوں کی یادیں لہریں لے رہی تھیں۔ دوسا تھیوں کے چمکڑ جانے کا غم بھی تھا۔ وہ دونوں ہی میرے لیے اہم تھے۔ بلکہ میرے دو بازو تھے۔ اب میں اکیلے کیسے ویکٹر کا مقابلہ

کروں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ٹرک رک گیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ہم مہندرو گھاٹ پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں سے مجھے بد آسانی تا نگدل سکتا تھا۔ میں نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور نیچے اتر آیا۔

☆.....☆

گھر پہنچا تو نور بیگم منتظر تھا۔ میں نے بھرائی آنکھوں سے اسے غم کی داستان سنائی دی۔ ایک کھرام سا اس نے چا دیا۔ کافی دیر تک رونا دھونا ہوتا رہا۔ مختار بھی اسے رونا دیکھ کر رونے لگا تھا۔ محلے کے کئی دوسرے بیچرے بھی غم کا سن کر آ گئے تھے۔

وہ دن بس رونے دھونے میں گزرا۔ مگر کہتے ہیں نا کہ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ زندگی کے ہنگامے خود اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ میں اپنے غم میں ڈوبا ہوا تھا کہ نور محمد آ گیا اس کے ساتھ شیر بہادر بھی تھا۔ اس نے کہا۔ ”شنو جو ہونا تھا ہو گیا اب ہم ان سب کا بدلہ لیں گے۔ پوری قوت سے ویکٹر پر حملہ کریں گے۔“

”مگر اس سے پہلے اپنی تیاری مکمل کرنا ہے۔ اس لیے کہ اب الفانسو نہیں رہا۔ صفدر کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے، وہ آزاد ہند فوج کے پیچھے دیوانہ بنا ہوا ہے۔ ہمیں نہ آزاد ہند فوج سے کچھ لینا دینا ہے اور نہ ہندوستان کی آزادی سے ہمیں تو بس مہناز کو آزاد کرانا ہے اور حسن آرا کا بدلہ لینا ہے۔ حسن آرا نے میری محبت میں میرے لیے جان دی ہے۔ میں اس کی قربانی رائیگاں نہیں جانے دوں گی۔“ میں نے جوش و جذبات میں مٹھیاں بھیج کر کہا۔

”ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ میرے بڑھاپے کا سہارا تم دونوں تھیں۔ ایک مر گئی تمہارا کوئی بھروسہ نہیں، اس لیے میں اب جی کر کیا کروں گی۔“ نور بیگم کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

”صفدر سے بات کرتے ہیں وہ کیا کہتا ہے۔“ میں نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ میں کچھ دیر سونا چاہتا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں لیٹ گیا مگر میری آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ ایک آگ سی بھڑک رہی تھی۔ اس آگ میں ویکٹر کو جلا نا تھا۔ میں اکیلا ہو گیا تھا مگر ویکٹر بہت طاقتور تھا۔ اس کے پاس قوت تھی۔ میں تہی دست تھا۔ اس کے پاس لوگ تھے۔ میں اکیلا تھا۔ مگر میرے پاس جوش تھا جذبہ تھا۔ اب میرے پاس ایک ہی کام تھا۔ ویکٹر کی تباہی۔ اسے ہر حال میں ختم کرنا تھا۔

میں نے صفدر کو خبر بھجوا دی تھی مگر وہ ابھی تک آیا نہیں تھا۔ اگر وہ انکار کر دیتا تو کیا ہوتا؟ میں اسی سوچ میں تھا کہ نور بیگم نے آ کر خبر دی کہ صفدر آیا ہے۔ میں باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔ شاید اسے بھی الفانسو کے مرنے کی خبر مل گئی تھی۔ مختار بھی سر جھکائے برابر میں بیٹھا تھا۔ اس کی بھی شوخی ہوا ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ وہی حسن آرا سے لڑتا تھا مگر اب وہی سب سے زیادہ غمگین تھا۔ جب سے اس نے خبر سنی تھی وہ روئے جا رہا تھا۔ اب جا کر چپ ہوا تھا مگر چہرہ بتا رہا تھا کہ اب بھی اس کا دل رورہا ہے۔ میں نے صفدر کے برابر میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟ مہناز کی کوئی خبر ملی؟“

”نہیں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”کیا کرنا ہے؟ کچھ سوچا ہے؟“

”میرا ذہن ماؤف ہے۔ اب تک میں الفانسو کے کہنے پر چل رہا تھا۔ اب وہ نہیں رہا تو اب تم بتاؤ کیا کرنا ہے؟“

”میں ایک بات جانتا ہوں مجھے نہ آزاد ہند فوج سے کچھ مطلب ہے نہ آزادی ہند سے۔ یہ سب بڑے لوگوں کے کام ہیں۔ مجھے تو بس مہناز سے مطلب ہے۔ اسے کسی بھی طرح آزاد کرانا ہے۔“

”مہناز میری بہن ہے۔ مجھے بھی اس کی فکر ہے مگر یہ بھی تو سوچو کہ میرے ابو کا ایک خواب تھا اس لیے اسے بھی چھوڑ نہیں سکتا۔“

”صنذر میاں تمہاری بات سو فیصد صحیح ہے مگر قائد اعظم کے نام سے جو شخص ابھر رہا ہے اس کا کہا سن رہے ہو؟“

”وہ ہندو اسیوں میں تفرقہ پھیلا رہا ہے۔ ہم اہل ہند ان جیسے لوگوں کے جال میں نہیں آنے والے۔ اس ہند پر ہمارا حق ہے۔ ہم نے یہاں آٹھ سو سال سے زیادہ حکومت کی ہے۔ اس پر ہمارا حق ہے۔ ہم کلڑا کیوں لیں۔ سارا ہندوستان ہمارا ہے۔“ صنذر کی آواز میں جوش تھا۔

”تم نے گاندھی کی باتیں سنی ہیں۔ وہ کتنی چالاکی سے مسلمانوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہ ہندو کبھی بھی مسلمانوں کو ان کا حق نہیں دینے والے ہیں۔ میں گھر گھر گھومتا رہا ہوں۔ ان کی ذہنیت کو تم سے بہتر جانتا ہوں۔ یہ ہند کی سر زمین کو مسلمانوں کے خون سے سرخ کر دیں گے مگر ایک انچ زمین نہیں دیں گے۔“

”یہ الزام ہے۔ تم دیکھنا ہم انگریزوں کو یہاں سے بھاگ کر کس طرح حکومت کرتے ہیں۔“

”یہ بحث لمبی ہے۔ اس لیے کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے۔ مہناز تک کس طرح پہنچا جائے؟“

”تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے تو بتاؤ؟“

”میرا خیال ہے کہ ویکٹر کو اس کے قلعہ نما گھر سے باہر لاتے ہیں۔ پھر اس سے نمٹا جاسکتا ہے۔“

”کوئی پلان؟“

”تم بھی سوچو شاید کوئی راہ بھائی دے جائے۔“

”اس کے تمام دوست کنگال ہو چکے ہیں اس کے انکم کا راستہ بند ہو چکا ہے۔“

”یہی وقت ہے جب وہ رقم کے لیے مجبور ہو کر باہر نکلے گا۔ اور ہم اسے چھاپ لیں گے۔ یوں بھی جرمنی کو شکست ہو چکی ہے۔ جاپان

اپنے زخموں سے ابھر نہیں پا رہا ہے۔ اس کے دو شہر ہیر و شیمہ اور ناگاساکی کھنڈر بن چکے ہیں۔ اس خوشی میں اتحادی جشن منا رہے ہیں۔ وہ ویکٹر جیسے ایجنٹوں کو بھول چکے ہیں۔“

”بات سہی ہے مگر وہ ان کا خاص ایجنٹ ہے۔“

”ایام جنگ میں ایجنٹ بنائے جاتے ہیں مگر جنگ ختم ہوتے ہی انہیں بھلا دیا جاتا ہے۔ یہ بات الفانسو نے بتائی تھی۔ وہ ان باتوں کو

اچھی طرح جانتا تھا۔ کہا کرتا تھا، اگر مجھ پر کوئی برا وقت آیا تو میری حکومت بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر دے گی۔ یہی ہوتا ہے۔ یہی دنیا کی بساط سیاست پر ہوتا آیا ہے۔“

”جیسوال کی باقیات پر حملہ کرتے ہیں وہ اسے بچانے ضرور آئے گا اور ہم اسے چھاپ لیں گے۔“

”چلو یہ بھی کر دیکھتے ہیں۔“

”مگر میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی ہے کہ تم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہو اس کا صرف مانگنے اپنا پیٹ پالنے سے مطلب ہوتا ہے۔ تمہیں ہم لوگوں سے اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی؟ کیوں ہماری بہن کے لیے اس قدر پریشانی اٹھا رہے ہو؟“ اس کی بات نے میرے اندر زلزلہ سا پیدا کر دیا۔ میں کتنا مجبور تھا کہ اسے حقیقت بھی بتا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے میں نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔

”صرف انسانی ہمدردی!“

”اچھا؟ اس نے ایسے کہا جیسے مذاق اڑا رہا ہو۔ مجھے انداز پسند نہیں آیا تھا اس لیے میں نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے کہا:

”یہ بتاؤ نور محمد وغیرہ سے رابطہ ہے؟“

”ارے تمہیں اتنی بڑی بات کا علم نہیں؟“

”کیا؟“

”نور محمد بھی مارے گئے۔ شہادت پورہ واقعی شہادت پورہ بن گیا ہے۔ لگتا ہے وہ علاقہ مسلمانوں کو اس نہیں آ رہا ہے۔ تقریباً دو سو سے زیادہ افراد شہید ہو چکے ہیں کیوں کہ وہاں کے کئی ہندو پولیس کے لیے مخبری کر رہے تھے۔“

”یہ تو ان کی آبائی فطرت ہے۔ ہند میں جتنے بھی زخم مسلمانوں کو لگے ہیں وہ صرف اور صرف ہندوؤں کی وجہ سے لیکن بدنام مسلمان ہوئے۔ میر جعفر کے پیچھے سینٹھ رام تھا۔ میر صادق کے پیچھے مراٹھا تھے۔ اسی طرح 1857 میں بھی دیکھ لو۔ بہت سارے نام مل جائیں گے۔“

”تم تو بس نفاق کی ہی باتیں کرتے رہتے ہو۔“

”میری زندگی بھی تباہ کرنے میں ایک نہیں کئی ہندو کا ہاتھ ہے۔ میں کوئی پیدائشی زنجیر نہیں ہوں۔ مجھے اغوا کر کے بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ تو بھلا ہونور بیگم کا جس نے مجھے بچانے کے لیے نقلی زنجیر بنا رکھا ہے۔“ میں نے آنکھوں میں بھر آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

ہماری باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ایک آدمی اندر آیا۔ وہ حد سے زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس کا تعلق آزاد ہند فوج سے جڑنے والا تھا کہ سہاش چندر بوس اور اس کے تمام ساتھی روپوش ہو گئے۔ یہاں جو لوگ تھے وہ اب چھپتے پھر رہے تھے اس لیے اسے ہم سب خود سے قریب سمجھتے تھے کہ وہ

ہمارا ہی تو ساتھی ہے۔ آزادی کے لیے لڑنے والا۔ کئی معرکوں میں بھی وہ ساتھ رہ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھ کر میں نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے؟ کیا ویکٹر چڑھ دوڑا ہے؟“

”خیریت ہی تو نہیں ہے۔ دو تین روز پیشتر مشرقی بنگال کے شہر نواکھالی میں مسلمان رعیت نے ہندو زمینداروں کے گھر لوٹ لیے تھے۔“

آج اس بات کی آڑ لے کر کلکتہ شہر میں مسلمانوں پر حملے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ شہر باہر کے غریب لوگوں کا مسکن ہے۔ دوسرے شہروں سے مزدوری کی تلاش میں جانے والے لوگوں کو فٹ پاتھ ہی پر جگہ ملتی ہے۔ ایسے لوگوں کو قتل کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ کلکتہ شہر مسلمانوں کا قتل بن گیا ہے۔“

”لیکن کلکتہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔“

”تو کیا ہوا متعصب ہندو تو یہاں بھی ہیں۔ ہندو مہاسبھا اور آریس ایس والے زہرا گلنا شروع کر چکے ہیں۔ یہاں کا ماحول بھی خراب ہو سکتا ہے۔“

”یہ بات صفدر کو سمجھاؤ جو ان لوگوں کو دوست سمجھتا ہے۔“

”غلط سوچ رکھنے والے کیا مسلمانوں میں نہیں ہیں۔ ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں مہاسبھائی ہیں تو مسلمانوں میں بھی اسلامی اقتدار کے حامی ہیں۔ مسلم لیگ والے ہیں جو بیاگ دہل کہہ رہے ہیں ہندو مسلم دو الگ قومیں ہیں اور الگ ملک چاہیے۔ مسٹر جناح کی باتوں کو غلط قرار دینے والے مولانا حسین احمد مدنی بھی ہیں مولانا محمد علی جوہر بھی ہیں۔ یہ لوگ بھی مسلمان ہیں لیکن کیسی لبرل باتیں کرتے ہیں۔“ صفدر نے اپنی منطق دی۔

مجھے اس کی بات پر غصہ آرہا تھا۔ کچھ بولتا کہ ایک دوسرا آدمی آگیا اس نے کہا۔ ”ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ویکٹر نے حویلی چھوڑنے کی تیاری شروع کر دی ہے۔ میرے آدمی اس کی نگرانی کر رہے ہیں ضرورت پڑی تو تعاقب بھی کریں گے۔“

”ارے اتنی جلدی؟ کہاں منتقل ہو رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ پٹنہ سے کلکتہ منتقل ہو رہا ہے۔ پتہ یہ چلا ہے کہ اسے دلی سے کوئی اطلاع ملی ہے جس پر وہ بڑی جلدی میں نکل رہا ہے۔“ اسی آدمی نے کہا۔ وہ الفانسو کا خاص آدمی تھا۔ آخری بار جب ہم سب جمع ہوئے تھے۔ جب یہ بات طے ہوئی تھی کہ اگر الفانسو کو کچھ ہو جاتا ہے تو اس کے تمام آدمی میری مدد کریں گے اس وقت یہ بھی تھا۔ تب سے یہ میری بھرپور مدد کر رہا تھا۔ جب کہ اس کے کچھ لوگوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ہم کسی مذہب کے کوآپرائیڈر نہیں بنا سکتے۔ وہ لوگ اپنے طور پر الگ گروپ بنا کر میدان میں آگئے تھے۔

مجھے ان سے کوئی گلہ بھی نہیں تھا کیوں کہ میں ان کی لڑائی لڑ نہیں سکتا تھا۔ مجھے انگریزوں کو بھگانے۔ ہندوستان آزاد کرانے کی مہم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جو لوگ میرے ساتھ تھے ان سے میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے صرف ویکٹر سے بدلہ لینا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی مطلب نہیں ہے۔ اگر تم لوگ میری لڑائی میں میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو بسم اللہ ورنہ کوئی گلہ نہیں میں اکیلے ہی بدلہ لے سکتا ہوں۔

یہ نو جوان اسلم مسلمان بھی تھا اور اسے مسلمانوں سے ہمدردی بھی تھی۔ اسلم صرف آزاد ہند فوج کے اعلیٰ افسران یعنی لفٹننٹ کرنل ایم زیڈ کیانی۔ کرنل عزیز احمد۔ کرنل احسان قادر۔ کرنل شہباز خان کی وجہ سے آزاد حکومت کا حامی بن گیا تھا کہ اس حکومت میں غیاثی شہناش کے ساتھیوں میں مسلمان بھی ہیں۔ میں نے اس کی بات سن کر کہا ”تم جا کر اس پر نظر رکھو ہم آرہے ہیں۔“

اسے بھیجنے کے بعد میں نے پینٹ بوشرٹ پہنی اور صفدر کو ساتھ لے کر نکل پڑا۔ اب ساڑھی بہت کم پہنتا تھا اس لیے کہ اب میں نئی زندگی

جینا چاہتا تھا۔ اتنے پیسے موجود تھے کہ مجھے بھیک مانگنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ نور بیگم بھی اب آرام پر زیادہ توجہ دینے لگا تھا۔ حسن آرا کے بعد وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے باہر آ کر پوچھا۔ ”اس کے نئے مکان تک جانے کے لیے کیا لیا جائے؟“

”گھوڑے مناسب رہیں گے۔“

”گھوڑے.... تم خود انتظام کرو۔ تمہاری حویلی میں تو ہیں وہاں سے لانا پڑے گا۔“

صحیحی سامنے سے آتا ایک کھڑکھڑا نظر آیا۔ کھڑکھڑا عام طور پر سامان ڈھونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مگر لوگ اس کو سواری میں بھی استعمال کر لیتے ہیں اسی لیے میں نے اسے رکنے کا اشارہ دیا۔ وہ رک گیا۔

”کیوں بھائی سواری بٹھاؤ گے؟“

”ضرور۔“ اس کے کہتے ہی ہم سوار ہو گئے۔ اس کھڑکھڑے پر کوچوان کے ساتھ ایک اور آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے سر پر سکھوں والی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ کوچوان نے اسے کرتار کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ دونوں نیچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا دماغ ویکٹر میں الجھا ہوا تھا اس لیے ان کی باتوں پر توجہ نہ دے سکا۔ اور آگے چل کر یہی ایک بڑی غلطی ثابت ہوئی۔

ابھی ہم راستے ہی میں تھے کہ مخالف سمت سے اسلم آتا ہوا نظر آیا وہ تانگے پر سوار تھا۔ کھڑکھڑا کھلا ہوا ہوتا ہے اس لیے دور ہی سے اس پر بیٹھے ہوئے لوگ نظر آ جاتے ہیں۔ اس نے بھی ہمیں دور سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ میں نے کھڑکھڑے والے سے رکنے کے لیے کہا۔ تب تک تانگہ بھی نزدیک آ چکا تھا۔ جیسے ہی میں کھڑکھڑے سے نیچے اترا اسلم بھی تانگے سے کود کر نیچے اتر چکا تھا۔ اس نے نزدیک آتے ہی سرگوشی میں کہا۔ ”ویکٹر اپنی حویلی سے نکل کر سٹی اسٹیشن کے قریب ایک مکان میں جا چکا ہے۔ میرے آدمی اس مکان کی نگرانی کر رہے ہیں۔ بارہ بجے والی گاڑی سے وہ کلکتہ جا رہا ہے۔ اس کا ٹکٹ بن چکا ہے۔ فرسٹ کلاس میں اس نے نشست حاصل کی ہے۔“

”فوراً دو ٹکٹ کا انتظام کرو۔“ میں نے روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں دیئے۔ ”میں گلزار باغ سے سوار ہوں گا۔ تاکہ دیکھ سکوں کہ وہ کس

ڈبے میں سوار ہو رہا ہے۔“

”وہ گاڑی گلزار باغ میں نہیں رکے گی۔ اگر آپ پہلے سوار ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو بانگی پور جنکشن سے سوار ہونا پڑے گا۔ وہ انگریز ہے

اس لیے فرسٹ کلاس میں ہی جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور واپس کھڑکھڑے کی طرف چل پڑا۔

کھڑکھڑے پر سوار ہو کر میں نے کوچوان سے کہا۔ ”بھائی اب ہمیں بانگی پور ریل اسٹیشن جانا ہے۔ وہاں پہنچا دو۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

پیسے بھی زیادہ دوں گا۔“

کوچوان نے گھوڑے کو چابک مار کر کہا۔ ”جہاں بولو صاحب ہم وہاں لے چلیں گے۔ ہمیں تو مزدوری سے مطلب ہے۔ ویسے بھی ہم

بانگی پور ہی جا رہے تھے۔“

”کیا بات ہے۔ اسلم نے ایسا کیا بتایا کہ تم نے راستہ بدل لیا؟“ صفدر نے پوچھا۔

”وہاں چل کر بتاؤں گا۔“ کہہ کر میں نے ہاتھ سے کوچوان کی پیٹھ کی طرف اشارہ کیا۔ صفدر سمجھ گیا کہ میں کوچوان کی موجودگی کی وجہ سے

گریزاں ہوں۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔

اچانک ایک موٹر پر نہ جانے کس طرف سے ایک گھڑسوار نمودار ہوا جو پولیس کی وردی میں تھا۔ اس نے کھڑکھڑے کورکنے کا اشارہ کیا۔

کوچوان کے ساتھی نے جس کا نام کرتا تھا ایک دوسرے کی طرف پریشانی کے ساتھ دیکھا اور پھر کھڑکھڑے کوسائیڈ میں لگانے لگا۔

”کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟“ میں نے ان لوگوں سے کہا۔ ”یہ لوگ خواہ مخواہ ہی لوگوں کو ستاتے ہیں۔“

”لوجی ان کی سنو۔ پولیس والے بھی اب ستانے لگے۔“ کرتار نے میری طرف دیکھتے ہوئے کوچوان سے کہا۔ ”اس کو یہ بھی معلوم ہے

کہ پولیس اب عوام کی خیر خواہ نہیں رہی کمال ہے؟“

”تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟“ میں نے فوراً معاملے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

اسی اثنا میں کوچوان نے کھڑکھڑے کوسائیڈ میں لگا دیا تھا اور اسی وقت پولیس کی ایک جیپ نہ جانے کس طرف سے نمودار ہو گئی تھی۔

معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ جیپ اور خود گھڑسوار کہیں قریب ہی موجود تھے اور شاید گلیوں وغیرہ میں چھپے ہوئے تھے اور اب ان لوگوں نے کھڑکھڑے کو روک لیا تھا۔ پولیس والوں نے کھڑکھڑے کو گھیر لیا۔

”اے کی چکر ہے کرتارے؟“ کوچوان نے پریشان نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کرتار خود بھی اس صورت حال

سے کافی سراسیمہ نظر آ رہا تھا۔

”چلو سب لوگ نیچے اترو۔“ ایک پولیس والے نے قریب آ کر ہمیں حکم دیا اور ہم تینوں نیچے اتر آئے فوراً ہی پولیس والے کھڑکھڑے

کے سامنے والے حصے میں گھس گئے جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے وہاں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔

بالکل سامنے ہی کپڑے کا ایک بڑا سا لیکن پرانا اور بوسیدہ تھیلا پڑا ہوا تھا ایک پولیس والے نے اس تھیلے کو اٹھایا اور اسے کھول کر اس میں

جھاکنے لگا۔

”لے بھی صاحبو اپنے سامان کی خیر منگ؟“ اچانک کرتار نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں ہے آپ کے تھیلے میں؟“

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ نہ تو یہ تھیلا میرا تھا اور نہ اس سے میرا کوئی تعلق تھا پھر وہ مجھ سے کیوں پوچھ رہا تھا کہ اس

تھیلے میں کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں ہے۔ صفدر کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا تھا۔

قبل اس کے کہ میں اس کی اس مکارانہ چال کو سمجھ سکوں سپاہی نے تھیلے میں سے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس

ڈبے میں کوئی کالا کالا سا حلوہ بھرا ہوا تھا۔

”اوائے یہ کی بھر رکھا ہے تھیلے میں صاحبو؟“ کرتار نے فوراً میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”افیم معلوم ہوتی ہے۔“ سپاہی نے وہ پیکٹ افسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ایسے بہت سے پیکٹ اس تھیلے میں موجود ہیں۔“

”یہ تھیلا میرا نہیں ہے۔“ ایک لمحے کے اندر اندر کرتار کی ساری شاطری اور عیاری میری سمجھ میں آ گئی اور اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ

بیروں میں سنسنی سی دڈڑنے لگی۔ میں ایک نئے چکر میں پھنس گیا تھا۔ ”میں چلتا ہوں۔“

”اوائے کتھے چلے؟“ کرتار نے آگے بڑھ کر جلدی سے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن اسے زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ داروغہ

کے اشارے پر ایک سپاہی نے میرا بازو پکڑ لیا تھا اور مجھے جانے سے روک دیا تھا۔

”افیم ہے؟“ داروغہ نے ڈبے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور قبر بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

”مگر یہ سامان میرا نہیں ہے۔“ میں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ ”میرے پاس تو کچھ نہیں ہے یہ تھیلا تو پہلے سے

موجود تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”اوائے اوائے یہ کیا بکواس ہے؟“ کوچوان آنکھیں نکال کر مجھ پر بری طرح غرایا۔ ”تجھے ہم نے کھڑکھڑے میں جگہ دی اور تو اس تھیلے

کے ساتھ سوار ہوا۔ اب یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سامان تیرا نہیں ہے۔ اوائے شرم نہیں آتی تجھے؟“

”میری بات کا یقین کیجیے۔“ میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں یہ سامان ان کا ہے میرا ہرگز نہیں ہے۔“ میں

نے دل ہی دل میں کہا۔ کبھی کبھی مینڈک بھی اچھل کر ہاتھی کولات مارتا ہے۔ یہی اس وقت ہو رہا تھا۔

اس وقت کچھ فاصلے پر لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا اور وہ یہ تماشا دیکھ رہے تھے لیکن مجھے اس مجمع کی پروا نہیں تھی اور میں اس کی طرف

متوجہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس نئی اور غیر متوقع آفت کے بارے میں سوچ رہا تھا جس میں اچانک پھنس گیا تھا۔ مجھے اسٹیشن پہنچنے کی جلدی تھی اور یہ

آفت آپڑی تھی۔

”میں نے تجھ سے کئی بار کہا ہے کہ راہ چلتے لوگوں کو مت بٹھایا کرو۔“ کرتار نے گرج کر کوچوان سے کہا۔ ”مگر تو تو میری بات سنتا ہی

نہیں۔ بڑا انسانیت کا ہمدرد بنتا پھرتا ہے اب دیکھ لینا انسانیت کا انجام؟ شریفوں کے بھیس میں ٹھہرے گھومتے پھرتے ہیں تم نے اس پر ترس کھایا

اور اس نے اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دیا۔“

”بکواس بند کرو۔“ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اور غم و غصے کے عالم میں میری بری حالت ہو رہی تھی۔ ”تمہیں شرم نہیں آتی جھوٹ

بولتے ہوئے ایک شریف آدمی پر گندے الزامات لگاتے ہوئے۔“

”چل چل ادھر سے۔“ ایک سپاہی نے گدی سے پکڑ کر مجھے آگے کی طرف دھکا دیا اور جیپ کی جانب دھکیلا۔ ہم چاروں کو باری باری

پولیس کی جیپ میں بٹھادیا گیا اور ڈرائیور کے علاوہ تین سپاہی بھی کسی نہ کسی طرح گھس کر بیٹھ گئے۔

جمع اب بالکل قریب آ گیا تھا۔ وہ پولیس کی جیپ سے صرف ذرا سی دور کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور پھر جیپ وہاں سے چل

پڑی۔ راستے میں کرتار نے پھر مجھے گالیاں دینا شروع کر دیں لیکن ایک سپاہی نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

”اوئے چپ کر کے بیٹھارہ۔“ اس نے کہا۔ ”زیادہ معصوم بننے کی کوشش مت کر۔ تھانے چل کر سب کچھ معلوم ہو جائے گا کون اصل مجرم ہے اور یہ مال کس کا ہے آخر یہ مال تم لوگوں کے کھڑکھڑے میں سے برآمد ہوا ہے۔“

کرتار اسہم کر خاموش ہو گیا۔ سپاہی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مال تو آخر انہی لوگوں کے کھڑکھڑے میں سے برآمد ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگوں کو علاقے کے تھانے میں پہنچا دیا گیا ہم پولیس والوں کی معیت میں جیپ سے اترے اور ہمیں ایک کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ہم تینوں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے کھڑے تھے۔

اس کے کچھ دیر کے بعد پولیس افسر کمرے میں داخل ہوا یہ وہی پولیس افسر تھا جس کی نگرانی میں ٹرک پر چھاپہ مارا گیا تھا۔ ”کب سے دھندہ کر رہے ہو تم لوگ؟“ افسر نے اپنا ہینڈ آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کہاں سے مال لا رہے تھے؟ کہاں لے جا رہے تھے؟“

”واہے گرو کی سوں۔“ کرتار نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے جھوٹی قسم کھا کر کہا۔ ”ہمارا اس مال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تو اس کو بٹھا کر پھنس گئے۔ پیدل چل رہا تھا بے چارہ ہم نے شریف سمجھ کر اسے ساتھ بٹھالیا۔ یہ تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے اسے سامنے والے حصے میں رکھ لیا۔ ہم نے تو تھیلے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ہمیں تو معلوم بھی نہیں کہ اس کے اندر کیا تھا۔“

”کیوں بے؟“ افسر نے قہر بھری نظروں سے مجھے گھورا۔ ”شرم نہیں آتی حرام خور..... شریفوں کے بھیس میں منشیات کا دھندہ کرتا ہے۔“

میں نے ایک بار پھر گڑگڑا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑے عاجزانہ اور خوشامداندہ انداز میں اپنی بے گناہی کا اظہار کیا اور یہ بات دہرائی کہ میرا اس تھیلے سے کوئی تعلق نہیں۔ افسر بڑی کڑی اور کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔

”کیس تم سب کے خلاف بنے گا۔“ افسر نے کرتار اور کوچوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مال تمہارے کھڑکھڑے میں سے برآمد ہوا ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ مال اس کا تھا تو بھی تم لوگ بچ نہیں سکتے اور تمہارے لیے عدالت میں یہ ثابت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا کہ یہ مال تمہارا نہیں ہے سمجھ رہے ہو میری بات کو؟“

”جی صاحب جی! کرتار کا فیصلہ ہم نہیں عدالت کرے گی۔“

افسر نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”ہمارا کام تو کیس بنانا ہے ہم تمہارا چالان تیار کر کے عدالت میں پیش کر دیں گے۔ مال تو برآمد ہو ہی چکا ہے۔“

”ایسا نہ کریں صاحب جی!“ کوچوان نے جلدی سے کہا۔ ”کیس اگر ایک بار بن گیا تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی۔ ہمارے حال پر رحم کیجیے صاحب! بال بچے دار آدمی ہیں پردیس میں ہیں آپ چاہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں؟“ افسر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”افیم کی اسمگلنگ کا کیس ہے کوئی مذاق تو نہیں ہے۔“

تھی ایک سپاہی میرے نزدیک آکر سرگوشی میں بولا۔ ”صاحب جی ادھر آکر میری بات سن لیں۔“

میں اس کی بات پر متوجہ تھا ہی فوراً اس کے ساتھ باہر برآمدے میں آگیا۔ اس نے نزدیک ہو کر کہا۔ ”صاحبو! ہم لوگ جانتے ہیں۔ آپ لوگ ان کے ساتھی نہیں ہو۔ ہم کئی روز سے ان کے پیچھے لگے ہیں۔ آج بھی جب یہ مال لے کر چلا ہم ساتھ ساتھ چلے۔ گھوڑے پر پیچھے پیچھے جو آدمی چل رہا تھا وہ ہمارا سپاہی بھائی تھا۔ آپ لوگ کوکھڑ کھڑے پر چڑھتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے مگر دروغہ صاحب ایسے نہیں مانیں گے۔ آپ اگر اس مسئلہ سے ٹکنا چاہتے ہو تو پچاس روپیہ دینا پڑے گا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ جانے کی اجازت بھی مل جائے گی۔“

پچاس روپے ایک بڑی رقم تھی مگر حالات کا تقاضہ تھا کہ اس کی بات مان لیں اور میں نے دس دس کے پانچ نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے، اس نے اندر جا کر کچھ کہا۔ داروغہ نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

اجازت ملتے ہی ہم تھانے سے باہر آگئے۔ باہر آتے ہی ایک خالی تانگہ نظر آگیا اور اس پر ہم سوار ہو گئے۔ راستے میں صفدر نے ہنس کر کہا۔ ”کچھ دیر کے لیے ہی صحیح مگر اچھی تفریح رہی۔“

”میاں ابھی تفریح کہہ رہے ہو۔ کچھ دیر پہلے ہوا سر تھی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”بات صحیح ہے۔ میں تو گھبرا ہی گیا تھا کہ یہ کیا آفت آپڑی۔“

باتوں کے دوران پتہ ہی نہیں چلا اور ہم بائگی پورا اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

اسٹیشن پر یہاں سے وہاں تک لوگوں کا اڑدھام تھا۔ ہم تانگے سے اترے اور مسجد کی طرف چل پڑے۔ مجھے یقین تھا کہ اسلم ٹکٹ لے کر ادھر ہی آئے گا۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ بڑی آسانی سے مل جاتا ہے اس لیے میں پر امید تھا۔

جیسے ہی مسجد کے پاس پہنچا اسلم نظر آگیا وہ پہلے سے ہی کھڑا راہ دیکھ رہا تھا۔ تانگہ جلدی پہنچ جاتا ہے نا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے ٹکٹ لے کر کہا کہ وہ واپسی میں نور بیگم کو بتا دے کہ میں دودن کے لیے بہار شریف جا رہا ہوں۔ بابا مخدوم شاہ کے مزار پر وہ پریشان نہ ہو۔ جب وہ مڑنے لگا تو میں نے کہا ”اور سن حویلی بھی چلے جانا“ جا کر انا بوا کو بھی کہہ دینا کہ صفدر شتو کے ساتھ بہار شریف گیا ہے۔ کل آجائے گا۔“

دراصل مجھے امید تھی کہ میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔ صرف ویکٹر سے نمٹنا ہی تو تھا۔ جیسے ہی گاڑی پنڈت سٹی اسٹیشن سے نکلتی میں اسے گھیر لیتا۔ دودو ہاتھ کر کے بختیار پور میں اتر جاتا اور واپسی کی گاڑی پکڑ لیتا۔

اسلم واپس چلا گیا۔ صفدر کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ طوا کر لبا جا رہا ہے۔ اس کا ارادہ کچھ اور ہوگا۔ مگر میں تو قسم کھائے بیٹھا تھا کہ کسی بھی طور پر ویکٹر کو جانے نہیں دوں گا۔ اسے اس کی اوقات بتا کر مہنا کو برآمد کرنا ضروری ہے۔ برآمد کر کے رہوں گا۔

اسلم کو وداع کر کے ہم اندر کی طرف بڑھے۔ پلیٹ فارم پر بھی بھیڑ تھی۔ ابھی ہم پلیٹ فارم پر پہنچے ہی تھے کہ گھنٹی کی ٹن ٹن سے پلیٹ فارم گونج اٹھا۔ یہ اشارہ تھا کہ گاڑی آرہی ہے۔ یہ گاڑی مغل سرائے سے چلتی تھی اور کلکتہ تک جاتی تھی۔ ہمیں اسی گاڑی سے جانا تھا۔ جیسے ہی گاڑی

پلیٹ فارم پر پہنچی، بھینڑ اس کی طرف دوڑی۔ میں بھی فرسٹ کلاس کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ ادھر بھینڑ نہیں تھی۔ میں بڑے آرام سے اندر جا کر ایک کوپے میں بیٹھ گیا۔ اس دور میں اس قسم کے ڈبے کو سلون کہتے تھے اور اس میں انگریز افسر یا راجا مہاراجا ہی سفر کرتے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد گاڑی چلی۔ اگلا ہی اسٹیشن پٹنہ ٹی کا تھا۔ یہیں سے دیکٹر کو سوار ہونا تھا۔ میں کوپے کی کھڑکی سے لگا باہر جھانک رہا تھا۔ تبھی مجھے وہ نظر آ گیا۔ خبر سو فیصد درست تھی۔ وہ تیزی سے اسی کوپے کی طرف آ رہا تھا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل اٹھی۔ شکار خود چل کر شکاری کے پاس آ رہا تھا۔ وہ جلد بازی میں سوار ہوا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ایک سامان اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے سامان اندر رکھا اور نیچے اتر گیا۔ یہاں گاڑی کچھ ہی دیر رکتی تھی اس لیے وہ جلد بازی سے کام لے رہا تھا۔

اس کے ساتھ آئے دونوں آدمی نیچے جا کر کھڑے تھے۔ لیکن جیسے ہی گاڑی چلی ایک آدمی اوپر چڑھ آیا گو یا وہ دونوں جا رہے تھے۔ ویکٹر اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ اس کے معنی یہی تھا کہ وہ بھی کوئی اہم بندہ تھا۔ میں اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا قد آور شخص تھا۔ اس کے بازو کی مچھلیاں بوشرٹ کی آستینوں سے جھانک رہی تھیں۔ بھینڈا وہ پابندی سے ورزش کیا کرتا ہوگا۔

وہ دونوں اپنے کوپے میں چلے گئے۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ میں نے صفدر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور آہستہ سے بولا ”میں ذرا ان دونوں کو دیکھ آؤں۔“

میں اس کے کوپے کی طرف بڑھتے ہوئے دیگر کوپے پر بھی نظر ڈال رہا تھا۔ تقریباً سب خالی تھے۔ فرسٹ کلاس میں یوں بھی کم کم لوگ ہی سوار ہوتے ہیں۔ میں نے اس کے کوپے کے دروازے پر پہنچ کر دھکا دیا دروازہ اندر کی طرف کھل گیا، دونوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پینٹ شرٹ میں بھی ویکٹر نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کی پرچھائیں صاف نظر آئی تھی۔ ”تم تم۔“ وہ صرف اتنا ہی بولا تھا کہ میں نے کہا۔

”ہاں میں تمہاری موت۔“

”تم زندہ بچ کر نہیں جاسکتے۔“ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”زندگی اور موت کا فیصلہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم نے اپنے قلعہ نما مکان میں بھی یہی پیش گوئی کی تھی۔ مگر میں آج بھی زندہ ہوں بلکہ تمہاری موت بن کر آ گیا ہوں۔“

میں اس سے باتیں کر رہی رہا تھا کہ اس کے ساتھی نے بغیر کوئی اشارہ دیے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے ایک دم سے مجھے دھکا مار کر دیوار کی طرف اچھال دیا تھا۔ میں غیر شعوری طور پر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام نہ لیتا تو میری کھوپڑی چٹخ جاتی۔ میں زوردار آواز کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا تھا اور فرش پر گر گیا تھا۔

مجھے خاصی چوٹ آئی تھی مگر اتنی شدید بھی نہیں تھی کہ میں اٹھ نہ سکتا پھر بھی میں فرش پر پڑا رہا، وہ اپنے طاقت کے زعم میں میری طرف بڑھا اور جھک کر میرا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے پھیلے ہوئے پیٹ پر زوردار گھونسا جڑ دیا، لمبے بھر کو اس کے چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہوئے۔ میں چھپکلی کی طرح رہینگتا ہوا اس کی ٹانگوں کے بیچ سے دوسری طرف نکل گیا۔ وہ بھی اتنی ہی پھرتی سے گھوما کہ میں حیران رہ گیا۔ ایسا لگا تھا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ فٹ ہو۔ اس نے اپنے منوں وزنی جسم کے ساتھ مجھ پر چھلانگ لگائی۔ مگر اپنے ہی زور پر سامنے والی

دیوار سے جا ٹکرایا کیونکہ میں نے قلابازی کھائی تھی۔ الفانسو کی ٹریگ کام آگئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میری طرف گھومتا میں نے برق رفتاری سے اپنی نئی جگہ بھی چھوڑ دی۔

اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ میری طرف مڑتا میں نے اس کی کمر پر پوری قوت سے لات رسید کر دی۔ صرف ایک لات پر اکتفا نہیں کیا نہایت پھرتی سے پہ در پہ تین لات جزدی۔ میری ان ضربوں سے اس پر صرف اتنا اثر ہوا تھا کہ وہ کچھ ست پڑ گیا تھا۔ پھر وہ جوں ہی گھوما میں نے اچھل کر اس کے چہرے پر لات رسید کر دی۔ اس لات کا یہ اثر ہوا کہ وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں بھی فرش پر گرا تھا مگر گرتے ہی قلابازی کھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اب تک ویکٹر اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا۔ شاید اسے اپنے آدمی پر بہت زیادہ بھروسہ تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا بندہ مجھے مار مار کر ادھمرا کر دے گا۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ پہلی بار میرا واسطہ ایک طاقت ور حریف سے پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہوتا میں نے ایک اور لات اس کے چہرے پر جزدی۔

وہ الٹ کر پیچھے گرا تھا۔ میں نے جست لگائی اور اس کی موٹی گردن کو اپنی پنڈلیوں میں دبایا۔ اس کے مگدر نما ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے اور میں اسے بھی بل دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بری طرح مچل رہا تھا۔ کرب اس کی آواز سے عیاں تھا۔

”کیا ہوا بند سیری لال اب ایسے بھڑے بھی تجھے ماریں گے۔“ ویکٹر کی دہاڑتی ہوئی آواز گونجی۔

”یہ تو خیر اب مر ہی گیا۔ تم اپنی خیر مناؤ اس کے بعد تمہارا نمبر ہے۔“ میں نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

بند سیری نے اٹھنے کی جان توڑ کوشش کی۔ مگر میں نے یہ کوشش بھی ناکام بنا دی۔ پھر بولا۔ ”بند سیری لال اگر زیادہ کوشش کی تو اپنی گردن توڑا بیٹھو گے۔“ پھر آہستہ سے کہا ”ویکٹر چاہتا بھی یہی ہے۔ اس کا اصول ہے کہ جو مہر اپٹ جاتا ہے وہ اسے مروادیتا ہے۔“

شاید میری بات اس کی موٹی عقل میں آگئی تھی۔ اس نے قوت صرف کرنا بند کر دیا تھا۔ میں نے آخری داؤ آزما یا اور برقی سرعت سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کی گردن کے اوپر زوردار گھونسا مارا۔ یہ خوراک اس کے لیے کافی تھی۔ وہ ہوش کھو بیٹھا۔ اس سے سخت کر میں کھڑا ہو گیا پھر ویکٹر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اب بولو جانی تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟“

”تم زندہ نہیں بچو گے۔“ اس نے طنز نکال لیا تھا۔

میں پلک جھپکے بغیر اسے گھورنے لگا۔ اس نے طنز یہ لہجے میں کہا ”بس ہوا نکل گئی۔ میں یہ پٹل تم پر خالی کروں گا۔ یہ میرا عہد ہے۔ میں اس دن کا خواب کب سے دیکھ رہا ہوں۔“

”تو یہ لو۔“ کہہ کر میں نے یکا یک اس کے طنچہ پر لات اڑا کر ماری۔ طنچہ دور جا گرا پھر میں نے اُس کے پیٹ پر لات رسید کی تو وہ کمرے کے وسط میں جا گرا۔ میں نے کھینچ کر اسے اٹھایا۔ اُس کی پیشانی پر ایک گومڑا بھرا یا تھا۔

جب وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا: ”دیوار کی طرف گھوم جاؤ.....“

”کیوں.....؟“ اُس نے بے خوفی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”خبیث کی اولاد..... میں جو کہہ رہا ہوں اُس پر عمل کرو۔“ میں نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ دیوار کی طرف گھومنے لگا۔ لیکن کن آنکھوں سے میری حرکات و سکنات کو دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے جب ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھایا تب اس نے برقی سرعت سے میرے حملے سے بچنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ میرے ریوالور کے بٹ نے اُس کی کھوپڑی بجا دی تھی۔ وہ بے حال ہو کر فرش پر میرے قدموں کی طرف گرنے لگا تا کہ میری ٹانگوں کو پکڑ کر مجھے گرا دے۔ مگر میں اس سے تیز نکلا۔ فوراً ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اُس کی یہ کوشش اس کا منہ چڑانے لگی۔ وہ فرش پر آ رہا تھا۔

اُس جیسے سخت جان کو بے ہوش کرنے کے لئے ایک ضرب کافی نہیں تھی۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے اُس کی کھوپڑی کی پشت پر ریوالور کے بٹ سے ایک اور ضرب لگائی۔ اب وہ پوری طرح بے ہوش ہو کر فرش پر بکھر گیا تھا۔ پھر میں نے اُس کے سامان کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ اس کے بیگ میں میرا محبوب ساتھی فوجیوں والا ریوالور رکھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ مجھے اُس کے پانے سے ایسی خوشی ہوئی جیسے کسی گھڑے دوست کو پا کر ہوتی ہے۔

وہ چونکہ سخت جان تھا اس لئے جلد ہی ہوش میں آ گیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر پوچھا: ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں تمہارے سر کی درگت بنانا چاہتا ہوں..... کیونکہ تم نے جو حرکت کی ہے، اس کی سزا موت ہے۔ اور میں بدلہ لینا خوب جانتا ہوں۔“ میں نے اتنا کہہ کر اُس کی کھوپڑی بجا دی۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو میں نے اُس سے کہا: ”اُس صورت میں تم پر رحم کھا سکتا ہوں کہ تم مجھے مہناز کا پتا بتا دو۔ انکار کی صورت میں تمہاری لاش سڑتی رہے گی۔“

میں نے اس کے مزاج درست کر دیئے تھے۔ وہ زخمی بھی ہو گیا تھا۔

”تم مجھے مار کر کیا زندہ بچ جاؤ گے میرے دو آدمی دوسرے کپارٹمنٹ میں ہیں۔ اسٹیشن آنے والا ہے۔ گاڑی رکھتے ہی وہ آ جائیں گے۔“

”اچھا.....“ میں نے ہنسی اڑانے والے لہجے میں کہا ”اُس ڈبے میں یہ جو اٹھا چک ہو رہی ہے اس کا پتا سب کو چل چکا ہوگا۔ برابر میں جو لوگ ہیں ان کے بارے میں پتا ہے وہ کون لوگ ہیں۔ بس کچھ دیر ٹھہر جاؤ پھر خود ہی کہو گے کہ اس گاڑی سے کیوں سفر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تمہاری موت نے تمہیں اس گاڑی میں سوار کرایا ہے۔“

”یہ بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔“ باہر سے صفدر کی آواز آئی۔ ”اس ڈبے میں آزاد ہند فوج سے بھاگے ہوئے کل چار آدمی تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔ تم ایک گولی چلاؤ گے اور تمہارے جسم میں دس گولیاں ایک ساتھ دھنس جائیں گی۔ ہم تمہارا شکار کرنے نکلے ہیں۔“

ویکٹر کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

”ابھی بھی موقع ہے ان لوگوں سے بچا کر فرار کرانے کا ذمہ میرا ہے۔ بس تم مجھے یہ بتا دو کہ تم نے مہناز کو کہاں رکھا ہے۔“

وہ ہونے لگا تھا۔ جس کا اتنا نام تھا جو حکومت انگلیشیہ کا ایجنٹ تھا۔ جس نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ اپنی موت کا احساس کر کے چوہا بن گیا تھا۔
”بولو میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں شنو یہ ہمارا شکار ہے اس سے کوئی سودا نہیں ہوگا۔“ باہر سے صفدر نے کہا۔ ”تم کو صرف اس لیے ساتھ لیا ہے کہ تم اس کی پہچان کراؤ۔ تم نے کرا دی۔ اب یہ ہمارا شکار ہے۔ ہم ایک ایک انگریز کو تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔“
”جلدی بولو سودا کرتے ہو یا میں باہر نکل جاؤں؟“ میں نے بغیر موقع دیے اس پر نفسیاتی دباؤ بڑھایا۔
”اگر تم مجھے آزاد ہند فوج کے گھیرے سے نکال دو تو میں تمہیں مہناز کا پتا بتا دوں گا۔“ اس نے مری مری آواز میں کہا۔

دراصل وہ آزاد ہند فوج کا سن کروہشت زدہ ہو گیا تھا۔ شاید اس کے علم میں یہ بات تھی کہ میرا تعلق آزاد ہند فوج سے رہا ہے۔ اسی لیے وہ گھبرا اٹھا تھا۔ جانتا تھا کہ یہ لوگ گھیر کر ایذا کیں دے دے کر انگریزوں کو مارتے ہیں۔ کئی ایسی وارداتیں سامنے آچکی تھیں۔
”میں اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ پتا معلوم کیے بغیر تمہیں اپنی ضمانت پر ان کے چنگل سے چھڑاؤں اور تم باہر جاتے ہی اپنی بات سے مکر جاؤ۔“

”مجھ پر یقین کرو۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ صفدر طنچہ تھا مے اندر آ گیا۔ ”اپنا طنچہ پھینک دے انگریزی سور۔“ اس نے حکم دیا۔
”جلدی بولو۔“ میں نے کہا۔

”وہ کدم کنواں والی حویلی میں ہی ہے۔ ریش نام کے آدمی کو اس کی دیکھ رکھ کے لیے رکھا ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں کھانا پانی دیتا ہے۔“
”بس کافی ہے۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ صفدر نے اس کے سر میں گولی اتار دی۔ گولی کی آواز ریل کی آواز میں دب گئی ہوگی۔ مگر ایک بندہ ابھی زندہ تھا۔ کسی انگریز کا قتل طوفان اٹھانے کے لیے کافی تھا۔ اس بندے سے جب گفتگو ہوتی تو وہ میرا حلیہ اور شاید نام بھی بتا دیتا۔ اس لیے میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے صفدر سے کہا۔ ”ایک گولی اسے بھی دے دو تا کہ ہم اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں۔“

صفدر کو حکم ملنے کی دیر تھی۔ اس نے ایک اور گولی اس کے سر میں بھی اتار دی۔ ریل کی رفتار ہلکی ہو رہی تھی۔ ہم کوپے سے نکل کر دروازے پر پہنچ گئے۔

☆.....☆

وہ ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کے برابر میں بھی کئی گھر تھے گو کہ یہ علاقہ گنجان آباد نہ تھا۔ گنتی کے گھر تھے پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی تھی۔
صفدر کے آدمی ہر طرف پھیل کر پوزیشن لے چکے تھے۔ ہر ایک کے پاس چاقو تھا۔ ایک دو نے تلوار بھی اٹھا رکھی تھی۔ صرف ایک شخص جو شاید ان کا سرغنہ تھا اس کی کمر میں کارتوس کی بیٹی تھی اور ہاتھوں میں دو نالی ہندوق۔ سب کو اپنی اپنی جگہ پر بٹھا کر صفدر میرے پاس آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔
”تمہارے پاس طنچہ تو ہے ناں؟“

”ہاں ہے میرے پاس بھی اور نور بیگم کے پاس بھی۔“ ہم دونوں اس وقت انگریزی کپڑوں میں یعنی پتلون اور قمیص میں تھے اس لیے نور بیگم کو نور بیگم کہتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا۔

میں نور بیگم کو ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ بضد تھی کہ وہ حسن آرا کے قاتلوں کو اپنے ہاتھ سے سزا دے گی۔ یہ حالت مجبوری اسے اور مختار کو ساتھ لے آیا تھا اور اس وقت وہ پوری طرح مستعد کھڑے تھے۔

”تم سب میرے ساتھ ساتھ رہنا۔“ کہہ کر صفدر نے کمر سے رسی کا لچھا نکالا اور اسے گردش دے کر چھت کی جانب پھینکا۔ وہ شاید اس کام میں ماہر تھا۔ پہلی ہی کوشش میں لچھا جا کر کسی جگہ پھنس گیا۔ صفدر نے دو تین بار رسی کو جھکادے کر مضبوطی کا اندازہ کرنا چاہا پھر اس نے رسی کے سہارے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوپر پہنچ گیا۔ میں سراٹھا کر اسے ہی دیکھ رہا تھا کہ اس نے اشارے سے ہمیں اوپر آنے کو کہا۔ پہلے میں پھر نور بیگم اور مختار بھی اوپر آ گئے۔

وہ کھلی ہوئی چھت تھی۔ صفدر نے رک کر ادھر ادھر دیکھا پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ سیڑھیوں سے دبے پاؤں نیچے اترا۔ ہم تینوں آگے پیچھے نیچے اترے تھے۔ اس منزل پر پانچ کمروں کے دروازے تھے۔ کس کمرے میں کتنے آدمی ہیں یہ دیکھنے کے لیے وہ باری باری سے ہر کمرے کی کھڑکی سے لگ کر اندر دیکھتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ میں نور بیگم کے ساتھ سیڑھیوں کے سامنے کھڑا تھا۔ تمام کمروں کا جائزہ لے کر وہ لوٹ آیا پھر اس نے سرگوشی میں بتایا۔ ”صرف دو کمروں میں لوگ ہیں۔ ایک میں دو اور دوسرے میں ایک۔ باقی سب خالی ہیں۔“

”پہلے ہم دو آدمیوں والے کمرے پر دستک دیتے ہیں۔ نور بیگم ایک آدمی والے دروازے پر کھڑا رہے گا تا کہ اندر والا باہر آئے تو نور بیگم اسے ناک آؤٹ کر دے۔“

”اور میں اسے کاٹ لوں۔“ مختار نے کہا۔ گو کہ اس کی آواز نیچی تھی پھر بھی مجھے لگا کہ اس کی آواز کوئی سن نہ لے۔ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”خبردار منہ سے آواز نہ نکلے۔ میں خود تمہیں کاٹنے کے لیے کہوں گا۔ جب تک تم خاموش رہو۔“

”سامنے والے کمرے میں کوئی ہے۔ اس کمرے سے روشنی کی لکیر سی نکل رہی ہے۔“ نور بیگم بولا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ آؤ میرے ساتھ تینوں آ جاؤ۔“ کہہ کر صفدر نے بالکل سامنے والے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کمرہ اندر سے لاک تھا۔ مقفل کمرے کے سامنے پہنچ کر صفدر نے دھیرے سے دستک دی۔ ایک بار دو بار۔ پانچویں چھٹی دستک پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی صفدر نے سامنے والے کمرے پر ہاتھ رکھ کر اس کی گردن کو بازوؤں کے حلقے میں کس لیا۔ وہ بے چارہ تو پہلے ہی نیند میں ڈوبا ہوا تھا اس افتاد پر بری طرح گھبرا اٹھا۔ وہ ابھی محل ہی رہا تھا کہ صفدر نے اسے باہر کھینچ لیا تا کہ اس کی وجہ سے اس کے ساتھی کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ جیسے ہی صفدر نے اسے باہر کھینچا میں نے پوری قوت سے طمچے کا دستہ اس کی کپٹی پر دے مارا اور وہ لہراتا ہوا زمیں میں ہو گیا۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے بعد صفدر کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی داخل ہوا۔

اندر مسہری پر ایک حسینہ بخواب تھی۔ شاید وہ اس کی بیوی تھی اور نیند میں بے خبر تھی۔ میں نے نور بیگم کو اشارہ کیا۔ وہ مشینی انداز میں آگے بڑھا اور اس نے نہایت پھرتی سے اس کی مشکیں کس دیں۔ وہ چیخا چاہتی تھی کہ اس کے کھلے ہوئے منہ میں نور بیگم نے کپڑے ٹھونس دیے۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر ہم دوسرے کمرے کی طرف بڑھے تبھی صفدر نے کہا۔ ”اس کمرے میں صرف ایک آدمی ہے اور تم دو ہو یقیناً آسانی سے اسے

قابو میں کر لو گے۔ اتنی دیر میں میں آگے جا کر جائزہ لے آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔۔۔۔۔“ کہہ کر میں اس کمرے کی طرف بڑھا۔ میرے ساتھ نور بیگم بھی تھا۔ میں نے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اندازہ لگنا چاہا کہ یہ مقفل تو نہیں ہے؟ دباؤ پڑتے ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ دشمن کی کچھار میں ہر لمحہ ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ بے خیالی میں ہم نے احتیاط کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ نتیجتاً وہ افتاد آ پڑی تھی۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا تھا دروازے کی آڑ میں کھڑے شخص نے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی اور مجھے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ہی گھٹنا چلا دیا تھا۔

میرا گھٹنا اس کی پیٹ میں لگا تھا بلکہ پیٹ سے کچھ نیچے وہ تکلیف کی شدت سے چیخ پڑا تھا۔ اس کی چیخ دور تک سنی گئی ہوگی۔ اس ڈر سے میں نے اس پر تباہ توڑ وار کرنا شروع کر دیے۔ دس منٹ کے اندر اندر فیصلہ ہو گیا۔ میں فتح یاب ہوا تھا۔

اس سے نمٹنے کے بعد میں نے باہر نکل کر دیکھا، گلیاں خالی پڑا تھا۔ نہ نور بیگم نظر آیا اور نہ صفدر۔ دونوں کے دونوں غائب تھے۔ ساتھ میں مختار بھی غائب تھا۔ میں نے برابر والے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ کمرہ خالی پڑا تھا بھی میری نظر نیبل کے نیچے پڑی اور میں چونک اٹھا پھر کچھ آگے بڑھ کر بغور دیکھا تو حیرت دو چند ہو گئی۔

اس نیبل کے نیچے کافرش لکڑی کے تختوں کا تھا اور کچھ آگے کی طرف کھسکا ہوا تھا یعنی کہ دہرا فرش تھا۔ میں نے نیبل کو مزید آگے کھینچ لیا۔ اب وہ جگہ صاف ہو گئی۔ آگے بڑھ کر میں نے فرش کے تختے کو مزید پیچھے کھسکانے کی کوشش کی۔ دو چار بار جھٹکا دیتے ہی تختہ مزید پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ تہہ خانے کی سیڑھیاں تھیں۔

میں ان سیڑھیوں کی طرف بڑھتا چلا گیا پھر نیچے اترتے ہی میں نے جو کچھ دیکھا وہ ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ تلوار، بلم، برتن، تیر اور دیگر اسلحوں کا ڈھیر جمع تھا۔ بارود کے بڑے بڑے ڈرم بھی رکھے تھے۔ گویا یہ پورا اسلحہ خانہ تھا۔ صفدر کی خبر میں صداقت تھی کہ ویکٹر یہاں کوئی بڑی واردات کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہاں اس کی سازش کامیاب ہو جاتی ہے تو مسلمانوں کا بہت نقصان ہوگا۔ ایسے وقت میں جب انگریز بھی مسلمانوں کے لیے الگ ملک دینے پر نیم رضامند ہیں اگر قتل عام شروع ہوتا ہے تو ہندوؤں کے ساتھ انگریز بھی اپنے قول سے منکر سکتے ہیں اور قائد اعظم کی تمام کوشش مٹی میں مل جائے گی۔ مسلمان چھوٹے چھوٹے محلوں میں گاؤں میں آباد ہیں۔ انہیں تو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کے رکھ دیا جائے گا۔

تہ خانے کا بتانے کے لیے میں اوپر پہنچا تو ایک کارزار گرم تھا۔ نور بیگم اور صفدر کھنبوں کی آڑ میں کھڑے وقفے وقفے سے گولیاں چلا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی صفدر نے کہا۔ ”مہناز سامنے والے کمرے کے نیچے بنے تہ خانے میں ہے۔ میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔“

ہم مقابلہ کر رہے تھے کہ صفدر کے آدمی بھرا مار کر اندر آ گئے۔ گولیاں چلانے والا ایک ساتھ اتنے آدمیوں کو دیکھ کر گھبرا اٹھا۔ وہ رکا تھا کہ صفدر نے اس آدمی کو نشانہ بنالیا جو اتنی دیر سے ان دونوں کو پریشان کر رہا تھا۔ شاید وہی ایک آدمی بچا تھا۔ کیوں کہ بعد میں بھی کوئی زندہ آدمی نہیں ملا۔

ہم صفدر کے ساتھ نیچے تہ خانے میں گئے۔ وہاں ایک لڑکی موجود تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اسی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہی مہناز ہے۔

مہناز کو لے کر ہم واپس انا بوا کے پاس آ گئے۔ اس وقت حویلی کا ماحول دیکھنے کے لائق تھا۔ انا بوا داری بلہاری جا رہی تھیں۔ صفدر کی بیگم بھی میرے آگے پیچھی جا رہی تھی۔ ان دونوں کا کہنا تھا کہ اگر میں نہ ہوتا تو مہناز کبھی بھی زندہ لوٹ نہیں سکتی تھی۔ اس دن کھانا بھی میں نے ان سب کے ساتھ کھایا۔ صفدر کی بیوی مختار سے بہت جلد بے تکلف ہو گئی تھی۔ اس نے کئی بار پوچھا بھی تھا کہ یہ بار بار کاٹ لینے کی بات کیوں کرتا ہے۔ اور میں نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔

واپس آتے وقت میں نے صفدر سے کہا ”تم اندر کی بہت کچھ باتیں جان گئے ہو۔ سمجھ رہے ہو کہ یہ انگریز ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر کے جا رہے ہیں۔ یہاں رہنا فضول ہے۔ یہ علاقہ اس پاکستان میں شامل نہیں ہوگا۔ جو قائد اعظم مانگ رہے ہیں۔ اس لیے حویلی کو بیچ کر اس علاقے کی طرف چل دو جو پاکستان کا حصہ بنے گا۔ میری بات کو اس نے ہنسی میں اڑا دیا تھا۔

☆.....☆

چاند، گگن اور چاندنی

چاند، گگن اور چاندنی آپ کی پسندیدہ مصنفہ اقراء صغیر احمد کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے ہمارے معاشرے کی کئی فرسودہ روایات کے ہولناک انجام کی طرف توجہ دلائی ہے، جس میں ایک نہایت جہالت انگیز اور افسوسناک روایت بیٹی کی پیدائش کو باعث شرم سمجھنا اور انہیں بیٹوں کے مقابلے میں کمتر مخلوق سمجھنا ہے۔ حالانکہ اسلام نے زمانہ جہالت کی اس روایت کا سختی سے خاتمہ کیا لیکن ابھی تک ہمارے معاشرے میں یہ روایت نہ صرف موجود ہے بلکہ اس پر عمل کرنا لوگ باعث فخر سمجھتے ہیں۔ دوسرا تباہ کن رواج نسل در نسل بدلہ لینے کی روایت ہے۔ ہمارے قبائلی اور پنجاب کے کچھ علاقوں میں تو یہ روایت اتنی شدت سے پائی جاتی ہے کہ خاندان کے خاندان اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اس کا انجام محض تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس ناول کے دو کردار شہباز خان اور شمشیر خان اسی روایتی مردانگی کے علمبردار ہیں جو عورتوں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں اور ان پر ظلم و ستم کرنا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ورشا آفریدی ایک بہادر لڑکی ہے جو اپنے خاندان کی اس روایت کے خلاف آواز اٹھاتی ہے اور پھر اُسے کیسے کیسے جہنم زار سے گزرنا پڑتا ہے یہ جاننے کے لئے پڑھیے ”چاند گگن اور چاندنی“۔ ہمیں امید ہے کہ اقراء صغیر کے مداح اس ناول کو پسند کریں گے۔ ”چاند، گگن اور چاندنی“ کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے **ناول سیکشن** کے معاشرتی رومانی ناول میں دیکھا جاسکتا ہے۔

نورینگم نے شہر بھر سے اپنی برادری کے لوگوں کو جمع کیا تھا ان کی دعوت کی تھی۔ ایسی دعوتیں استاد بھوج کہلاتی تھیں۔ اور اس میں گرو اپنی کوتاہیوں کا اقرار کرتا ہے۔ نورینگم نے بھی حسن آرا کی موت کو وجہ بنا کر کہہ دیا تھا کہ اب وہ اس پیشے سے ہٹ رہی ہے۔ اللہ اللہ کرے گی اس لیے تم لوگ جس کو چاہو اپنا نیا گرو بنا لو۔

سردار کا انتخاب اتنا آسان نہیں۔ تجربہ اور عمر کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اس وقت ایسے صرف تین تھے جن کو سرداری کے لیے منتخب کیا جاسکتا تھا۔ کسے نیا گرو بنایا جائے ابھی اسی پر بات ہو رہی تھی کہ دیش نامی زرخہ اندر آتے ہی بولا ”بہنو غور سے سنو میں ایک اہم خبر لے کر آئی ہوں۔“ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ”اب بول بھی دے۔“ رگھویندر نے ہاتھ نچا کر مخصوص انداز میں کہا۔

”سنو مسلمانوں کے نیتا کو کامیابی مل گئی۔ آج رات بارہ بجے اعلان ہوگا کہ کہاں تک پاکستان ہوگا کہاں تک بھارت۔ گویا بھارت ماتا کے ککڑے ہو رہے ہیں۔“

یہ خبر ہندوؤں کے لیے دل توڑنے والی ہو مگر میں تو خوش ہوا تھا تھا۔ مسلمانوں کو ان کا حق مل رہا تھا۔ سجا میں شریک مسلمانوں نے فوراً مٹھائی منگوا کر سب کا منہ میٹھا کرایا تھا۔ ہمیں خبر تھی۔ جو حال اب ہے وہی حال تب بھی ہوگا۔ ہمیں ناچ گا کر ہی زندگی گزارنا ہے پھر بھی مسلمان خوش تھے۔ سجا ختم ہوئی تو سب اسی بات پر بحث کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اور میں ریڈیو سننے برابر والے صاحب جی کے یہاں چلا گیا۔ اس وقت کار ریڈیو بھی کوئی چھوٹا موٹا تو ہوتا نہیں تھا۔ یہ بڑا ہوتا تھا چھوٹے بکس کے برابر۔ ہمارے یہاں گراموفون تھا ریڈیو نہیں تھا کیونکہ ریڈیو بجلی سے چلتا تھا اور ہم نے بجلی لگوائی نہیں تھی۔ صاحب جی اس محلے کے بڑے لوگوں میں تھے۔ میں ان کے گھر آتا جاتا رہتا تھا اس لیے آج بھی ریڈیو سننے کے لیے چلا آیا تھا۔ ابھی خبروں کا ٹائم ہوا نہیں تھا اس لیے استاد بھل اللہ رکھا کی آواز میں راگ درباری نشر ہو رہا تھا۔ ان کی بیوی نے پوچھا ”کیوں ری شنو کچھ کھائے گی یا صرف ریڈیو سنے گی۔“

”نہیں باجی ہم تو آج ریڈیو ہی سنیں گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ صاحب جی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

”اے ہئے صاحب جی کیا ہوا آپ تو ایسے بھاگتے ہوئے آئے ہیں جیسے کتے پیچھے لگ گئے ہیں۔“ میں نے ہاتھ نچا کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”تو بھی سنے گی تو گھبرا اٹھے گی۔ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ بانسواڑی میں مسلمانوں کے بہت سے گھر جلا دیئے گئے۔ کئی لوگوں کو چاقو مارا گیا ہے۔ شہر میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ مسلمان بھاگ بھاگ کر محفوظ علاقوں میں آ رہے ہیں۔“

”مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ ہندو مسلمانوں کے دوست نہیں موقع ملتے ہی ٹوٹ پڑیں گے۔ اب کیا ہوگا؟“

”ہوگا کیا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہمارا علاقہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ ہے یہاں ہندو کچھ نہیں کر سکیں گے مگر جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں قیامت برپا ہو جائے گی۔“

میرادل دھڑک اٹھا اس لیے کہ صفدر کی حویلی بھی تو ہندو اکثریتی علاقے میں تھی کہیں ان پر بھی کوئی افتادہ نہ آ پڑے۔ اسی خیال کے تحت میں بھاگتا ہوا باہر آیا اور تیزی سے حویلی کی طرف بھاگا۔ راستے میں عجیب سا تھا۔ ہندوؤں کی آبادی پر یا تو ترنگا لہرا رہا تھا یا گیر وے رنگ کا جھنڈا۔ یہ جھنڈا ہندو مہاسبھا کا تھا جو مسلم دشمن جماعت تھی۔ اس محلے میں بھی خوف کا عالم طاری تھا۔ مجھے دیکھ کر کسی نے کوئی پھبتی نہیں کسی۔ کسی نے مذاق نہیں اڑایا۔

حویلی کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے چوکیدار کی بجائے صفدر کی آواز آئی ”کون؟“

”میں ہوں‘ شتو۔“

دروازہ کھل گیا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوئی اس نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑھتے ہوئے پوچھا ”چوکیدار کہاں گیا؟“

”رات سے غائب ہے پتا نہیں کہاں بھاگا ہوا ہے۔“

”تمہیں پتا ہے نا شہر میں ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گئی ہے ان حالات میں کوئی ہندو کسی مسلمان کے گھر میں کیوں رہنے لگا۔ وہ گورکھا تھا اسی لیے بھاگ گیا۔“

”یہ سب غنڈے بد معاشوں کی کارستانی ہے۔ ابھی پولیس والے سب کنٹرول کر لیں گے۔“

”کون سی پولیس؟ رات میں اعلان ہوگا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ اب نئی پولیس بنے گی نیا قانون بنے گا۔“

”کوئی نیا قانون نہیں بنے گا۔ اب یہی مقامی افراد حکومت سنبھالیں گے۔“

”جب تک مقامی افراد حکومت سنبھالیں گے تب تک کئی لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ بانس واڑی کے مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ بھی کچھ دنوں کے لیے ہمارے محلے میں آ جاؤ وہ مسلمانوں کا علاقہ ہے جب کہ یہ حویلی ہندوؤں میں گھری ہوئی ہے۔“

”نہیں یہاں کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مگر انا بوا کا خیال کچھ اور تھا۔ انہوں نے بھی حالات کی نزاکت کو سمجھ لیا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ کم سے کم مہناز کو وہاں پہنچا دیا جائے۔

میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کہیں تو میں برابر والے صاحب جی سے بات کروں۔ ان کے یہاں ٹھہرنے کا انتظام ہو جائے گا۔ جواب میں صفدر نے کہا تھا کہ وہ سوچے گا۔ اسے سمجھنا بیکار تھا اس لیے میں نامراد سا لوٹ آیا تھا۔ لیکن اسی رات وہ مہناز کو لے آیا۔ اس نے کہا کہ انا بوا بھند ہیں اسی لیے میں اسے لے آیا ہوں۔ میں نے اسی وقت صاحب جی سے بات کی اور انہوں نے ایک کمر اس کے لیے مختص کر دیا۔ وہ تو سب کو یہیں لے آنے کے لیے کہہ رہے تھے مگر صفدر اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

باتوں میں اچھا خاصا وقت گزر گیا۔ رات پوری طرح پھیل گئی تھی۔ وہ جانے کے لیے نکل رہا تھا کہ خبر آ گئی کہ راستے میں آنے والے سید پورا پر ہندوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ یہ خبر بلا گئی۔ اس لیے کہ سید پورا کے بعد ایک محلہ تھا پھر حویلی تھی۔ کہیں ہندوؤں نے ادھر کا رخ نہ کر لیا ہو۔ صفدر جانے کے لیے پھل رہا تھا مگر صاحب جی نے اسے جانے نہیں دیا۔ وہ رات بحث و مکرار میں گزر گئی اور صبح کا سورج طلوع ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی صفدر جانے کے لیے نکل رہا تھا کہ صاحب جی نے پھر منع کیا مگر وہ کسی طور رکنے پر تیار نہ تھا۔ بالآخر میں نے کہا کہ تمہارے

ساتھ میں بھی جاؤں گا تا کہ انا بوا اور دلہن بی بی کو لے آؤں۔

ہم تیار ہو کر نکل پڑے۔ اپنے ساتھ حقار کو بھی لے لیا تھا کہ سامان لانے میں وہ مدد کرے گا۔

باہر آ کر دیکھا کہ تمام سڑک سنسان پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم پٹنہ شہر میں نہیں کسی قبرستان سے گزر رہے ہیں۔ مجھے اب ہول سا اٹھنے لگا تھا۔ مگر میں کچھ بولا نہیں اور خاموشی سے آگے بڑھنے لگا۔ تبھی مجھے ایک تانگہ نظر آیا اور میں نے اسے روک کر پوچھا۔ ”شہزادی باغ چلو گے۔“

”جی صاحب ضرور چلیں گے۔ ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔“

ہم اس تانگے میں سوار ہو گئے۔

ہمارا تانگہ ابھی کچھ ہی دور چلا ہو گا کہ یکا یک ہی چاروں جانب سے پتھر برسنے لگے۔ تانگے والا گھبرا گیا۔ اُس نے تانگہ کنارے پر لگایا اور اس سے اترتے ہوئے بولا۔ ”بھائی جان بچاؤ.....! ہندو مسلمان فساد ہو گیا ہے۔ وہ دیکھو سامنے سے بلوائی آرہے ہیں۔ اگر ہندو ہو تو ادھر دوڑو اور اگر مسلمان ہو تو اسی گلی میں داخل ہو جاؤ۔“

تانگے والا تیزی سے سامنے والی گلی میں داخل ہو گیا۔ فی الحال تو ہم لوگ بچے ہوئے تھے۔ جتنے نے پھتوں پر چڑھے ہوئے لوگوں سے بچا لیا تھا مگر سامنے سے آتے ہوئے جتنے سے کیسے بچوں میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا اور ایک عورت نے پکار کر کہا۔

”اگر مسلمان ہو تو ادھر آ جاؤ ورنہ سامنے والی گلی میں گھس جاؤ وہ ہندوؤں کا محلہ ہے۔“

”الحمد للہ میں مسلمان ہوں۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”تو پھر دیر نہ کرو اندر آ جاؤ.....“

ہم اُس گھر میں داخل ہو گئے۔ اندر اور بھی کئی لوگ تھے۔ سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ وہ سب کھڑکیوں پر کھڑے تھے کچھ چھت پر چڑھ گئے تھے۔

اس عورت نے سامنے بچھے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”بھائی صاحب آپ بیٹھے نا۔“

میں چار پائی پر بیٹھ گیا مگر صغیر اور مختار کھڑکی پر کھڑے لوگوں کی طرف بڑھ گئے۔ شاید وہ زیادہ بے چین تھے۔ باہر کے بارے میں فکر مند تھے کہ باہر کیا ہو رہا ہے یہ دیکھنا چاہتے تھے مگر میں وہیں بیٹھا رہا۔ باہر سے نعروں کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔

”بہن.....! ایک بندوق اور مل سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم اجنبی ہو مہمان ہو اس لیے تم بیٹھے رہو آرام کرو۔ یہ یہاں کے لیے اب معمول کی بات ہو گئی ہے۔ ہمارے نوجوان ان کافروں کے لیے کافی ہیں۔“ عورت نے پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے بندوق لینے کے لیے بہانا بنایا۔ ”میں فوج میں ہوتا ہوں مجھ سے بہتر نشانہ کسی کا نہ ہو گا اس لیے مجھے ایک بندوق ضرور دے دو۔“

”اسلحے کی کمی نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے بڑی تعداد میں کلکتہ سے اسلحہ منگوایا ہے۔ دراصل ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں بھی فسادات کی

آگ بھڑکے گی۔ آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“

”ہم مظفر پور سے آرہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مگر آپ کی زبان تو بھڑکی ہے۔“

”جی ہاں میں نے بنارس میں پرورش پائی ہے۔“

”یہاں کس محلے میں گھر ہے؟“ اس سوال پر میں خاموش رہا کیونکہ اس طرح مجھے بتانا پڑتا کہ میں بیچروں کے ساتھ رہتا تھا اس لیے

جلدی سے بولا۔ ”اور یہ پچھتم دروازے کے رہنے والے ہیں نواب خاندان سے تعلق ہے۔“

”او..... اچھا..... اب یاد آیا کہ ان کی شکل مجھے پچانی پچانی کیوں لگی تھی۔ دراصل میں نے انہیں رنج الاول کے میلاد میں دیکھا تھا“

وہاں میں نعت پڑھنے لگی تھی۔ نواب خاندانوں میں مجھے خاص طور سے بلایا جاتا ہے۔ تا نگہ بھیجا جاتا ہے۔ صدر گلی۔ نوڈھال۔ گلزار باغ کوئی ایسا

علاقہ نہیں ہے جہاں میں نعت پڑھنے نہیں گئی۔“

وہ اپنی کہے جارہی تھی اور میں خواہ مخواہاں ہاں کیے جارہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بولنے کی مشین ہے۔ اس کی زبان رکنے کا نام ہی نہیں

لے رہی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ جانے کو بے تاب تھا کہ ایک بڑے میاں اندر آ گئے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ ان صاحبہ کے سر تھے۔

انہوں نے برابر میں بیٹھتے ہی کہا۔ ”بھائی میاں یہ تو بتاؤ تمہارے ساتھ جو نو جوان ہے اس کا اصل نام کیا ہے۔ وہی جو اپنا نام مختار بتاتا ہے؟“ ان کا

اشارہ مختار ہی کی طرف تھا۔

”جی میں سمجھا نہیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ مختار ہی تو اصل نام ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کچھ اور تو نہیں ہے؟“

”جی نہیں..... مگر آپ ایسا کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ میں نے اچھے لہجے میں پوچھا۔

”ابھی میں سمجھا تا ہوں“ کہہ کر وہ اسی کمرے میں رکھے ایک بکس کی طرف بڑھے اور اسے کھول کر اندر کچھ تلاش کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب انہوں نے اندر سے کچھ تلاش کر لیا تو میرے پاس آ گئے۔ میں ان کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بولے۔ ”اس تصویر کو دیکھو۔“

وہ ایک دھندلی تصویر تھی۔ گروپ فوٹو تھا۔ اس فوٹو میں بہت سے آدمی بیٹھے کھڑے تھے۔ بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر پڑتے ہی میں گویا

اچھل گیا۔ ان میں مختار بھی تھا۔ مگر اس کے سر پر بڑی سی پگڑی تھی اور کمر میں تلواریں لگی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی راجا مہاراجا کی تصویر ہو۔ اس

تصویر پر انگلی رکھ کر ان صاحب نے کہا۔ ”یہ نواب افتخار الدولہ ہیں۔ میں ان کی ریاست کا دیوان تھا۔ برسوں پہلے یہ شکار کرنے گئے تھے مگر آج تک

لوٹ کر نہیں آئے۔ ان کی ریاست پر ان کے بھائی نے قبضہ کر لیا اس لیے کہ نواب صاحب کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور

بچہ بھی تھا۔ وہ بھی آج تک مل نہیں پائے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ یہ نواب صاحب کا کھویا ہوا بیٹا ہے۔“

”یہ ریاست ہے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ یوپی کے ضلع گونڈا میں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بچہ وہی ہے جو نواب صاحب کے ساتھ تھا۔ ان کا اکلوتا بیٹا۔“ انہوں نے اپنی بات پھر دوہرائی۔

”شاید..... کیوں کہ یہ بھی کچھ ایسی ہی کہانی سناتا ہے..... اس تک اس کی ماں کی زبانی ایک کہانی پہنچی ہے کہ اسے ساتھ لے کر اس کے والد والدہ شکار کھیلنے آسام کے جنگل میں آئے تھے۔ وہاں ایک انگریز سے ان کا جھگڑا ہو گیا اور اس نے نواب صاحب کو گولی مار دی۔ نواب کی بیوی نے اس انگریز کو شوٹ کر دیا اور اس بچے کو لے کر ایک جوگی کے پاس آگئی۔ جوگی کی کنیا کے آس پاس بکثرت سانپ پلتے تھے۔ انہی میں سے کسی سانپ نے اس عورت کو کاٹ لیا۔ اس کے مرنے کے بعد وہ بچہ جوگی کی ذمہ داری بن گیا۔ اسی جوگی نے اسے پالا ہے۔“

”تب تو یہ سو فیصد نواب افتخار الدولہ کا بیٹا ہوا۔ بس تھوڑا سا حالات سدھرے تو میں اسے لے کر گونڈا جاؤں گا۔ اسے اس کا حق دلوں گا۔“ بڑے میاں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”اگر ایسا ہو جائے تو کیا کہنا۔ بے چارہ زندگی بھر روتا رہا ہے۔“

ابھی باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ باہر سے نعروں کی تیز گونج سنائی دینے لگی۔ ”جیے بجرنگ بکی.....“ اور جواب میں ”اللہ اکبر.....!“ ساتھ ہی ساتھ بندوق کی گرج بھی سنائی دینے لگی تھی۔ لگا کہ بلوائی گلی کے اندر گھس آئے ہیں۔ میں دوڑتا ہوا کھڑکی پر پہنچا اور پوزیشن لے کر بیٹھے شخص کی دونالی بندوق چھین کر بلوائیوں پر نشانہ لگانے لگا۔ تبھی ایک دل دکھانے والی واردات ہو گئی۔ مختار تو تھا ہی نکلی۔ لوگوں کو بلوائیوں سے مقابلہ کرتے دیکھ وہ بھی باہر نکل گیا۔ اور دوڑتا ہوا بلوائیوں کی بھیڑ میں گھس گیا۔ دوسرے لوگ تلوار برچھے سے مقابلہ کر رہے تھے اور وہ دانتوں سے مقابلہ کرنے لگا ایک کے بعد ایک کو دانت کاٹنے لگا۔ وہ جسے کاٹنا وہ فوراً گر جاتا۔ اس افتاد پر بلوائی گھبرا گئے اور کئی ایک نے اسے گھیر کر وار کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی بے وقوفی پر توجہ نہیں دی اور فائرنگ کرتا رہا۔ میں اس بھیڑ میں صرف اُسے نشانہ بناتا جو مجھے اہم نظر آتا یعنی ہدایت دینے والا۔ پے در پے میں نے چار ایسے اشخاص کو نشانہ بنایا جو بڑھ بڑھ کر بلوائیوں کو آکسار ہے تھے۔ چار اہم شخصیتوں کے مرتے ہی بلوائیوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ ہسپا ہونے لگے۔

انہیں میدان سے بھاگتے دیکھ کر محلے والوں کا حوصلہ سوا ہو گیا اور وہ سب پتھر اڑاتے ہوئے انہیں دوڑانے لگے۔

”اللہ کا شکر ہے کہ بلا ٹل گئی۔“ اُس عورت نے کہا۔ اُس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت باتونی ہے۔

”کیا یہاں اب آئے دن فساد ہو رہے ہیں؟“ میں نے ایسے پوچھا جیسے کچھ جانتا ہی نہیں ہوں۔

”آج تیسرا دن ہے۔ ہر روز یہی ہو رہا ہے۔“ عورت نے منہ بنا کر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ ہندوؤں کو پاکستان بنانے کا نعرہ کچھ کے لگا رہا ہے۔ وہ ہتے مسلمانوں سے بدلہ لے رہے ہیں۔“

”ہاں..... اس وقت پورا بڑا صغیر خطرے میں گھرا ہوا ہے۔ امرتسر وغیرہ سے جو خبریں آرہی ہیں وہ تو حد سے زیادہ دہلا دینے والی ہیں۔“

”میتے کے ابا تو کہہ رہے ہیں اب ہم لوگ یہاں نہیں رہیں گے پاکستان چلے جائیں گے۔ آخر کو وہ ہمارا وطن ہے پھر نئے ملک میں ترقی

کے مواقع بھی بہت ہوتے ہیں۔“

وہ ایک کے بعد ایک بات چھیڑ رہی تھی۔ کھڑکیوں پر کھڑے افراد مسکرا رہے تھے۔ شاید وہ سب اس عورت کے باتونی پن سے واقف تھے۔ ابھی میں اس باتونی سے باتیں کر رہی رہا تھا کہ ایک آدمی نے اندر آ کر گھبرائے ہوئے انداز میں بتایا کہ آپ کا ساتھی شہید ہو چکا ہے۔ اس کی کئی پھٹی لاش لائی جا رہی ہے۔

صفدر اور میں واقعی افسردہ ہو گئے تھے۔ بے چارہ زندگی بھر اپنے حق سے محروم رہا اور جب حق وصول کرنے کی امید نظر آئی تو موت نے آدبو چا۔

مختار کو وہیں محلے میں دفن کر دیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے پوچھا۔ ”راستہ صاف ہونے میں کتنی دیر لگے گی؟“

میں نے محلے کا نام لیا تو ایک صاحب بولے۔ ”وہ علاقہ تو بہت مخدوش ہے۔ انگلیوں پر گنے جائیں اتنے گھر مسلمانوں کے ہیں پھر راستہ بھی صاف نہیں ہے۔ ہندوؤں کے کئی محلے درمیان میں ہیں۔“

”کسی نہ کسی طرح تو وہاں پہنچنا ہی ہے۔ ان کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”ایسا کریں کہ ہندوؤں جیسے کپڑے پہن لیں۔ سر گنجا کر اگر کئی چھوڑ دیں۔ راستے میں کوئی بھی روکے گا نہیں۔“ کھڑکی پر کھڑے شخص نے ہنس کر کہا۔

باہر کا ماحول پر سکون ہو چکا تھا اس لیے ایک ایک کر کے تمام مرد جا چکے تھے۔ وہ عورت بھی چلی گئی۔ اُس کا مشورہ غلط نہیں تھا۔ گنجا ہونا میرے لیے پریشان کن مسئلہ نہیں تھا مگر صفدر کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔

”پھر ایسا کرو کہ تم دونوں بھی دھوتی باندھ لو۔“

”ہاں..... یہ ایک آسان طریقہ ہے۔ اُن سے پوچھو شاید مزید دھوتی مل جائے۔ مل جائے گی؟۔“

میں نے اُس عورت کو بلا کر پوچھا تو اُس نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ہم بالکل نئے گیٹ آپ میں تھے۔ میں نے اور صفدر نے ہندوانہ سفید دھوتی باندھ رکھی تھی اور پیشانی پر تلک بھی لگا لیا تھا۔ ہم سب ہندوانہ بھیس میں پیدل چل پڑے گو کہ وہ علاقہ زیادہ دور نہ تھا مگر وہاں تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ راستے میں ہندوؤں کے کئی محلے آتے تھے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہوئے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ بازار پار کر کے ہم پلپار پہنچے۔ کئی جگہ تلواریں برچھے سونے لوگ کھڑے نظر آئے مگر کسی نے ہمیں روکا نہیں اس لیے کہ ہم دور ہی سے ہندو نظر آ رہے تھے مگر جیسے ہی مدرسہ ایمانیہ کے نزدیک پہنچے گلیوں سے نکل کر کچھ لوگ آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں بھی تلواریں، بلم، برچھے تھے۔ انہوں نے ہمیں روک کر پوچھا۔ ”کہاں جانا ہے؟“

اُن کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اُن کے لباسوں سے میں نے پہچان لیا تھا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ ”بھیا.....! ہم مسلمان ہیں۔ ریلوے اسٹیشن سے سیدھے آ رہے ہیں۔“

”اور اگر کوئی مسلمان اپنا غصہ تم لوگوں پر اتار دیتا تو.....؟“ اُن میں سے ایک نے کہا۔

”کون سا محلہ ہندوؤں کا ہے اور کون سا مسلمانوں کا؟ یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔“ کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیئے۔ اتنی دیر میں میں نے پیشانی پر لگا تلک پونچھ لیا تھا۔

اب ہم محفوظ علاقے میں آچکے ہیں اس خیال سے ہم مطمئن تھے۔ کیوں کہ سامنے ہی حویلی تھی مگر حویلی کا حال دیکھ کر دل رواٹھا تھا۔ دیواریں دھوکیں سے کالی پڑ گئی تھیں۔ محلے والوں نے بتایا کہ حملہ عقب سے ہوا تھا اس لیے پتا اس وقت چلا جب بلوائی اپنا کام کر چکے تھے۔ گھر کے ایک ایک مکین کو ذبح کر کے حویلی کو آگ لگا چکے تھے۔ اندر کوئی بھی نہیں بچا۔ جلی ہوئی لاشوں کو کچھ دیر قبل دفن کرایا گیا ہے۔

☆.....☆

حویلی جل چکی تھی اپنے سب مارے جا چکے تھے صفر لٹ کر رہ گیا تھا اس لیے کہ اس کی گود کا بچہ بھی ہندو بریت کا نشانہ بن گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم اسی طرح ہندو بھیس بنا کر واپس اپنے محلے میں آئے تھے۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ صفر سر جھکائے بیٹھا رو رہا ہے۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے دیکھ لیا کہ انسان کتنا بڑا ظالم ہے۔ میں آس پاس کا چکر لگا آیا ہوں۔ اف ایسی تباہی میں تک کانپ اٹھا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ عورتوں کو بھی اذیت دی گئی۔ اف میں بتا نہیں سکتا کہ کتنا ظلم ہوا ہے۔“ اس کا لہجہ غم آلود تھا۔ میں جواب میں کیا کہتا اس لیے چپ تھا کہ اس نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ ”بستیوں کی بستیاں ویران ہو چکی ہیں کہیں کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ لوگ سردیوں میں ٹھنڈے ہیں کھلے آسمان تلے پڑے ہیں۔ پتا نہیں کیا ہوگا۔“

اس واقعہ کو پانچ دن ہو چکے تھے۔ شہر میں آگ اور خون کا کھیل زوروں پر جاری تھا۔ مسلمان آہستہ آہستہ شہر کو خالی کر رہے تھے۔ یہاں سے مشرقی پاکستان نزدیک تھا اس لیے بڑی تعداد میں لوگ کلکتہ کے راستے وہاں منتقل ہو رہے تھے۔ صاحب جی نے بھی وہاں جانا طے کر لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ صفر اور میں بھی ان کے ساتھ چل دیں مگر صفر ابھی بھی راضی نہیں تھا۔ اب وہ مہناز کے ساتھ ہمارے ہی گھر میں اٹھ آیا تھا۔ اس لیے کہ صاحب جی نے اپنا مکان ایک پڑوسی کے ہاتھ معمولی سی قیمت پر بیچ دیا تھا۔

صاحب جی کے جانے کے تیسرے دن اس محلے پر بھی زبردست حملہ ہوا۔ اتنا منظم حملہ تھا کہ اگر مسلمان تیار نہ ہوتے تو پورا محلہ لٹ جاتا۔ اس واقعہ کے بعد صفر بھی مایوس ہو گیا اور وہ بھی مشرقی پاکستان جانے پر تیار ہو گیا۔

مجھے تو بس اشارہ چاہیے تھا میں نے اسی دن شہباز سے بات کی۔ وہی لوگوں کو پاکستان لے جانے کا کام کر رہا تھا۔ اس نے دوسروں پر یہی آدمی پر معاملہ طے کر لیا۔ اسی دن کی گاڑی سے ہم کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

کلکتہ کے ہاؤز اسٹیشن پر شہباز کا آدمی موجود تھا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر پہنچا۔ اس گھر میں پہنچتے ہی میں نے پہلا کمر اپنے اور نور بیگم کے آرام کے لئے مخصوص کر لیا۔ دوسرے کمرے میں مہناز نے اپنا بستر بچھا لیا۔ نشست گاہ صفدر نے اپنے لیے پسند کر لی۔ ہم سب تھکے ہوئے تھے۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئے تھے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ آرام کی جگہ میسر ہوئی تو نیند کے احساس نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ میں تو لیٹنے کے ساتھ ہی بے خبر ہو گیا گویا نیند میری پلکوں پر تھی جس نے فوراً آنکھیں بند کر ادیں۔

میں بے خبر سو رہا تھا کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے بستر کے نزدیک نور بیگم کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر میں اٹھ بیٹھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے گہراے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”صفدر دودھ لینے کے لیے نکلے تھے کہ پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔“

”کیا! صفدر گرفتار ہو گیا؟ اسے اتنی رات میں نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”رات نہیں جانی! گھڑی دیکھو دن کے نو بج رہے ہیں۔“

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی واقعی نو بج رہے تھے۔

”یہ کتنی دیر پہلے کا واقعہ ہے؟“ میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے پوچھا۔

”تقریباً پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ انہیں چھڑانے کے لئے مہناز گئی ہیں۔ میں جانا چاہتی تھی مگر وہ خود بھند ہو گئی تو میں نے راہ خراج والی رقم انہیں دے دی ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو رشوت دے دیں!“

میں نے جلدی جلدی چہرے کو تو لیے سے رگڑا اور پاکٹ کنگھی کو بالوں میں پھیرتا ہوا باہر نکل آیا۔ ابھی میں گلی سے نکلا ہی تھا کہ آغا علی نظر آ گیا۔ وہی جو ہمیں اسٹیشن سے لے کر آیا تھا۔ دراصل وہ ٹیکسی چلاتا تھا۔ وہ اپنی ٹیکسی میں بیٹھا سواری کا منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ میں نے جلدی سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سیدھے چلو! صفدر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ اسے چھڑانے کے لئے مہناز بھی ساتھ گئی ہے۔“

آغا علی نے فوراً ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ کچھ آگے جانے کے بعد اس نے کہا۔ ”سیٹ کے نیچے دو روپے اور ہیں ایک مجھے دے دو۔“

آغا علی کبھی آزاد ہند فوج کا رکن تھا۔ مگر جب آزاد ہند فوج نے ہتھیار ڈال دیا تو یہ ٹیکسی چلانے لگا۔ ٹیکسی چلانے کا ایک بڑا فائدہ بھی تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے والے ڈرائیور کو فراموش کر دیتے ہیں اور آپس میں ایسی ایسی بات کر لیتے ہیں جسے خفیہ رکھنا چاہیے۔ پولیس والے بھی انسان ہوتے ہیں۔ وہ بھی ٹیکسی میں بیٹھ کر باتوں کے درمیان ایسی باتیں بھی کر جاتے ہیں جن کا فائدہ مسلمانوں کو پہنچتا ہے۔ مسلمان ایسی اطلاعات کا بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس وقت میں بھی اس کی ٹیکسی کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ آغا علی ٹیکسی کو فل اسپید میں دوڑا رہا تھا۔ کچھ دور جاتے ہی ہمیں ایک جیپ نظر آ گئی۔ وہ جیپ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر مڑ رہی تھی۔

”ڈیش بورڈ میں دو روپے ہیں دیکھنے میں ٹوٹی پھوٹی مگر طاقت ور ہے۔ اسے نکال کر دیکھیں۔ کیا وہی جیپ ہے۔“ آغا علی نے کہا۔

میں نے جیپ کو دیکھا۔ وہی جیپ تھی جس نے اسٹیشن پر شہباز کا آدمی موجود تھا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر پہنچا۔ اس گھر میں پہنچتے ہی میں نے پہلا کمر اپنے اور نور بیگم کے آرام کے لئے مخصوص کر لیا۔ دوسرے کمرے میں مہناز نے اپنا بستر بچھا لیا۔ نشست گاہ صفدر نے اپنے لیے پسند کر لی۔ ہم سب تھکے ہوئے تھے۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئے تھے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ آرام کی جگہ میسر ہوئی تو نیند کے احساس نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ میں تو لیٹنے کے ساتھ ہی بے خبر ہو گیا گویا نیند میری پلکوں پر تھی جس نے فوراً آنکھیں بند کر ادیں۔

میں بے خبر سو رہا تھا کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے بستر کے نزدیک نور بیگم کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر میں اٹھ بیٹھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے گہراے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”صفدر دودھ لینے کے لیے نکلے تھے کہ پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔“

”کیا! صفدر گرفتار ہو گیا؟ اسے اتنی رات میں نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”رات نہیں جانی! گھڑی دیکھو دن کے نو بج رہے ہیں۔“

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی واقعی نو بج رہے تھے۔

”یہ کتنی دیر پہلے کا واقعہ ہے؟“ میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے پوچھا۔

”تقریباً پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ انہیں چھڑانے کے لئے مہناز گئی ہیں۔ میں جانا چاہتی تھی مگر وہ خود بھند ہو گئی تو میں نے راہ خراج والی رقم انہیں دے دی ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو رشوت دے دیں!“

”جیپ تو میں نے دیکھی نہیں۔“ دور بین نکالتے ہوئے میں نے کہا۔

”بھائی میاں! آپ بھی بس۔ دور بین سے جیپ کا اندرونی حصہ بھی دکھائی دے گا۔ اگر یہ وہی جیپ ہے تو وہ دونوں اندر ہی ہوں گے۔“ میں نے دور بین کو آنکھوں سے لگالیا۔

”غور سے دیکھئے گا اور سری جگ عظیم کے فوجیوں کا یہ تحفہ ہے۔ کباڑی سے خریدا ہے تو کیا ہوائی دور بین کو مات کر دیتی ہے۔“ آغا علی نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا۔

”ہاں یہ وہی جیپ ہے۔ اندر دونوں ہیں۔“ میں نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

”تو تیار ہو جائیے۔ اسی خفیہ خانے سے فاضل راؤنڈ بھی نکال لیجئے۔ میں اسپید بڑھار ہا ہوں۔“

”نہیں! اسپید مزید کم کر دو ہمیں صرف پیچھا کرنا ہے۔ یہ لوگ تھانے کے بجائے شہر سے باہر کیوں جا رہے ہیں یہ دیکھنا ضروری ہے۔“ میرے کہنے پر اس نے اسپید کم کر دی۔ دور بین ہنوز میری آنکھوں سے لگی ہوئی تھی۔ جیپ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

دور دور تک وہاں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ زرد خوشوں سے لدے کھیتوں کے درمیان سیاہ سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر ویرانی کا راج تھا۔ ابھی تک سوائے ایک ٹرک کے کوئی سواری نظر نہیں آئی تھی۔ اس سنسان سڑک پر ہم دو ڈھائی میل آگے بڑھے تھے کہ میں چونک پڑا۔ وہ منظر انتہائی حیرت انگیز تھا کہ میں گویا اچھل پڑا تھا۔ جیپ رکی تھی اور دو سپاہیوں نے صفدر کو اٹھا کر نیچے پھینک دیا تھا اور پھر جیپ آگے بڑھ گئی تھی۔

انہوں نے صفدر کو پھینکتے وقت آگے ضرور دیکھا ہوگا۔ انہیں ہماری ٹیکسی نظر آئی ہوگی مگر انہوں نے ٹیکسی کو اہمیت اس لئے نہیں دی ہوگی کہ مسافروں کے ساتھ کوئی ٹیکسی ڈرائیور اپنا راستہ چھوڑ کے مجرموں کے پیچھے نہیں دوڑتا خواہ وہ جتنا ہی سنگین جرم کیوں نہ ہو۔ پھر پولیس والوں کی شرافت اظہر من الشمس ہے۔ انصاف کی مدد کرنے والے ہی نا انصافی کا شکار ہو جاتے ہیں اور گواہی کا طوق خواہ مخواہ گلے میں پڑ جاتا ہے۔ ہماری ٹیکسی جوں ہی صفدر کے قریب پہنچی آغا علی نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا اور چیخ کر بولا۔ ”فورا اندر آ جاؤ۔“

صفدر کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا اور اندر آ گیا۔ اس وقت وہ سخت غصے میں تھا اور پولیس والوں کی زبان بول رہا تھا۔ ایسی ایسی چٹ پٹی گالیاں اس کی زبان پر پھل رہی تھیں جن پر صرف پولیس والوں کا حق ہے۔ اس کے اس بھٹیاریوں والے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”آخر ہوا کیا تھا؟“

”میں دودھ لینے نکلا تھا کہ پولیس جیپ نے راستہ روک لیا۔ تلاشی کے دوران انہیں تین ہزار روپے مل گئے۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر ان کے منہ میں پانی آ گیا۔ وہ رقم ہتھیلے کے لیے مجھے تھانے لے جانے کی دھمکی دینے لگے۔ ابھی معاملہ طے بھی نہیں ہوا تھا کہ مہناز نے بے وقوفی کر دی۔ وہ ڈھائی ہزار کی خطیر رقم لے کر پہنچ گئی یکشت اتنی رقم دیکھ کر وہ لوگ سمجھ گئے کہ ہم موٹی آسای ہیں۔ ہم سے مزید رقم نکل سکتی ہے اور انہوں نے ہمیں جیپ میں بٹھالیا۔ مول تول ہونے لگا۔ وہ میری اور مہناز کی رقم پہلے ہی لے چکے تھے۔ اب ان کا مطالبہ مزید پانچ ہزار کا تھا۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے گھر میں اب پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ یہ رقم تو دکان بیچی تھی اسی کی ہے۔ وہ تینوں سپاہی آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے اور

پھر یکا یک دو نے مجھے دبوچ لیا۔ میں ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ انہوں نے مجھے نیچے دھکیل دیا۔ روپے لے ہی چکے تھے مہناز کو بھی لے اڑے۔ وہ بے چاری مفت کی مصیبت میں پھنس گئی۔

”کچھ اندازہ ہے وہ لوگ کہاں گئے ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”واصل پورہ میں کسی کا خالی مکان ہے وہیں لے جانے کی بات کر رہے تھے۔“ صندر نے جواب دیا۔

اگر ہم نے دیر کر دی تو کیا ہو جائے گا یہ سوچ سوچ کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہندو درندے کس قماش کے ہیں اور مفتوح قوم سے کیا سلوک کر رہے ہیں اسی لیے میں نے آغا علی کو اسپید تیز رکھنے کا کہہ دیا تھا۔

واصل پورہ نزدیک آتا جا رہا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا گاؤں نہیں تھا۔ بمشکل ساٹھ ستر گھروں کی آبادی تھی۔ اتنے چھوٹے سے گاؤں میں پولیس جیپ کو تلاش کر لینا مشکل نہ تھا۔

واصل پورہ اب نظر آنے لگا تھا۔ دوسرے گاؤں کی طرح اس گاؤں پر بھی خاموشی کی چادر تھی ہوئی تھی۔ خوف سے سبے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایک دو دکانیں کھلی ہوں گی تو وہ بھی پولیس جیپ کو دیکھ کر بند ہو گئی ہوں گی۔ خاموشی میں لپٹے اس گاؤں میں داخل ہوتے ہی ہمیں پولیس جیپ نظر آگئی۔ وہ ایک مکان کے باہر کھڑی تھی۔ شاید وہ مہناز کو کھینچ کر اندر لے جا چکے تھے۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہاں زور زبردستی ہوئی تھی۔ یوں بھی مہناز ایسی لڑکی نہ تھی کہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلی گئی ہو۔ اس نے شور مچایا ہوگا مزاحمت کی ہوگی۔

”بھائی میاں! میرے پاس ایمر جنسی پوشاک ہے ذرا اسے تو نکالیں اسی خفیہ خانے میں ہوگی۔“ آغا علی نے کہا۔

میں نے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا اور جب باہر نکالا تو حیرت سے گویا اچھل پڑا۔ وہ پولیس کی وردی تھی۔ اس پر دو پھول لگے ہوئے تھے۔ گویا اسے پہننے والا سب انسپکٹر نظر آتا تھا۔

”اسے آپ پہن لیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے اسے پہن کر بیک ویو مرر میں دیکھا۔ میں بھاری بدن کا تھا جبکہ وردی درمیانے بدن والے کی تھی۔ کچھ چھوٹی اور پھنسی پھنسی سی تھی مگر یہ میرے لئے اچھا ہی تھا۔ اس طرح استری نہ ہونے کی خامی چھپ گئی تھی۔

”بہت خوب اب آپ دستک دیں۔“ آغا نے تعریفی نظروں سے میرا جائزہ لے کر کہا۔

میں نے دروازے کی جھری سے اندر جھانکا اور مسکرا اٹھا۔ اندر تین پولیس والے تھے۔ مہناز اکیلی ان تینوں کو لات گھونسوں سے سنبھالے ہوئے تھی۔ بڑی بے جگری سے لڑ رہی تھی۔ اسے باقاعدہ لڑنا نہیں آتا تھا۔ وہ بے قاعدگی میں بھی ان کا خلیہ خراب کئے دے رہی تھی، ان تینوں کے بال بکھرے ہوئے تھے چہروں پر خراشیں اور ہاتھوں پہ دانتوں کے نشان تھے۔ وردی بھی جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ مہناز کا خلیہ بھی بگڑا ہوا تھا۔ دو پٹا لگ پھینکا جا چکا تھا۔ قمیض بھی کٹی جگہ سے پٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔ جو بھی اس کے قریب پہنچتا لات گھونسا کھا کر پیچھے الٹ جاتا۔

کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد میں نے دستک دی۔ دستک کی آواز کافی تیز تھی۔ اندر ایک لخت خاموشی چھا گئی۔ شاید انہیں دستک کی

توقع نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ میں نے دروازہ کھولنے والے کو پرے دھکیلا اور اندر داخل ہو کر سپاہیوں سے بولا۔
”یہ کیا ہو رہا تھا؟“

اپنے سامنے ایک سب انسپکٹر کو دیکھ کر وہ تینوں ڈر گئے تھے اور چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی۔ جب کہ مہناز کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ اس نے ہمیں پہچان لیا تھا۔
”تم نے کیا سمجھ رکھا تھا مجھے کا نام بدنام کر لو گے؟“ میں نے کہا۔
وہ دونوں خاموشی سے سر جھکائے کھڑے رہے۔

”یہ تو اچھا ہوا جو میری نظر پڑ گئی۔ تم نے جس طرح اس کے بھائی کو دھکا دیا تھا کسی اخبار نویس کی نظر پڑ جاتی تو؟“
”سر ہمیں معاف کر دیں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“ تینوں نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔
”غلطی کے بچے آئی جی کا حکم ہے کہ پولیس مین اخلاق کا نمونہ بن جائے تاکہ وہ پولیس کے ظلم کی داستان کو لوگ سازش سمجھیں۔ تم سے تو آئی جی صاحب خود غمیں گے۔“ کہہ کر میں نے سامنے والے کے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ گال سہلا رہا تھا کہ میں نے دوسرے کا گریبان پکڑ کر کھسینا اور آغا علی سے بولا۔ ”ڈرائیور! ان تینوں کو ہتھکڑی لگا دو۔“

ہتھکڑی کا نام سنتے ہی تینوں میرے چہروں پر گر گئے۔ میں نے آغا علی اور مہناز کو اشارہ کیا پھر پستول کے دستے کو سامنے والے کی گدی پر مارا۔ آغا علی اور مہناز نے بھی میری تقلید کی اور دو کے سر پر وہیں رکھا پتھر اور ڈنڈا مارا۔ تینوں لڑھک گئے۔
ان تینوں سے فارغ ہو کر ہم نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی جانب چل پڑے۔ اب اس گھر میں ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے یہ بات آغا علی کو بتائی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ ان مردودوں کو دو ڈھائی گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا پھر میں نے اندر جانے سے پہلے ان کی جیب ناکارہ بنادی تھی۔ پلگ کے تار توڑ کر ٹائروں کی ہوا بھی نکال دی تھی اور ٹنکی میں مٹی بھر بھری ڈال دی تھی۔ انشاء اللہ وہ لوگ شام سے پہلے اس گاؤں سے نکل نہیں سکتے۔ بغیر جیب کے وہ کس منہ سے تھانے لوٹیں گے؟ ان کے افسران کی جان کو نہیں آجائیں گے؟ اتنی دیر میں آپ یہاں سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔ میں نے صبح ہی ناصر بابا سے کہہ دیا تھا کہ وہ بارڈر تک لے جانے والی جیب بھیج دے۔ گھنٹے آدھے گھنٹے میں جیب پہنچ جائے گی۔ وہ سندرا جیب ہے ٹوٹے پھوٹے راستوں پر بھی بڑی آسانی سے چلتی ہے اسی لیے ہم اسے بارڈر تک لے جاتے ہیں۔“

آغا علی کی بات غلط نہ تھی۔ ہم ابھی پہنچے ہی تھے کہ جیب آ گئی۔ اس جیب کے ڈرائیور نے انتہائی غلیظ کپڑے پہن رکھے تھے۔ لگتا تھا کئی دن سے اس نے کنگھا بھی نہیں کیا ہے۔ سر پر جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بال اڑ رہے تھے۔ آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے سرخ آنکھوں سے ہمارا جائزہ لیا پھر کرخت لہجے میں بولا۔ ”جلدی دیر نہ کرو۔ ہماری اطلاع کے مطابق رات کے پہلے پہر میں بھارتی فوجی پھر فائرنگ کھولیں گے۔“
”بھئی جنگ ہو رہی ہے تو ایسا ہوتا ہی رہے گا۔“ آغا علی نے کہا۔

”جنگ یہاں سے منتقل ہو گئی ہے۔ اب پونچھ اور سری نگر میں محاذ کھل چکا ہے۔ یہاں تو صرف خون گرم کیا جاتا ہے۔“

میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ صفدر مہناز اور نور بیگم کچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔ جیپ نہایت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ اندھے موڑ، گہری کھائیاں، ایسے خطرناک راستے میں بھی وہ رفتار کم نہیں کر رہا تھا۔ ابتداء میں مجھے خوف محسوس ہوا تھا لیکن کچھ ہی دیر میں مجھے ڈرائیور کی چابکدستی کا احساس ہو گیا۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ صرف تین گھنٹے میں اس نے ہمیں بارڈر کے علاقے میں پہنچا دیا۔ بن گاؤں کا علاقہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اکادکا مکانون میں لوگ رہ رہے تھے۔ انہی میں سے ایک نے ہمیں اپنا مہمان ٹھہرا لیا۔ سرحد کے اتنے قریب رہنا جان کو ہتھیلی پر رکھنے کے مترادف تھا۔ اس گھر میں پہنچے کے بعد اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ ثناء اللہ نامی وہ بوڑھا بہت جی دار تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے علاوہ گھر کے تمام افراد کو جیسور منتقل کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بھی صرف سرحد پار کرانے کے لیے رہ رہا تھا۔ کسی سے ایک پیسا نہیں لیتا اور ہر ایک کی مدد کرتا۔ ہمیں بھی اسی نے بارڈر پار کرانا تھی۔ دن کے وقت یہ ناممکن تھا اسی لیے ہم رات کا انتظار کرنے لگے۔ ثناء اللہ کی بیوی نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ ہم سب ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ ابھی ہم نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم سب چونک گئے۔ مہناز کا رنگ فق پڑ گیا تھا۔ خود میرا دل بھی دھک سے رہ گیا تھا۔ شاید بھارتی درندے پہنچ گئے ہیں۔ یہی بات میرے دماغ میں گونجی تھی۔ جنگ کے دن تھے اور بھارتی فوجیوں کے کمپ زیادہ دور نہیں تھے۔ یقیناً کسی نے ہمیں یہاں آتے دیکھ لیا ہے۔ اگر اس وقت نہ بھی دیکھا ہوگا تو باہر کھڑی جیپ نے گزرنے والے فوجیوں کو بتا دیا ہوگا اور انہوں نے کمپ میں خبر کر دی ہوگی۔

میزبان نے ہاتھ روک کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں عنایت۔“ باہر سے آواز آئی۔

”آ جاؤ!“ کہہ کر میزبان نے پھر سے لقمہ اٹھا لیا۔ اس کے چہرے پر پھیلے اطمینان نے ہمیں مطمئن کر دیا ہم پھر سے کھانا کھانے لگے۔ دروازہ کھول کر ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ میزبان نے کھاتے ہوئے تعارف کرایا۔ ”انہیں انوار نے بھیجا ہے اور یہ عنایت ہیں۔ انہیں میں نے ہی بلوایا ہے۔ یہ اس علاقہ کی آن اور دشمنوں کو لئے قہر ہیں۔ سرحد کے چپے سے واقف۔ یہی آپ لوگوں کو بارڈر پار کرائیں گے۔“

”آپ نے انہیں خواہ مخواہ تکلیف دی۔ مجھے بھی جیسور تک کے راستے کا علم ہے۔“ صفدر نے کہا۔

”آپ شاید اگست کے بعد نہیں آئے ہیں۔ اس وقت سرحد کے ایک ایک انچ پر بھارتی فوجیں ہیں۔ ان کے درمیان سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔“ عنایت نے بتایا۔

”آپ تو ہمیں بہ حفاظت پہنچا دیں گے ناں؟“ مہناز نے پوچھا۔

”ہاں میں نے ایسے خفیہ راستے ڈھونڈ رکھے ہیں جہاں سے ہم سرحدی پٹی پار کر سکتے ہیں۔“

”ہم کب تک چلیں گے؟“

”رات کے وقت جانا مناسب نہیں ہے۔ جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی موت کا پیغام بن جائے گی۔“

”دن کی روشنی میں بھارتی ہمیں دیکھ نہیں لیں گے؟“

”نہیں میری بھولی بہن! دن میں لوگ عام طور پر مطمئن ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں صرف سرحد کے پار پاکستانی فوجیوں پر لگی رہتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں ادھر والے رات میں پار کریں گے۔ اسی نفسیاتی نکتے سے ہم فائدہ اٹھائیں گے۔ فی الحال آپ لوگ آرام کریں صبح ملاقات ہوگی۔“ کہہ کر عنایت کھڑا ہو گیا۔ ”میں جانے سے پہلے پھر مشورہ دے رہا ہوں کہ آپ ایسی غلطی نہیں کریں گے ورنہ زندگی بھر کارونا جان کو آجائے گا۔“

عنایت کے جاتے ہی میں نے پوچھا۔ ”آدمی بھروسے کا ہے نا؟“

”بھئی اپنا آدمی ہے۔ مسلم لیگ کا پر جوش کارکن ہے۔ بالکل ان کی طرح۔“ ثناء اللہ نے جیب ڈرائیور کی جانب اشارہ کیا۔ ”تحریک پاکستان کے لئے تن من دھن سے سرگرم ہے۔ کسی کی ستائشی نہیں ہے۔ ماں باپ نے لاکھ سمجھایا کہ شادی کر لو مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نے پاکستان کے قیام سے شادی کر لی ہے۔ جب تک اسے حاصل نہ کر لوں مجھے چین نہیں آئے گا۔ اب وہاں جا کر شاید شادی کر لے مگر ابھی تو مسلمانوں کی مدد کے لیے لگا ہوا ہے۔ حیرت ہے آپ نے اسے نہیں پہچانا جبکہ مسلم لیگ کا ہر فرد اسے پہچانتا ہے۔“

”میرا تعلق کلکتہ کی مسلم لیگ سے نہیں ہے نا۔“ میں نے بات بنائی۔ اور لیٹنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد نور بیگم اور مہناز بھی اسی کمرے میں آ گئیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ جیب واپس جا چکی ہے۔ وہ دونوں بھی دوسرے بستر پر لیٹ گئیں۔

دن کے دس بجے عنایت آیا۔ اس نے کندھے سے رائفل لٹکا رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور نو جوان بھی تھا۔ ہم بھی تیار بیٹھے تھے فوراً نکل پڑے۔

اب پیدل سفر کرنا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمیں احساس ہوا کہ وہ ہمیں سرحدی پٹی کی بجائے دوسری جانب لے جا رہا ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے وجہ پوچھ لی۔

”جناب! ہم اس تالاب پر سے گزریں گے۔ ادھر بارودی سرنگوں کا خطرہ نہیں ہے پھر وہاں ہمارے کچھ ساتھی بھی ہیں۔“ عنایت نے کہا۔

کچھ دور جانے کے بعد عنایت نے رک کر ایک جگہ سوکھی جھاڑیاں جمع کر کے روشن کی پھر ہم سب کو دوڑنے کا اشارہ کیا۔ ہم اب دوڑتے ہوئے اس جگہ سے دور ہو گئے۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں پہنچے تھے کہ یکایک پوری پہاڑی گولیوں کی ٹرٹراہٹ سے گونجنے لگی۔ آگ روشن کرنا ایک چال تھی۔ دھواں دیکھ کر نزدیک میں موجود بھارتی دستہ حملہ کرنے آگے بڑھا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ ہم میدان جنگ میں آ گئے ہیں کیونکہ ہر جانب سے رائفلیں چلنے لگی تھیں۔ بھارتی دستے جہاں جہاں پر تھے فائرنگ کرتے رہے۔ سرحد کی دوسری جانب سے پاکستانی فوجیوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ہم اس پہاڑ کو پار کرتے ہوئے ایک برساتی نالے تک پہنچے اور گٹھوں پانی کو پار کر کے دوسری جانب پہنچ گئے۔

”لیجئے! اب ہم آزاد علاقہ میں پہنچ چکے ہیں۔ نالے کے اس طرف محکوم علاقہ چھوٹ گیا۔“ عنایت نے بتایا۔

ہم سب اس پاک مٹی پر سجدہ ریز ہو گئے۔ جس سرزمین کی چاہت میں ہم اتنی مشقت جھیل رہے تھے بالآخر ہم اس پر پہنچ گئے۔

”اس جانب ایک گاؤں ہے وہاں تک پہنچا کر میں واپس چلا جاؤں گا۔“ کہہ کر وہ جیسے ہی مڑا اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ لڑکتا ہوا پہاڑی

سے نیچے جاگرا۔ اس کا گرنا تھا کہ دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ بے چارہ بارودی سرنگوں پر جا گرا تھا۔ اس کے ٹکڑے دور دور تک بکھر گئے تھے۔ ہم پر سکتہ ساطاری ہو گیا تھا۔ سبھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر دیکھ رہے تھے۔ تبھی نزدیک سے آواز اُبھری۔ ”ہالٹ!“

میں نے چونک کر دیکھا۔ آزاد فوجی کھڑے تھے۔ شاید انہیں دھماکوں نے متوجہ کر لیا تھا۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر کمپ تک آئے۔ اس کمپ میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ رہ رہے تھے۔ کمپ میں پہنچنے کے دوسرے دن میں نے صفر سے کہا ”یہاں رہنا فضول ہے چلو ڈھاکا چلتے ہیں۔ وہ بڑا شہر ہے وہاں نوکری بھی آرام سے مل جائے گی۔“

اگلے دن ہم نے کمپ کو خیر باد کہہ دیا اور ڈھاکا کے لیے چل پڑے۔ ڈھاکا پہنچ کر نور بیگم نے کہا ”میرے پاس گلے کا ایک ہار ہے۔ اسے فروخت کر کے ہم اتنے پیسے حاصل کر سکتے ہیں جن سے کرایہ کا گھر لیا جاسکتا ہے۔“

”مرا ہاتھی بھی سوالا کھ کا ہوتا ہے۔ میرے پاس ابھی بھی اتنے پیسے ہیں کہ ایک سال تک آرام سے کھا سکتے ہیں مگر میں نوکری پھر بھی تلاش کروں گا کیوں کہ وہ پیسے مہنازی کی شادی میں کام آئیں گے۔“

نواب گنج نامی محلے میں ایک گھر مل گیا اور اگلے ہی دن سے میں نے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ جلد ہی مجھے بنکشاں کی ایک دکان میں سیلز مین کی نوکری مل گئی۔ دکان کے مالک نے صفر کو بھی ایک فرم میں نوکری دلا دی۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی تعلیم یافتہ لڑکے کو تلاش کر کے جلد سے جلد مہناز کے ہاتھ پہلے کر دوں۔ اس کی شادی کسی اچھے لڑکے سے ہو جائے۔ اس فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نور بیگم کو لے کر الگ ہو جاؤں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھ ماہ گزر گئے۔ میری اور صفر کی تنخواہ سے اخراجات پورے ہو رہے تھے مگر ہنوز پرانا مسئلہ جوں کا توں کھڑا تھا۔ اچھا لڑکا مل کر نہیں دے رہا تھا۔

میں نے رشتے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی۔ ایک دن نور بیگم نے کہا کہ اب تم ایسے رشتے تلاش کرو جو نئے سٹے پر راضی ہوں بدلے میں صفر کی شادی کر دیتا۔ میں نے صفر سے ذکر کیا تو گویا وہ اسی انتظار میں تھا۔ فوراً ہی راضی ہو گیا۔ لیکن اس نے ایک شرط بھی رکھ دی کہ جب آپ کہتے ہیں کہ آپ پوری طرح زخمی نہیں ہیں تو آپ بھی شادی کر لیں۔ اپنی زندگی سنوارنا بھی فرض ہے نا۔“

میں نے ہنس کر بات نال دی کیونکہ جب بھی وہ مجھے میری پچھلی زندگی کا حوالہ دیتا میرے دل پر تیر سا لگتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ اسے بتا دوں کہ میں اس کا سگا بھائی ہوں مگر زبان ساتھ نہیں دیتی تھی۔

کافی تلاش کے بعد میں نے ایک لڑکا پسند کر ہی لیا۔ اسی کی بہن سے صفر کا بھی رشتہ طے کر دیا تھا۔

گھر میں شادی کی تیاری شروع ہو گئی۔ صفر نے اپنے لئے ایک مکان کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ جس دن نکاح ہونا تھا اسی روز وہ قیامت آن پڑی۔

انسان سوچتا بہت کچھ ہے مگر ان خوابوں کو تکمیل صرف قسمت دیتی ہے۔ رات کے وقت ہم کھانا کھا رہے تھے کہ کئی نقاب پوش اندر گھس آئے۔ کسی کے گھر میں ڈھانٹا باندھ کر اندر آنے والے کون ہوتے ہیں یہ ہم نے فوراً سمجھ لیا تھا۔ ہم کوئی سیٹھ سا ہو کا نہیں تھے پھر بھی ڈاکو آ گئے تھے۔

انہیں امید تھی کہ شادی کا گھر ہے اچھی خاصی رقم ہاتھ آ جائے گی۔ انہوں نے پستول کی زد پر لے کر ہمیں حکم دیا کہ جو کچھ ہے ان کے سامنے رکھ دیا جائے۔ زیور کے نام پر میں نے چار چوڑیاں بنوائی تھیں وہ لاکر ان کے سامنے رکھ دیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم سچ بول رہے ہیں۔ وہ بحث پر آمادہ تھے کہ صفدر کو موقع مل گیا اس نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندہ رہنے والے کی اس بے جگری پروہ گھبرا اٹھے اور انہوں نے گولی چلا دی۔ ایک دھماکہ ہوا اور صفدر گر کر تڑپنے لگا گولی اس کے سر میں لگی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتا انہوں نے مہناز کی کپٹی پر پستول رکھ دیا اور غرا کر بولے۔ ”ہم اپنی حفاظت کے لیے اسے لے جا رہے ہیں۔ سڑک پر پہنچ کر اسے چھوڑ دیں گے۔ تم میں سے اگر کسی نے شور مچایا ہمارے پیچھے آیا تو ہم لڑکی کو گولی مار دیں گے۔“ ان کے پاس طاقت تھی وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں خاموش کھڑا رہ گیا اور وہ اسے کھینچ کر باہر لے گئے۔

وقت کا کام ہے گزرنا، گزر جاتا ہے۔ زخم لگا کر نہیں دے کر بھی گزر جاتا ہے۔ اور بیس برسوں ستاتی ہے۔ مجھے بھی ستاتی ہے۔ رولاتی ہے۔ میں اوپر سے ہنستا اور اندر سے روتا ہوں۔ اس کمال ضبط سے کہ پاسنگ بھی نہ آئے۔ ایسی حالت میں روتا تھا کہ سسکی بھی نہ ابھرے۔ آنکھیں نوچہ کنناں تھیں۔ مگر اظہار سے گریزاں تھیں۔ دوسرے کتنا بھی ذلیل کر لیں سب سے بڑی ذلت تو آدمی کا اپنی نظروں میں گر جانا ہے۔ میں بھی اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔ بازو تھے بازوؤں میں قوت بھی تھی مگر اسے کام میں نہیں لا پا رہا تھا۔ ہر موئے تن پھٹک رہا تھا۔ پلٹیں سی اٹھ رہی تھیں۔ روم روم سے پکار اٹھ رہی تھی۔ ایک ہی پکار تھی۔ انتقام انتقام مہناز کا انتقام۔

اس دن سے میں اپنی مہناز کے انتظار میں ہوں۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اس کالی قسمت والی پر دشمنوں نے تو ستم توڑے تھے دوستوں نے بھی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ نور بیگم اب بھی میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں مل کر مہناز کا انتظار کر رہے ہیں۔ پتا نہیں انتظار کا سورج کب ڈھلے گا؟ کب مہناز اپنے گھر لوٹے گی۔ اتنے ڈھیر سارے دن گزر گئے مگر وہ اب تک نہیں آئی ہے۔ پتا نہیں زندگی کے کسی موڑ پر ملاقات ہوگی۔ ہوگی بھی یا نہیں؟

(ختم شد)